# قرآن اور عورت

ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

# انتساب

## ان کے نام جو ہدایتِ الٰہی کے جویا ہوں

میں اپنی اس کاوش کو اپنے پیارے دوست جناب محترم نواز احمد ملک صاحب (کراچی) کے نام معنون کرتا ہوں، جنھوں نے نہ صرف میرا پسندیدہ دینی ادب فراہم کیا بلکہ مجھے لکھنے کی بھی ترغیب دی۔ میری یہ ادنیٰ سی کوشش اسی ترغیب کا نتیجہ ہے

## نیز

''ادارہ طلوعِ اسلام'' اور ''ادارہ فکرِ اسلامی'' سے وابستہ و متاثرہ ان فریب خوردہ شاہینوں کے نام........................................................

........جنھیں قرآن کریم کا نام لے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مغرب کی لادین تہذیب اور مادہ پرست تمدن کے طور طریقے ہی اسلامی عادات واطوار ہیں۔

ڈاکٹر حافظ محمد دین قاسمی

مولانا عمر احمد عثمانی کی فقہ القرآن جلد سوم
کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

| | |
|---|---|
| نام کتاب | قرآن اور عورت |
| مصنف | ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی |
| باہتمام | ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور |
| مطبع | |
| اشاعت اول | نومبر ۱۹۷۹ (۱۱۰۰) |
| اشاعت دوم | جنوری ۲۰۰۷ء (۱۰۰۰) |
| قیمت | ۱۹۵ روپے |

تقسیم کنندہ:

**مکتبہ معارف اسلامی**

منصورہ ملتان روڈ لاہور پوسٹ کوڈ نمبر ۵۴۷۹۰

فون: ۲۴-۵۴۱۹۵۲۰، ۵۴۳۲۴۷۶، ۵۴۳۲۴۱۹

# فہرست مضامین

### دوسری فصل



### تیسری فصل



### چوتھی فصل



### پانچویں فصل



### چھٹی فصل



### باب ٦

### نویں فصل



### دسویں فصل



### گیارہویں فصل



### بارہویں فصل

......☆......☆......

# پیش لفظ

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔اس نظام نے فرد اور معاشرے کے تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے جو عملی نقشہ مرتب کیا ہے، اس نے خود اپنی قوت، جامعیت اور انسانیت کے لیے منفعت بخش ہونے کے ناطے اپنا لوہا منوایا اور مخالفین کو سرنگوں کر دیا۔ اسلام دشمن قوتیں بھی نت نئے حربے اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے بے شمار نئے میدان تلاش کرتی رہتی ہیں۔ باہر کا کھلا دشمن، اسلام کی حقانیت پر اپنے تمام حملوں کے باوجود کبھی کامیاب نہیں ہو پایا۔ وہ ہمیشہ اسلام کے اندر سے اپنے ایجنٹ تلاش کرتا ہے اور ان کے ذریعے اپنا دام تزویر بڑے شاطرانہ طریقے سے پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ یہ فتنے صدر اسلام میں حضرت عثمانؓ کی خلافت راشدہ کے دور سے شروع ہوئے اور آج تک جاری ہیں۔

برصغیر میں فتنۂ انکارِ حدیث کی ایک طویل تاریخ ہے۔ علمائے حق نے اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ غلام احمد پرویز ایک سرکاری ملازم تھے اور سرکاری سرپرستی میں انھوں نے فتنۂ انکارِ حدیث کا علم اٹھایا تھا۔ ان کے پیروکار اب بھی موجود ہیں لیکن ان کا محاکمہ کرنے والے علمائے حق بھی ناپید نہیں ہیں۔ زیرِ نظر کتاب پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب کی تحقیقی کاوش ہے جو انھوں نے پرویز صاحب کے شاگرد مولانا عمر احمد عثمانی کی کتاب فقہ القرآن کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مرتب کی ہے۔ ہم یہ کتاب ادارہ معارف اسلامی کی طرف سے افادۂ عام کے لیے مصنف محترم کی اجازت وفرمائش سے شائع کر رہے ہیں۔

مصنف نے اپنے مدِ مقابل محقق کے پورے خیالات بھی اپنی کتاب میں شائع کیے ہیں اور ان پر خالص علمی انداز میں تنقید کا حق بھی ادا کیا ہے۔ آج فتنۂ انکارِ حدیث اور اسلامی نظام سے انحراف پھر سرکاری سرپرستی میں منہ زور طوفان کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس وقت اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ ٹھنڈے دل اور استدلال کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں اور ذرائع ابلاغ میں جہاں تک بھی رسائی ہو سکے ان کو بھرپور انداز میں استعمال کریں۔

اس کتاب کے شائع کرنے میں ہمارے محترم مربی اور بزرگ ساتھی جناب ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب نے بھی خصوصی دل چسپی لی ہے، ہم ان کے بھی ممنون ہیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ یہ کتاب شائقین علم کے لیے کافی مفید معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ ہوگی۔

ہم اپنے کرم فرماؤں سے اس کتاب پر ان کی مفید آرا اور راہ نمائی کے منتظر ہیں۔

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی

۲۴ر ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ بمطابق ۱۶ر دسمبر ۲۰۰۶ء

# مقدمہ

بیماریوں میں خطرناک ترین بیماری وہ ہوتی ہے جس کی علامات عیاں نہ ہوں بلکہ وہ مریض کو صحتمندی کے دھوکے میں مبتلا رکھ کر اُسے آہستہ آہستہ سُوئے گور دھکیل رہی ہو۔ رہی وہ بیماری جس کی علامات واضح اور اجاگر ہوں تو وہ چنداں خطرناک نہیں ہوتی کیونکہ انسان اس کی علامات واضح ہوتے ہی اپنی مدافعانہ کاوشیں شروع کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایسا مرض جو اپنے آثار و علامات کو ظاہر ہی نہ ہونے دے اور اندر ہی اندر صحت کی جڑیں کاٹتا رہے۔ انسان ایسے پُراسرار مرض کے سامنے لاچار اور بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

عداوتوں میں بدترین عداوت وہ ہوتی ہے جو دوستی کے پیرائے میں اختیار کی جائے اور انسان کو پتہ ہی نہ چل پائے کہ اس لباسِ خُلّت میں ملبوس شخصیت، اس کی دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔ انسان اپنے کھلے دشمن سے نقصان اٹھا سکتا ہے مگر دھوکہ نہیں کھا سکتا، لیکن اس دشمن سے، جو عداوت کا لباس پہن کر نہیں، بلکہ دوستی کا لباس پہن کر آتا ہے اور بابِ عداوت سے نہیں بلکہ پُرخلوص دوستی کے دروازے سے وارد ہوتا ہے، انسان دھوکہ بھی کھاتا ہے اور نقصان بھی اٹھاتا ہے۔

اپنے آثار کو نمایاں کر دینے والی بیماری کی نسبت، اپنی علامات کو مخفی رکھنے والی بیماری ——— اور ——— کھلے دشمن کی بینہٖ دشمنی کی نسبت، دوستی کے بھیس میں چھپی ہوئی

عداوت بدرجہا زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

ہمارے دشمنوں کی ایک قسم وہ ہے، جس کے افراد کھلے بندوں ہمیں ہمارے دین سے برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ہماری تہذیب کے ان اعداء نے ہمارے دین کے مقابلے میں ایک خود ساختہ دین پیش کیا ہے جو خدا پرستی کی بجائے ہوا پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کا پورا نقشۂ حیات ہمارے اسلامی نقشۂ حیات کی ضد واقع ہوا ہے۔ جس میں خیر و شر کی بنیاد انبیائے معصومین کے مبنی بر وحی ٹھوس علم پر ہونے کی بجائے، آزاد فکر فلسفیوں کے ظنی قیاسات پر قائم ہے۔ بدقسمتی سے تقریباً سارا عالمِ اسلام، ہمارے دین و تہذیب کے ان کھلے دشمنوں کی سیاسی غلامی میں صدیوں مبتلا رہا ہے۔ عالمِ اسلام کا بیشتر حصہ اگرچہ اب سیاسی آزادی سے ہمکنار ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی تک وہ ذہنی غلامی سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔

جن دنوں ہم سیاسی طور پر اسلام دشمن قوتوں کے غلام تھے، ان دنوں سامراج نے ہماری دینی روایات اور تہذیبی نشانات کو بڑے منظم اور غیر محسوس طور پر مٹانے کی کوششیں کیں، خدا اور رسول کی تعلیمات کی بجائے دہریت کی آغوش میں پلے ہوئے فلاسفہ کے نظریات کو پھیلایا گیا۔ ردّ و قبول اور اخذ و ترک کے اسلامی پیمانوں کی جگہ، جدید تہذیب کی اقدار کو معیار گردانا گیا۔ ملکی قانون کو (جو جس حد تک بھی اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ رہ گیا تھا) بدل کر استعماری قانون نافذ کر دیا گیا۔ درس گاہوں میں ہمارے تہذیبی فکر اور تمدنی آثار کی بجائے استعماری فکر اور مغربی آثارِ مدنیت کو فروغ دیا گیا تاکہ امت مسلمہ کا قرآن اور نبیؐ قرآن سے تعلق ٹھوس علمی، عقلی اور ایمانی اساس پر قائم رہنے کی بجائے (بشرطیکہ وہ رہ بھی جائے تو) جذباتی، تقلیدی اور موروثی بنیاد پر قائم ہو جائے۔

یہ سب کچھ ہماری تہذیب اور ہمارے دین کے ان کھلے دشمنوں نے برسرِعام کیا، اُمتِ مسلمہ چونکہ اپنے ان اعداء اور ان کی اِن حیلہ جوئیوں سے واقف تھی اس لئے ان سے فریب خوردہ

ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے مخلوط سوسائٹی کی ترویج کی، مگر ملتِ اسلامیہ کی غالب اور عظیم اکثریت نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ انہوں نے بہتیرا شور مچایا کہ قربانی ایک "وحشی" رسم ہے مگر امت نے اس منسک کو برقرار رکھا۔ انہوں نے تعلیم کے ذریعے اپنی فکر کو مسلط کرنے کی کوشش کی مگر ملتِ اسلامیہ کے اکابر نے اس مسموم تعلیم کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے، اپنے جداگانہ تعلیمی اداروں کا بندوبست کر لیا۔ انہوں نے دفتری نظام الاوقات میں نماز کی ادائیگی کے لئے کوئی وقت نہ رکھا مگر مسلمانوں نے نماز کو ترک نہ کیا، الغرض مسلمانانِ ملت نے اپنے ان کھلے دشمنوں کی ان گمراہ کن چالوں سے اپنے آپ کو محفوظ و مصئون رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی اگر ایک مختصر اور حقیر سی اقلیت نے تہذیبِ غالب کا رنگ اختیار کیا بھی تو اس کے اکثر افراد اپنے دل میں ندامت و شرمساری محسوس کرتے رہے۔

یہ تھے ہمارے دین کے کھلے دشمن، اور یہ تھیں ان کی چالیں، اور یہ تھیں وہ تدابیر جو مسلمانوں نے ان اعدائے دین کے خلاف چوکنے ہو کر اختیار کیں!

ان کھلے دشمنانِ دین کے بعد اب ذرا ان نقاب پوش اعدائے اسلام کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مصلحین کے روپ میں مسلم معاشرے میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان کی فکر اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جو ہمارے کھلے اعدائے دین نے پیش کیا ہے ان کے ردّ و قبول اور اخذ و ترک کے بنیادی معیار وہی ہیں جو ہمارے کھلے دشمنوں نے ایجاد کیئے ہیں، اگر وہ لوگ اپنی لذت پرستانہ مدنیتِ فاسدہ کی بدولت حجابِ نسواں کو جاہلانہ رسم قرار دیتے ہیں تو یہ لوگ قرآن ہاتھ میں لے کر امتِ مسلمہ کو یہ باور کرانے میں کوشاں ہیں کہ پردہ ملاؤں کی ایجاد کردہ رسم ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ لوگ اگر قربانی کو "وحشی رسم" قرار دیتے ہیں تو یہ لوگ بھی، اس میں کوئی "تجربی فائدہ" اور "حسی منفعت" نہیں پاتے۔ وہ لوگ اگر اپنی شہوت پرستانہ تہذیب کی بدولت مرد و زن کی مخلوط سوسائٹی کے قائل ہیں تو یہ "فکرِ اسلامی" کے علمبردار، مخلوط سوسائٹی کو قرآن سے کشید کر ڈالتے ہیں۔ وہ لوگ اگر اپنے دفتری اوقات میں نماز کا وقفہ دینے

کے لیے تیار نہیں ہیں تو یہ لوگ "معارف القرآن" بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد سرے سے یہ نماز ہے ہی نہیں جو مساجد میں پڑھی جاتی ہے بلکہ اس سے مراد ایک خاص قسم کا نظام قائم کرنا ہے۔

الغرض ہمارے کھلے مگر "دانا دشمن" ہمیں اسلام سے منقطع کر کے اپنی جاہلانہ تہذیب کی طرف کھلے عام دعوت دیتے ہیں مگر اسلام کے یہ "نادان دوست" بھی، اگرچہ ہمیں اسی جاہلیت کی طرف بلاتے ہیں مگر اس فریبِ یقین کے ساتھ، کہ یہی جاہلیت دراصل عینِ اسلام ہے۔ ہمارے کھلے دشمن جب ہم سے اسلام کو ترک کروا کر ہمیں اپنی گمراہ کن معاشرت کی طرف بلاتے ہیں تو وہ ہمیں یہ دھوکہ نہیں دیتے کہ اب تم جس معاشرت کی طرف آ رہے ہو یہی اسلام کی مطلوبہ معاشرت ہے، مگر یہ لوگ جب قرآن کے نام پر ہمیں مغربی معاشرت کی طرف دعوت دیتے ہیں تو اس فریب کے ساتھ کہ اصل اسلامی معاشرت یہی ہے جس کی طرف ہم تمہیں بلا رہے ہیں۔ وہ لوگ اپنے فکر کو اپنے فلسفیوں اور سماجی مصلحین کی طرف منسوب کرتے ہوئے اسے قبول کرنے کی ہمیں ترغیب دیتے ہیں مگر یہ لوگ، اسی فکر کو مغربی مفکرین کے نام سے نہیں بلکہ اسلام اور قرآن کے حوالے سے اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ نتیجتاً اگر ایک مسلمان کھلے اعدائِ دین سے متأثر ہو کر ان کی فکر و نظر کو قبول کر لیتا ہے تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہتا کہ وہ اب بھی مسلمان ہے مگر ان حضرات کی تبلیغ کے نتیجے میں اگر ایک شخص اسلامی فکر کو ترک کر کے فرنگی فکر کو اپناتا ہے تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ بدستور اور حسبِ معمول مسلمان ہے کیونکہ "فکرِ اسلامی" کے علمبرداروں نے "فقہ القرآن" بیان کرتے ہوئے یہی یقین دلایا ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ مگر سادہ لوح مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اگر کارل مارکس اور اینجلز کے نام سے انہیں کمیونزم کی طرف دعوت دی جائے تو وہ اس دعوت پر کان بھی نہیں دھرتے اور اسے خلافِ اسلام نظام قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ لیکن جب وطن عزیز کے افق پر "طلوعِ اسلام" ہوتا ہے اور اسی یہودی فکر کو "اسلامی نظامِ ربوبیت" کے نام سے اسلام ہی کا جدید اڈیشن قرار دیا جاتا ہے تو وہ 'سادہ لوح مسلمان' جو اس نظام کو کارل مارکس کے نام پر لینے سے گریزاں تھے، اب

آمادۂ قبول نظر آتے ہیں۔ مغربی مفکرین جن خلافِ اسلام افکار و نظریات کو ہمارے قلوب و اذہان پر مستولی نہ کر پائے، ہمارے غلام فطرت مستغربین، انہی افکار و نظریات کو اُمّتِ مُسلمہ میں رواج دینے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں صرف فکر اور نظریہ ہی کی حد تک نہیں بلکہ عملاً مدنیت و معاشرت کا وہ پورا نقشہ، قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا جا رہا ہے جو تہذیبِ مغرب کا تشکیل کردہ ہے۔ مثلاً مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجاب، مرد و زن کی مطلق اور کامل مساوات، درونِ خانہ فرائضِ نسواں کی بجائے، اسے بیرونِ خانہ مردانہ مشاغل میں منہمک کرنا، تعدد ازدواج کو معیوب قرار دینا عورت کو خانگی مستقر سے اکھاڑ کر، اسے مردانہ کارگاہوں میں لا کھڑا کرنا، خانگی زندگی میں اس کے فطری وظائف سے اُسے منحرف کر کے قاضی و جج بلکہ سربراہِ مملکت تک کے مناصب پر براجمان کرنا وغیرہ، وغیرہ۔

چونکہ تمدنِ جدید کی یہ پوری عمارت قرآن کا نام لے کر اپنائی جا رہی ہے، اس لئے اس کتاب میں صرف اور صرف قرآن ہی کی بنیاد پر مستغربین کے دلائل کا جائزہ لیا گیا ہے، سُنّتِ نبویؐ کے دلائل سے مصلحتاً صرف اس لئے تعرض نہیں کیا گیا کہ ہمارا مخاطب طبقہ "قرآن" سے "کم تر" برعمِ خویش کسی چیز کو ماخذ دلیل و حجت قرار دینے کا روادار نہیں ہے۔

ہمارے علماءِ کرام مستغربین کے دلائل کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہے ہیں مگر ان کے جائزے اور دلائل میں قرآن مجید کے علاوہ سُنّتِ نبویؐ، فقہاءِ ملّت، علماءِ امت اور محدثین عظام کے فتاویٰ و اقوال بھی شامل رہے ہیں جسے یہ متجددین درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے میرے علم کی حد تک ان دلائل کا جائزہ کسی عالمِ دین نے، تنہا قرآن کریم کی بنیاد پر نہیں لیا ہے۔ اس کام کے لئے قرآن کے جس تحقیقی اور گہرے مطالعے کی ضرورت ہے وہ ایک محقق عالم ہی کے شایانِ شان ہے جبکہ میری حیثیت تو قرآن کریم کے ایک ادنیٰ طالب علم کی سی ہے۔ مجھے اس گرانبار بوجھ کو اٹھانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی بالخصوص جب جب اپنی علمی تہی دامنی و بے مائیگی کو دیکھتا تھا تو میرا دل بیٹھ بیٹھ جاتا ـــــــ چار سال، جب عورتوں کی عدالتی شہادت کے موضوع پر اخبارات و رسائل اور جرائد میں بحث چھیڑی گئی تو کراچی کے "روزنامہ جسارت" میں، میرا ایک مبسوط مقالہ بعنوان "شہادتِ نسواں قرآن کریم کی روشنی میں"

شائع ہوا ہے جسے ملک کے طول وعرض میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور سراہا گیا ملک بھر سے مجھے تحسین وتبریک کے خطوط وصول ہوئے۔ کراچی کے علماء نے میرے دلائل، اسلوبِ نگارش اور سنجیدہ اندازِ تحریر کی دل کھول کر توصیف وتعریف فرمائی، حتیٰ کہ جناب عامر احمد عثمانی صاحب تک کو بھی جو اکثر وبیشتر علماء کرام کے "وقار ومتانت سے فروتر" اندازِ نگارش کے شاکی رہتے ہیں اس مقالے کو "کسی حد تک" سنجیدہ کاوش قرار دینا پڑا، عثمانی صاحب کے موقف کی تردید میں اگرچہ کچھ اور لوگوں نے بھی لکھا تھا مگر انہوں نے سب سے صرفِ نظر کر کے مجھے ہی لائقِ تردید اور جواب[1] کے قابل گردانا۔

قارئین کے خطوط سے میرا حوصلہ بڑھا تو میں نے ان تمام مسائل پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا جو اسلامیت اور مغربیت کی آویزش کے نتیجے میں، آج عالمِ اسلام میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص موضوعِ بحث بنے ہوئے ہیں میری زیرِ نظر تصنیف اس سلسلے کی اولین کڑی ہے۔

کتاب کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے متجددین کے دلائل کو صرف اور صرف قرآن کی روشنی میں پرکھا ہے اور اپنی سعی وکاوش کو نذرِ قارئین کر دیا ہے میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں؟ یہ فیصلہ قارئین کرام ہی کریں گے۔

مجھے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا اچھی طرح علم واحساس ہے۔ اپنی علمی بے بضاعتی وبے مائیگی کو خوب جانتا ہوں۔

نہ گلم، نہ برگِ سبزم، نہ درخت سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

---

[1] دلیل کے اعتبار سے اگرچہ محترم عثمانی صاحب کا یہ جواب اس قابل نہ تھا کہ میں اس کا جواب الجواب لکھتا کیونکہ میرے مدلل مضمون کے بعد لیہ میں ادارہ "طلوعِ اسلام" کے حلقہ متاثرین میں سے ایک صاحب کو جب میں نے محترم عثمانی صاحب کا جواب پڑھنے کو دیا تو انہوں نے اسے پڑھنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ـــــ "آپ کا مدلل مضمون پڑھ لینے کے بعد، اب عثمانی صاحب کے تردیدی مضمون کو دیکھنا تضیعِ اوقات ہے۔ آپ کے ٹھوس دلائل کی تردید میں اب اگر پرویز صاحب بھی لکھیں گے تو وہ بھی لغو اور بیکار ہی ہوگا"، لیکن میں نے اس کے باوجود، مصلحتاً عثمانی صاحب کے رد میں جواب الجواب لکھا جو روزنامہ جسارت میں اپنے وعدے کے باوجود بوجوہ شائع نہ ہوسکا جس پر ہم اُن سے برادرانہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ بہرحال زیرِ نظر کتاب میں میرا یہ جواب الجواب بھی شامل ہے۔

ہو سراسر فضل ایزدی ہے کہ اس نے مجھ جیسے عاجز کو اپنے دین کی خدمت کی توفیق مرحمت فرمائی ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمے کنی
منت ازو شناس کہ خدمت بداشتت

میری یہ حقیر سی خدمتِ دین اور آئندہ بھی جو کچھ کر گزرنے کی آرزوں سے ویرانۂ دل آباد ہے، صرف اور صرف اسی کے فضل و کرم کا رہون منت ہو گا ؎

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہو گا تیرے کرم سے ہو گا

ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر میرے سمندِ شوق نے کہیں ٹھوکر کھائی ہو اور میرا قلم و قدم جادۂ حق اور طریقِ اعتدال سے منحرف ہو گیا ہو، اہلِ علم و فہم اور اربابِ فکر و نظر سے میری گزارش ہے کہ میری خطاؤں اور لغزشوں سے مجھے آگاہ فرمائیں تاکہ اپنی اصلاح کر سکوں۔ اس مقام پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد گرامی میرے لیئے انتہائی مسرور کن ہے کہ رحم اللہ رجلا اھدی الیّ عیوب نفسی (خدا اس مردِ مومن کو اپنی رحمت سے نوازے، جو میرے عیوب و نقائص کا ہدیہ مجھے بھیجتا ہے)۔

اس کتاب کے جملہ عیوب و نقائص اور اسقام و علل، میری کوتاہیِ فہم کا نتیجہ ہیں خدا کی وہ کتاب جس کی روشنی میں میں نے یہ مواد مرتب کیا ہے، ہر عیب و سقم سے پاک ہے۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے میں ہے

محمد دین قاسمی

TRUEMASLAK@INBOX.COM

# باب ۱

# عائلی زندگی اور منصبِ قوّامیت

گھر کیا ہے؟ شب بسری کے لئے ایک ہوٹل اور سرائے؟ یا نژادِ نو کے لئے مدرسہ اور تربیت گاہ؟

تہذیبِ مغرب کا یہ المیہ ہے کہ وہاں گھروں کی حیثیت، اب ان ریستورانوں اور سراؤں کی ہو چکی ہے جو میاں بیوی اور افرادِ کنبہ کے لئے محض شب بسری کا ذریعہ ہیں، تربیتِ اطفال اور پرورشِ اولاد کا کام، اب اُن بیوت الاطفال (NURSERY HOMES) میں ہوتا ہے جہاں بچوں کو پیدا ہوتے ہی ان کے ماں باپ سے جدا کر کے، کرائے کی مصنوعی ماؤں کے سپرد کر دیا جاتا ہے، تاکہ جنسی آزادی کے شہوانی ماحول میں، والدین کے لطف و لذت سیر و تفریح اور عیش و عشرت میں یہ بچے مانع و مزاحم نہ ہوں۔

لیکن اسلام کے نزدیک گھر محض اقامت گاہ اور مسکن ہی نہیں ہیں بلکہ بچوں کے لئے ابتدائی مدرسہ اور اولین تربیت گاہ ہیں۔ جہاں تربیتِ اطفال کا کام اسلامی خطوط پر کیا جاتا ہے اور ان ہاتھوں سے یہ کام انجام پاتا ہے جو بچے کے والدین ہونے کی حیثیت سے فطرتاً اس کے سب سے بڑے خیر خواہ اور محسن ہوتے ہیں۔

### سربراہِ خانہ

کوئی تربیت گاہ، یا درسگاہ، کسی ناظم یا سربراہ کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی لامحالہ گھر کے اندر واقع ہونے والے عائلی زندگی کے اس ادارے کا بھی کوئی سربراہ ہونا لازمی ہے جو اوّلین تربیت گاہِ اطفال ہے، اِس ادارے کو بغیر کسی ناظم یا سربراہ کے چھوڑ دینا اسے ضائع کر دینا

ہے، میاں بیوی میں سے ہر ایک کو مساوی حیثیت دے کر دونوں ہی کو اس کا بیک وقت سربراہ قرار دینا بھی اسی طرح قرینِ مصلحت نہیں ہے جس طرح کسی تعلیمی ادارے کو دو پرنسپلوں کے حوالے کر دینا خلافِ مصلحت ہے۔ لا محالہ اس کے لئے میاں بیوی میں سے کسی ایک ہی کو سربراہ مقرر کرنا انتظامی لحاظ سے انسب، عقلی اعتبار سے اولیٰ اور اسلامی تعلیمات کی رُو سے ضروری ہے۔ قرآن نے اس ادارے کی سربراہی کے لئے بیوی کی بجائے شوہر کو ذمے دار قرار دیا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ (النساء ۳۴)

مرد عورتوں پر قوّام ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے نیز اس بنا پر بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کی عدم موجودگی میں، اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔

## "قوّام" کا ترجمہ

یہاں قرآن کریم نے واضح طور پر مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو "قنوت" کے مقام پر اور عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو "قوامیت" کے مقام پر فائز کیا ہے۔ مردوں کی یہ "قوامیت" دو بنیادوں پر قائم ہے ——— اولاً یہ کہ خدا نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے اس لحاظ سے مردوں کو خواتین پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے ——— ثانیاً یہ کہ مرد، خواتین پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں یعنی ان کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کا بار وہ اٹھاتے ہیں ——— ان دو بنیادوں پر مردوں کو خواتین پر "قوام" بنایا گیا ہے سوال یہ ہے کہ "قوّام" کا مفہوم کیا ہے؟ بیچ ... نے (بقول محترم مولانا عمر احمد عثمانی صاحب) "قوامون" کا ترجمہ ... ہے۔ مگر ... ترجمہ سے اختلاف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

> اس آیت میں بنیادی لفظ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ہے جس کے معنی ہمارے ... مترجمین نے حاکم اور داروغہ کے کر دیے ہیں حالانکہ لغت کے اعتبار سے

قوام کے معنی حاکم اور داروغہ کے نہیں بلکہ معاشی کفیل کے ہیں۔۔۔۔ لہٰذا اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ کے معنی ہیں مرد عورتوں کے اخراجات پورے کرنے والے ہیں۔۔۔۔ اسی لئے مولانا آزاد نے قَوَّامُوْنَ کا ترجمہ "سربراہ" اور "کارفرما" کے الفاظ سے کیا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۸)

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"سربراہ" اور "کارفرما" کا ترجمہ ایک حد تک قابلِ قبول ہو سکتا ہے مگر حاکم اور داروغہ کا ترجمہ تو قَوَّامُوْنَ کے مفہوم کو ادا ہی نہیں کرتا۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۷۶)

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اس ترجمہ پر صاد کرتے ہوئے خود محترم عثمانی صاحب نے "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ" کا ترجمہ فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۵ پر ان الفاظ میں کیا ہے:

"مرد، عورتوں کے سربراہ اور کارفرما ہیں۔۔۔"

مرد کی افضلیت کی بحث

اب اگر محترم عثمانی صاحب کا یہ ترجمہ درست ہے تو پھر عورتوں پر مردوں کی افضلیت ایک طے شدہ امر ہے مردوں کو عورتوں پر "سربراہ" تسلیم کر کے ان کی حاکمانہ برتری کا انکار کرنا ایک عجیب سی بات ہے۔ آخر "سربراہ" اور "حاکم" کے مفہوم میں کیا فرق ہے کہ "قَوَّامُوْنَ" کا ترجمہ اگر "حاکم" کیا جائے تو غلط قرار پائے لیکن اگر "سربراہ" کے لفظ سے کیا جائے تو درست قرار پائے؟ "قَوَّامُوْنَ" کا ترجمہ اگر "داروغہ" کے لفظ سے ادا نہیں ہوتا تو نہ سہی مگر "سربراہ" اور "کارفرما" کو صحیح ترجمہ قرار دینے کے بعد عورت پر مرد کے حاکم ہونے کی صورت میں افضلیت کا جو پہلو اجاگر ہوتا ہے اسے تسلیم نہ کرنا قرآنی حقائق سے آنکھیں چرانے کے مترادف ہے لیکن محترم عثمانی صاحب ہیں کہ تہذیبِ مغرب کے افسوں کا بری طرح شکار ہیں وہ فرنگی تہذیب کی تقلید میں مرد و زن کی مطلق مساوات کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان آیاتِ قرآنیہ کی تاویل بلکہ تحریف کے درپے ہیں جن سے مردوں کی سربراہی اور کارفرمائی کی حیثیت سے عورتوں پر ان کی فوقیت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ ایک

مقام پر وہ ان علما کرام پر طنز کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں جو خواتین پر مردوں کی کارفرمائی کے قائل ہیں۔

"قرآن کریم سے مردوں کی افضلیت و حاکمیت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں"۔

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۴)

ایک اور مقام پر صنفِ نازک کو مردوں کے خلاف اشتعال دلاتے ہوئے، قرآنی الفاظ ـــــ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ـــــ کے تحت رقمطراز ہیں کہ

"یہ فقرہ، ہمارے علما کے ہاتھ میں عورتوں کی منقصت ثابت کرنے کے لئے دوسرا بڑا ہتھیار ہے"۔ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۷۲)

قارئین کے لئے یہ بات دلچسپی و تعجب کا باعث ہوگی کہ عثمانی صاحب خود بھی، مردوں کی خواتین پر فضیلت کا انکار نہ کر پائے، لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کی لمبی چوڑی تشریح کے بعد انہیں بالآخر یہ کہنا پڑا کہ

"قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ برتری وہی ہے جو اوپر بیان کر دی گئی ہے کہ عورتیں طلاق کی صورت میں تین ماہواری ایام تک انتظار کرتی ہیں اور مرد انتظار نہیں کرتے"۔ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۷۵)

ایک اور مقام پر مرد کی ایک گونہ افضلیت کا ایک دوسرا پہلو پیش فرماتے ہیں جسے آیت ۱۲۸ کے تحت زیر بحث لائے ہیں۔

"اکتسابِ رزق کی طاقت عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو زیادہ بخشی گئی ہے، مرد ہی عورت کا محافظ اور کفیل ہوتا ہے وہ دن بھر محنت مشقت کرکے کماتا ہے اور بیوی بچوں کی کفالت کا بار اٹھاتا ہے اس لئے اسے عورتوں پر ایک گونہ برتری بیشک حاصل ہے"۔ (فقہ القرآن ج ۱ ص ۵۲)

اب اگر یہ بات صحیح ہے کہ عورتوں کے بالمقابل مردوں میں اکتسابِ رزق کی اضافی اور وافر صلاحیت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر انہیں خواتین پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور عورتوں میں بہر حال مردوں کے مقابلے میں منقصت (کمی) پائی ہی جاتی

ہے تو محترم عثمانی صاحب کا یہ دوغلاپن ہمارے فہم سے بالاتر ہے کہ وہ خود ایک طرف عورت پر مرد کی اس فضیلت کے قائل بھی ہیں مگر دوسری طرف ان علما پر برہم بھی ہیں جو مرد کی اس برتری اور اس کے مقابلے میں عورت کی منقصت کا ذکر کرتے ہیں۔

بہرحال قرآن کے نزدیک عائلی زندگی میں مرد کو قوامیت یعنی سربراہی و کارفرمائی کا منصب حاصل ہے اور عورت کو قنوت یعنی اطاعت شعاری و فرمانبرداری کی پوزیشن!

### کفر و ایمان کی کشمکش

جب کوئی شخص کسی ایسی کتاب پر ایمان لاچکا ہو جس کی تعلیمات پر اس کا قلب مطمئن نہ رہا ہو اور وہ خارج از کتاب کچھ نظریات کو راسخ العقیدگی کے ساتھ قبول کر چکا ہو پھر وہ اس کتاب کو موروثی طور پر مانتے ہوئے اس کی تعلیمات کو برملا چھوڑ دینے کی اخلاقی جرأت سے بھی بے بہرہ ہو تو ایسے شخص کا دل اور دماغ ایک کشمکش کی آماجگاہ بن جاتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے دماغ میں رچے بسے نظریات ہی کتاب کے نظریات بن جائیں مگر الفاظِ کتاب قدم قدم پر مزاحمت کرتے ہیں، اُسے الفاظِ کتاب میں اپنی مطلوبہ تبدیلی واقع کرنے کے لئے بڑی کتر بیونت سے کام لینا پڑتا ہے۔ محترم عثمانی صاحب اگر مجھے معاف فرمائیں تو عرض کروں گا کہ وہ اس وقت ایسی ہی الجھن اور کشمکش کا شکار ہیں جس کتاب پر ان کا موروثی اعتقاد ہے وہ صراحت کے ساتھ عورت پر مرد کے سربراہ اور کارفرما ہونے کی حیثیت سے افضلیتِ ذکور کا نظریہ پیش کرتی ہے مگر محترم عثمانی صاحب تقلیدِ مغرب میں مرد کی عورت پر مطلق اور مجموعی افضلیت کے قائل نہیں ہیں وہ صرف جزئی فضیلت کے قائل ہیں جس کے باعث ہر صنف بشر کو دوسری صنف پر جزئی امور میں فوقیت و برتری حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے انہیں بڑی جانکاہی اور کوہ کنی کے ساتھ قرآن سے یہ تصور اخذ کرنا پڑ رہا ہے کہ (اگر قرآن نے مردوں کو سربراہ اور کارفرما ہونے کی حیثیت عطا کی ہے تو) عورتوں کو بھی "سربراہی" کا ایک منصب عطا کیا ہے۔ پھر وہ سربراہئ نسواں کے اس خود ساختہ منصب کے جواز کے لئے دو اصطلاحات وضع فرماتے ہیں۔ سربراہ خاندان (HEAD OF THE FAMILY) کی اصطلاح اور سربراہ خانہ کی اصطلاح پھر ان

دونوں اصطلاحات کی بیساکھیوں پر وہ استدلال کا لاشہ یوں کھڑا کرتے ہیں کہ "معاشی ذمہ داری چونکہ مرد (یعنی شوہر) کی ذمہ داری ہے اسی طرح بیرونی معاملات کا سلجھانا بھی اسی کا فریضہ ہوگا اسے خاندان کا سرپرست (HEAD OF THE FAMILY) ہونا چاہیئے اور عورت گھر کے اندرونی معاملات کی ذمہ دار ہے لہٰذا اس کو سربراہِ خانہ ہونا چاہیئے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۷۷)

مرد کی "سربراہیٔ خاندان" کے مقابلے میں عورت کے لئے بھی "سربراہیٔ خانہ" کی ایک آسامی (POST) پیدا کرتے ہوئے محترم عثمانی صاحب پر جو دُھن سوار تھی اس نے انہیں یہ بھی سوچنے کا موقع نہ دیا کہ "سربراہِ خاندان" اور "سربراہ خانہ" کی اصطلاحات پر ہی غور کر لیتے کہ آخر ان دونوں کے مفہوم میں کیا تباین و مغائرت پائی جاتی ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ "سربراہ خاندان" ہونا یا "سربراہ خانہ" ہونا ایک ہی معنیٰ و مفہوم رکھتا ہے؟ یہ دونوں اصطلاحات ایک ہی منصب کو ظاہر کرتی ہیں نہ کہ دو الگ الگ مناصب کو ظاہر ہے کہ ایک خاندان، ایک گھر ہی میں رہائش پذیر ہوتا ہے۔ جو سربراہِ خاندان ہوگا وہی سربراہ خانہ بھی ہوگا اور جو سربراہِ خانہ ہوگا وہی سربراہِ خاندان بھی ہوگا یہی وجہ ہے کہ محترم عثمانی صاحب ان دونوں اصطلاحات کے وجود کے تکلفِ بے جا کو نبھا نہیں سکے چنانچہ ایک مقام پر اگر وہ مرد کو "خاندان کا سرپرست" کہہ کر عورت کو "سربراہِ خانہ" قرار دیتے ہیں تو دوسرے مقام پر مرد کے لئے "سربراہِ خانہ" کے الفاظ استعمال کر کے اس حقیقتِ واقعی کو مبرہن کر ڈالتے ہیں کہ دونوں اصطلاحات لفظی مغائرت کے باوجود ایک ہی حقیقت کی ترجمان ہیں، ملاحظہ فرمائیے درج ذیل اقتباسات!

"قرآن نے گھریلو نظم و نسق قائم رکھنے کے لئے شوہر کو قوام یعنی معاشی ذمہ دار اور گھر کا سربراہ (صدر) بنایا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۳۸۹)

"خانگی زندگی کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لئے بہرحال زوجین میں سے ایک کا صاحبِ امر اور سربراہ خانہ ہونا ضروری ہے اگر دونوں مختار مطلق اور مساویانہ اختیارات کے حامل ہوں تو گھر میں بدنظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے"

مرد ہی چونکہ بیوی بچوں کے اخراجات کا ذمہ دار اور کفیل ہوتا ہے اس لئے اسلام نے جو ایک فطری مذہب ہے مرد ہی کو گھر کا سربراہ مقرر کیا ہے ۔"
(فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۸۲)

## قوّامیت و قنوت کے عملی لوازمات

مرد کے اختیارات بحیثیت "قوّام" اور عورت کے فرائض بحیثیت "قانتہ" کیا ہیں؟ ان کی وضاحت یہی آیت کر دیتی ہے ۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاهْجُرُوْھُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ○

(النساء ۳۴)

مرد عورتوں پر سربراہ اور کارفرما ہیں اس لئے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے نیز اس لئے بھی کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں ۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو پھر اگر وہ تمہاری مطیع فرماں ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لئے بہانے نہ تلاش کرو یقین رکھو کہ اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے ۔

## مفہوم قنوت

اس آیت میں صالح بیویوں کے جو فرائض بیان کئے گئے ہیں ان میں سے پہلا فرض، مقام قنوت پر فائز ہونے کی بنا پر اپنے شوہروں کی اطاعت شعاری ہے کیونکہ قنوت کا لغوی مفہوم ہی اطاعت و فرمانبرداری ہے ، محترم عثمانی صاحب اس لفظ کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ۔

"رہ گیا قَانِتَاتٌ کا لفظ تو اس کے معنی مطیع و فرمانبردار کے ضرور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کس کے مطیع و فرمانبردار؟ سورہ احزاب میں ہے کہ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ ---- اگر اس آیت میں قنوت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے تو سورۃ نساء کی آیت کریمہ میں اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کیوں مراد نہیں ہے؟"

(فقہ القرآن ج ۳ ص۱۹-۴۱۸)

"آیت میں نیک بیبیوں کا پہلا وصف قٰنِتٰت بتایا گیا ہے یعنی وہ احکام الٰہی کی فرمانبردار اور مطیع ہوتی ہیں، سرکش اور نافرمان نہیں ہوتیں۔

(فقہ القرآن ج ۳ ص۳۹۰)

قَانِتَاتٌ سے اگر خاوندوں کی فرمانبردار بیویاں مراد لی جائیں تو یہ چونکہ واضح طور پر شوہروں کے "سربراہ" اور "کارفرما" ہونے کا عملی تقاضا تھا اس لئے اس سے بچنے کی راہ یہ نکالی گئی کہ قَانِتَاتٌ کا ترجمہ سورہ احزاب کی آیت کی روشنی میں "شوہروں کی فرمانبردار بیویوں" کی بجائے "اللہ کی مطیع فرمان" خواتین سے کر ڈالا گیا حالانکہ سورہ احزاب کی محولہ آیت میں "اللہ کی اطاعت شعار خواتین" کا ترجمہ اس لئے درست ہے کہ وہاں وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کا قرینہ "قنوت" کو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کر رہا ہے جبکہ سورہ نساء میں قنوت کا ترجمہ "شوہروں کی اطاعت گزار بیویاں" صحیح ہے جس پر کئی قرائن دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ آیت زیر بحث میں مرد کی "قوامیت" (سربراہی و کارفرمائی) کے بالمقابل عورتوں کے "قنوت" کا ذکر ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں "قنوت" سے شوہروں کی اطاعت و فرمانبرداری مراد ہے۔

۲۔ اسی آیت میں عورتوں کا ایک اور وصف حافظات للغیب کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس کا مفہوم محترم عثمانی صاحب نے یہ بیان فرمایا ہے کہ

"اس آیت میں حافظات للغیب بڑا ہی جامع لفظ ہے اس میں ہر اس

چیز کی حفاظت آجاتی ہے جو شوہر کی ہو گھر کے سازو سامان کی حفاظت اس کے نطفے کی حفاظت، نسب کی حفاظت، عزت و آبرو کی حفاظت، اس کے رازوں کی حفاظت سب چیزیں اس میں شامل ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۹۰)

اب اگر حافظات للغیب کے وصف میں حفاظت سے مراد ہر اس چیز کی حفاظت ہے جو شوہر کی ہو تو لامحالہ پہلے وصف میں "قنوت" سے مراد بھی احکام شوہر کی ہی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ جس طرح دوسرے وصف میں شوہروں کی عدم موجودگی میں خواتین اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے تحت (بما حفظ اللہ) مردوں کے حقوق کی محافظ و نگراں ہوتی ہیں بالکل اسی طرح پہلے وصف (قنوت) میں وہ اللہ کے حکم کے تحت ہی اپنے شوہروں کے احکام کی مطیع و فرمانبردار ہوتی ہیں لَا طاعۃَ لمخلوقٍ فی معصیۃِ الخالق۔

بہرحال محترم عثمانی صاحب کا یہ طرزِ عمل کچھ عجیب سا ہے کہ دوسرے وصف (حافظات للغیب) میں حفاظت کا تعلق تو شوہر کی اشیاء سے جوڑتے ہیں مگر پہلے وصف میں قنوت (یعنی اطاعت شعاری) کا تعلق احکام شوہر سے قائم نہیں فرماتے۔

۳۔ آیت میں بیوی کے "نشوز" کا بھی ذکر ہے "نشوز" کیا ہے؟ شوہر کے احکام وحقوق کے مقابلے میں "سر اٹھانا" "بالاتری اختیار کرنا" جسے عرف عام میں "سرکشی" کہا جاتا ہے۔ قرآن عورت کے اس "نشوز و سرکشی" کو ایک ایسا عیب قرار دیتا ہے جس کی اصلاح وتغییر کے لئے شوہر کو پند و نصیحت کرنے نیز اسے خوابگاہ میں تنہا چھوڑ دینے اور آخر کار مارپیٹ سے کام لینے کا بھی اختیار دیتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر شوہر کی قوامیت کے خلاف عورت کا نشوز و سرکشی ایک عیب ہے تو اس کی خوئے انقیاد و سرافگندگی ایک ایسی مطلوب و محمود خوبی ہے جو "قوامیت شوہر" کے مقابلے میں "قنوتِ زوج" کا لازمی تقاضا ہے۔

۴۔ قَانِتَات سے مراد شوہر کی مطیع فرمان بیویاں ہیں یا اللہ کی اطاعت شعار خواتین؟ قرآن آگے چل کر قطعی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں خود یہ بیان کر دیتا ہے کہ

فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ اگر وہ تمہاری اطاعت اختیار کرلیں تو ان پر

سَبِيْلًا دست درازی کی راہیں تلاش نہ کرو۔

اَطَعْنَكُمْ (تمہاری اطاعت اختیار کرلیں) کے الفاظ قنوت میں مضمر اطاعت و فرمانبرداری کو شوہر کے ساتھ خاص کر دیتے ہیں۔ ایک سلیم القلب شخص جو خارج از قرآن نظریات کو اپنے قلب و دماغ میں پہلے سے راسخ نہ کرچکا ہو، قانتات سے مراد، شوہروں کی اطاعت گزار بیویوں کے علاوہ کوئی دوسرا مفہوم لے ہی نہیں سکتا۔

بالآخر شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کے بارے میں عثمانی صاحب کو یہ لکھنا ہی پڑا کہ

"ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ عورتوں کو اپنے شوہروں کا مطیع و فرمانبردار بھی ہونا چاہیئے لیکن اطاعت اطاعت میں فرق ہے ایک اطاعت محکومانہ اور غلامانہ ہوتی ہے جو ایک جابر اور مطلق العنان حاکم کی کی جاتی ہے۔ اور ایک اطاعت رضا کارانہ اور مساویانہ ہوتی ہے جو ایک مشفق و محب صادق کی کی جاتی ہے۔ آخر بڑے سے بڑے جمہوری معاشرے میں بھی انتظامیہ کے افراد کی اطاعت کی جاتی ہے۔ بہرحال ہم محکومانہ اور غلامانہ اطاعت کا انکار کرتے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ صـ۴۱۹)

یقیناً عائلی زندگی کا حسن و کمال اسی بات میں ہے کہ گھر کی فضا میں بیوی احکام شوہر کی اطاعت، رضا کارانہ، محبانہ، مشفقانہ، مساویانہ اور خوش دلانہ انداز سے کرے وہ اپنے شوہر کی فرمانبرداری اس والہانہ الفت سے کرے کہ شوہر کو اپنے "سربراہانہ" اور "کار فرمایانہ" اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے وعظ و نصیحت، خوابگاہوں سے علیحدگی اور مار پیٹ سے کام لینے کی نوبت ہی نہ آئے، لیکن اگر عائلی فضا اس معیار مطلوب کو نہ پہنچ پائے اور شوہر کو اپنی بیوی سے سرکشی و نافرمانی کا خوف ہو تو اس صورت میں اسے بیوی کے خلاف اپنے "سربراہانہ" اور "قوامانہ" اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے پند و نصیحت سے لے کر مار پیٹ تک کی اجازت ہے یہاں تک کہ بیوی اپنے نشوز کو ترک کر کے اطاعت شوہر کی طرف پلٹ آئے۔ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ (اگر وہ تمہاری اطاعت اختیار کرلیں) کے الفاظ اسی حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔

## آیت ۳۴ کا مخاطب کون؟

آیت زیر بحث میں، جناب عثمانی صاحب نے ایک اور سوال یہ اٹھایا ہے کہ عورتوں کو وعظ و نصیحت کرنے، انہیں ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دینے اور ان کی مار پیٹ کے احکام کا مخاطب کون ہے؟ وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"یہاں خطاب میاں بیوی کو نہیں بلکہ جماعت کو ہے خود آیت مذکورہ بالا میں بات میاں بیوی کی نہیں ہو رہی ہے بلکہ نوعِ انسان کی دو اصناف یعنی صنفِ رجال اور صنف نساء کی بات ہو رہی ہے قرآن نے اس آیت میں دونوں اصناف کے فرائض بتائے ہیں ----- گھر کا بڑا بزرگ خاندان کا سربراہ، حاکم مجاز، باپ، بھائی سب اس خطاب میں آجاتے ہیں کہ وہ اول عورت کو نصیحت کریں، اسے اس کے سونے کے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں، ان باتوں سے اصلاح نہ ہو تو جسمانی سزا دیں جو اذیت رساں نہ ہو۔"
(فقہ القرآن ج ۳ ص ۸۱-۹۲)

ب غلام احمد پرویز صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہو رہی ہے۔ عام مردوں اور عورتوں کے فرائض سے متعلق ہو رہی ہے ---- اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں بلا عذر اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسل انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی عورتوں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی جائے کہ ان کی یہ روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کی موجب ہے اگر اس پر بھی باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خوابگاہوں میں چھوڑ دیا جائے یہ ایک قسم کی نظر بندی (INTERNMENT) کی سزا ہو گی اور اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔" (CORPORAL PUNISHMENT)
(طاہرہ کے نام ص ۵۸-۵۷)

سوال یہ ہے کہ آخر اس بات کی دلیل کیا ہے کہ آیت زیرِ بحث میں صیغہ امر کے مخاطب شوہر نہیں بلکہ افرادِ معاشرہ یا حکامِ معاشرہ ہیں؟ ایسی کوئی دلیل محترم عثمانی صاحب یا جناب پرویز صاحب نے بیان نہیں کی۔ البتہ خواجہ احمد دین امرتسری (جنہوں نے غالباً سب سے پہلے یہ موقف اختیار کیا تھا) کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ

"وہ اپنی تائید میں اگلی آیت ۳۵ کو پیش کرتے ہیں جس میں منتظمین کو بصیغہ جمع اور میاں بیوی کو بصیغہ تثنیہ لایا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا۔ ترجمہ خواجہ صاحب۔ اور (اے حاکمو) اگر تمہیں ان دونوں (یعنی میاں بیوی) کی مخالفت (یا مقابلہ) کا خوف ہو تو تم ایک منصف میاں کے اہل سے اور ایک منصف بیوی کے اہل سے کھڑا کرو۔۔۔۔الخ"

(قرآن سے قرآن تک (مرتبہ عرشی صاحب) ص۲۷۷)

نزولِ قرآن سے لے کر آج تک تمام علماء، فقہاء، محدثین، مترجمین و مفسرینِ قرآن زیرِ بحث آیت میں مذکور احکام ثلاثہ کا مخاطب شوہر حضرات ہی کو سمجھتے رہے ہیں خواجہ صاحب مذکور غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے ان احکام کا مخاطب حکامِ معاشرہ یا افرادِ خانہ کو قرار دیا ہے اس کے بعد جناب پرویز صاحب اور محترم عثمانی صاحب نے جمہور علماء امت کی روش سے ہٹ کر خواجہ صاحب کی ہمنوائی کی۔ ہمارے نزدیک جملہ علماء سلف و خلف کی رائے ہی اصح اور احق ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور قابلِ غور ہیں۔

۱۔ ان احکامِ ثلاثہ میں سے ایک حکم یہ ہے کہ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (عورتوں کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو) ظاہر ہے کہ اس حکم کے مخاطب وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو عورتوں کے شریکِ بستر ہوں۔ عورتوں کی طرف سے نشوز و نافرمانی کی صورت میں انہیں ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دینے کی سزا اُن کے شوہر ہی دے سکتے ہیں۔ کوئی بھائی باپ یا بیٹا، اپنی بہن، بیٹی یا ماں کا شریکِ بستر نہیں ہوا کرتا کہ انہیں نشوزِ نسواں کی

صورت میں اس حکم کا مخاطب قرار دیا جائے۔ اس لئے آیت زیر بحث میں ان احکامِ ثلاثہ کے مخاطب بالیقین شوہر حضرات ہی ہیں نہ کہ کچھ اور لوگ۔

رہا پرویز صاحب کا یہ فرمان کہ ـــــ "عورتوں کو ان کی خوابگاہوں میں چھوڑ دینا ایک قسم کی سزائے نظر بندی ہے" ـــــ تو یہ حقیقتِ نفس الامری کی بڑی ناقص اور ادھوری تعبیر ہے۔ اگر اس سے مراد محض "سزائے نظر بندی" ہوتی تو قرآن "وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ" کی بجائے "وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ" کی تعبیر اختیار کرتا جیسا کہ اتیانِ فاحشہ کی صورت میں آیت ۴/۱۵ میں فَامْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے قرآن نے یہی تعبیر اختیار کی اس لئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ کے حکم میں سزائے نظر بندی سے کہیں زیادہ شدت و غلظت پائی جاتی ہے کہ عام نظر بندی میں، میاں بیوی شریک بستر ہونے کی راحت سے محروم نہیں ہوتے مگر یہاں یہ راحت بھی مفقود ہے۔

۲۔ رہا یہ امر کہ ـــــ "اس آیت سے متصل بعد والی آیت میں جمع حاضر کے صیغوں سے افراد معاشرہ یا حکامِ معاشرہ کو خطاب کیا گیا ہے اور زوجین کا ذکر تثنیہ غائب کے صیغوں میں کیا گیا ہے اس لئے آیت زیر بحث میں بھی حاضر کے صیغوں سے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے وہ شوہر حضرات نہیں بلکہ دیگر افراد خانہ یا حکام معاشرہ ہیں۔ تو یہ ایک نہایت ہی کمزور دلیل ہے جسے پیش کرتے ہوئے یہ گویا پہلے سے طے کر لیا گیا ہے کہ بیوی کے نشوز کی صورت میں شوہر کو کوئی ایسا موقع سرے سے دنیا ہی نہیں ہے جس میں وہ اپنی ازدواجی زندگی کے بگاڑ کو خود درست کر سکے حالانکہ یہ بات قطعی غلط ہے۔ بیوی کی سرکشی اور نافرمانی کی صورت میں قرآن پہلے خود شوہر کو "سربراہِ خانہ" اور "کارفرما" ہونے کی حیثیت سے یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ بیوی کو نشوز سے اطاعت و فرمانبرداری کی طرف لوٹائے۔ اس مقصد کے لئے نرمی اور سختی دونوں طریقوں سے کام لینے کی شوہر کو اجازت ہے۔ سب سے پہلے وہ نرمی اور بردباری سے اسے سمجھائے بجھائے (فَعِظُوْهُنَّ) اگر زنِ ناداں پر شوہر کا یہ کلامِ نرم و نازک بھی بے اثر ثابت ہو تو اس

سے سخت تر رویہ یہ اختیار کرے کہ بیوی کو اس کے بستر میں تنہا چھوڑ دے (وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ) اگر یہ سزا بھی اسے راہِ راست پر نہ لا سکے تو بیش از بیش جو سخت ترین رویہ وہ اختیار کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ بیوی کو بدنی سزا دے (وَاضْرِبُوْهُنَّ) جب شوہر کی طرف سے بیوی کو راہِ راست پر لانے کی یہ تمام نرم اور گرم کوششیں ناکام ہو جائیں اور بیوی اپنی ضد پر قائم رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اصلاحِ احوال کا معاملہ اب زوجین کے بس سے باہر ہو چکا ہے۔ اب یہ کوشش فریقین کے علاوہ دیگر افرادِ معاشرہ یا حکامِ معاشرہ کو انجام دینی چاہیئے اس لئے قرآن آیت زیر بحث میں اصلاحِ احوال کے لئے تو شوہر کو مخاطب کرتا ہے اور جب وہ ناکام ہو جاتا ہے تو قرآن اپنے روئے تخاطب کو اگلی آیت میں دیگر افراد یا حکام معاشرہ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ یہ ہے وہ وجہ جس کی وجہ سے آیتِ زیر بحث میں صیغۂ امر کے مخاطب شوہر حضرات ہیں اور اس کے بعد والی آیت کے حکم کے مخاطب افرادِ خاندان یا حکامِ معاشرہ ہیں۔

## پلندۂ تضادات

سورۂ نساء کی زیر بحث آیت میں احکام کے مخاطب شوہر ہیں یا دیگر افراد معاشرہ؟ یہ بات واضح ہو چکی ہے مگر عثمانی صاحب ایسی ژولیدہ فکری اور تضاد خیالی کا شکار ہیں کہ کہیں ان احکام کا مخاطب شوہر کو قرار دیتے ہیں اور کہیں دیگر افرادِ معاشرہ کو۔ ذیل میں ہم ان کے وہ اقتباسات پیش کرتے ہیں جن میں ان احکام کا مخاطب عام مردوں کی بجائے شوہروں کو قرار دیا گیا ہے۔

> "اگر بیوی کی طرف سے نافرمانی اور بدسلوکی کا اندیشہ ہو تو شوہر کو چاہیئے کہ وہ بیوی کو نصیحت کرے اسے سمجھائے اگر اس سے بات نہ بنے تو کچھ عرصہ اسے خوابگاہ میں تنہا چھوڑ دے اور اس سے بے تعلق ہو جائے اگر وہ پھر بھی راہِ راست پر نہ آئے تو اسے معمولی سزا دی جا سکتی ہے۔"
>
> (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۹۷)

"یہ آیت کریمہ (مراد ہے آیت ۱۲۸، قاسمی) شوہر کے نشوز کے متعلق تھی۔

اگر بیوی کی طرف سے نشوز ہو تو سورۃ نساء ہی میں ہے وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا ہ۔ ترجمہ ۔ اور وہ عورتیں جن کی بدسلوکی اور نافرمانی کا اندیشہ ہو تو تم انہیں نصیحت کرو اور انہیں خوابگاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور معمولی طور پر جسمانی سزا دو پھر اگر وہ تمہاری فرمانبرداری کریں تو ان پر زیادتی کی راہیں تلاش نہ کرو بلاشبہ اللہ بہت بلند اور بڑی شان والا ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۲ ص۱۸۶)

اس اقتباس کا ابتدائی حصہ "اگر بیوی کی طرف نشوز ہو" یہ واضح کرتا ہے کہ آیت میں بنی نوعِ انسان کی دو اصناف (صنفِ رجال اور صنفِ نساء) میں سے کسی صنف واحد کا ذکر نہیں ہے بلکہ زوجین میں سے بیوی کے نشوز کا ذکر ہے۔ لہٰذا بیویوں کے مقابلے میں احکامِ ثلاثہ کے مخاطب عام افراد یا حکام معاشرہ نہیں بلکہ شوہر حضرات ہیں۔

ایک اور مقام پر محترم عثمانی صاحب احکام القرآن (جصاص) سے ایک اقتباس اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں جس میں یہ جملے بھی موجود ہیں۔

"شوہر کا معاملہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے اور اسے حکم دیا جا چکا ہے کہ وہ بیوی کو سمجھائے بجھائے اسے خدا کا خوف دلائے پھر بھی وہ باز نہ آئے تو اسے جسمانی سزا دے اگر پھر بھی وہ نافرمانی پر قائم رہے تو جسمانی سزا دے لینے کے بعد شوہر کو اب کچھ اور کرنے کا اختیار نہیں رہا بجز اس کے کہ وہ ایسے حاکم کے پاس مرافعہ لے جائے جو ظالم سے مظلوم کو انصاف دلائے اور اس پر اپنا فیصلہ نافذ کر سکے۔ (فقہ القرآن ج ۲ ص۱۹۱)

اور اب یہ بھی!

محترم عثمانی صاحب کے ان سب اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ آیت زیر بحث میں مذکور افراد سے مراد شوہر اور ان کی بیویاں ہیں نہ کہ خاندان، یا معاشرہ کے عام مرد

حضرات و خواتین ۔ لیکن اس کے بعد اب یہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"اس آیت میں دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہاں خطاب میاں بیوی کو نہیں بلکہ جماعت کو ہے۔ لہٰذا گھر کا بزرگ، خاندان کا سربراہ حاکم وقت بھائی باپ شوہر سب اس میں آجاتے ہیں کہ وہ اول عورت کو نصیحت کریں اسے اس کے سونے کے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں ان باتوں سے اصلاح نہ ہو تو ایسی جسمانی سزا دیں جو اذیت رساں نہ ہو۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۱۸۹)

"اس آیت میں دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہاں خطاب میاں بیوی کو نہیں ہے بلکہ جماعت کو ہے خود آیت مذکورہ بالا میں بھی میاں بیوی کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ نوعِ انسان کی دو اصناف یعنی صنفِ رجال (مرد) اور صنفِ نساء (عورت) کی بات ہو رہی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۸۱)

"اس آیت میں دوسری توجہ طلب بات یہ بھی ہے کہ یہاں خطاب میاں بیوی کو نہیں ہے بلکہ جماعت کو ہے، لہٰذا گھر کا بڑا بزرگ خاندان کا سربراہ۔ حاکمِ وقت، باپ بھائی سب ہی ان میں آجاتے ہیں کہ وہ اوّل عورت کو نصیحت کریں اسے اس کے سونے کے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں، ان باتوں سے اصلاح نہ ہو تو ایسی جسمانی سزا دیں جو اذیت رساں نہ ہو۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۹۶)

اس عبارت سے صرف دو صفحے قبل محترم عثمانی صاحب یہ قلمبند فرما چکے ہیں کہ

"اگر بیوی کی طرف سے نافرمانی اور بدسلوکی کا اندیشہ ہو تو شوہر کو چاہیئے کہ وہ بیوی کو نصیحت کرے اسے سمجھائے اگر اس سے بات نہ بنے تو کچھ عرصہ اسے خوابگاہ میں تنہا چھوڑ دے اور اس سے بے تعلق ہو جائے اگر وہ پھر بھی راہ راست پر نہ آئے تو اسے معمولی سزا دی جا سکتی ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۹۴)

## باب ۲

# عورت کا دائرۂ کار

قرآن پاک نے عورت کا دائرہ عمل یہ کہہ کر گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا ہے کہ وَقَرْنَ فِی بُیُوْتِکُنَّ (اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹکی رہو) علماء کے نزدیک "وَقَرْنَ" کا لفظ یا تو "قرار" سے ماخوذ ہے یا "وقار" سے۔ "قرار" سے ماخوذ ہونے کے باعث اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "تم اپنے گھروں میں ٹکی رہو۔" "وقار" سے مشتق ہونے کی بنا پر اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ "تم اپنے گھروں میں وقار سے رہو۔" میں نے دونوں مفہومات کا لحاظ رکھتے ہوئے جامع ترجمہ یہ کیا ہے کہ "تم اپنے گھروں میں وقار سے ٹکی رہو۔"

قرآن پاک کی یہ آیت مسلم خواتین کے دائرۂ کار کو خانگی امور کی انجام دہی تک محدود کر دیتی ہے۔ دخترانِ اسلام کا اپنے گھروں میں رہتے ہوئے اسلامی تہذیب کی خدمت کرنا ہی ان کا باوقار وظیفۂ حیات ہے۔ انہیں فطرت نے ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے جن کا خدمتِ تمدن کے لئے بہترین مصرف گھریلو زندگی ہے۔ ان خصوصیات کا احسن و اقوم نشو و نما بھی حصار خانہ ہی میں ہو سکتا ہے۔ عورت پر جن فطری ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا ہے ان سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے بیرونِ خانہ کے واجبات سے سبکدوش کر کے درونِ خانہ فرائض کی انجام دہی کے لئے وقف کر دیا جائے۔ اس کی نسوانیت کا یہی فطری اور منطقی تقاضا ہے۔ اسلام اپنی بیٹیوں کو گھروں میں امور مفوضہ کو سرانجام دینے کا حکم دے کر عزت و

توقیر کے تمام پھول اس کے قدموں میں ڈال دیتا ہے جن کی وہ عورت۔ اور صرف عورت۔ ہونے کی حیثیت سے مستحق ہے اسلام کا اعجاز و کمال یہی ہے کہ وہ عورت کو (۱) عورت کے مقام پر رکھ کر اور (۲) اس سے اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق کام لے کر اسے عزت و توقیر اور احترام و تکریم کا حقدار بناتا ہے بخلاف اس کے کہ تہذیب مغرب عورت کو (۱) اس کے فطری دائرۂ کار سے اکھاڑ کر (۲) اسے مردوں کے دائرۂ عمل میں لاتی ہے اور پھر (۳) اسے مصنوعی مرد بنا کر اُس سے وہ کام لیتی ہے جو مردوں کی فطرت سے تو میل کھاتا ہے مگر خواتین کی فطرت سے نامانوس ہوتا ہے۔ اس کا نام "مساواتِ مرد و زن" رکھا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ عورت اپنے فطری وظائف سے تو قطعاً چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ اپنی فطری ذمہ داریوں کے ساتھ اگر وہ بیرونِ خانہ واجبات کا بوجھ بھی اٹھانے پر مجبور کر دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عورت ہونے کی حیثیت سے اپنی فطری ذمہ داریوں کا بھی پورا بار اٹھائے اور گھر سے باہر نکل کر مردوں کے واجبات کا بھی نصف بوجھ برداشت کرے۔ گویا عورت پر اگر مقدارِ بار ڈیڑھ گنا ہو اور مردوں پر بارِ کار آدھا رہ جائے تو "مساواتِ مرد و زن" قائم ہو جاتی ہے۔ اس طرح اگر عورت کو اس کے فطری مستقر (جو گھر ہے) سے اکھاڑ کر اسے مصنوعی مرد بنا کر مردوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے تو اس کا نام "آزادیٔ نسواں" ہے۔

## فطری تقسیمِ کار

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے مرد و زن کے میدانِ عمل میں درونِ خانہ اور بیرونِ خانہ امور کی جو فطری تقسیم و تفریق دونوں اصناف بشریہ میں کی ہے وہ نہ صرف یہ کہ معقول ہے بلکہ فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی انسب ہے تمدن کا مفاد اسی میں ہے کہ عورت اپنے مقام پر رہ کر تمدن کی خدمت کرے اور مرد اپنے مستقر پر۔ یہی فطری تقسیمِ کار ہے جب کبھی اس تقسیمِ کار کی ترکیب میں برہمی پیدا ہوئی تمدن فساد کا شکار ہوا اور نظامِ حیات کا ایسا خارزار پیدا ہوا جس میں ہر مسئلے کے حل کی کوشش نئے مسائل کو جنم دیتی رہی۔

دنیا کے اندر انسانی تمدن کے قوام میں پیدا ہونے والے بگاڑ کو دور کرنے میں نہ تو قدیم تصورات ہی کو کامیابی ہوئی اور نہ جدید تصورات ہی کو۔ فسادِ تمدن کو مدنیت صالحہ میں تبدیل کرنے میں جو کامیابی قرونِ اولیٰ میں اسلامی تصورات کو حاصل ہوئی اس کی مثال کسی دوسرے دین میں نہیں ملتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دینِ اسلام کا خالق ہی نوعِ انسان کا خالق ہے۔ اس لئے وہ دونوں اصنافِ بشر کی نفسیات اور اس کے فطری لوازمات سے جس قدر واقف اور عالم ہے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس نے دنیا کی ہر مخلوق کے لئے جو خاص فرائض و واجبات اور امور و وظائف مقرر کئے ہیں ان کی انجام دہی کے لئے اس کے مطابق مخصوص ماحول تیار کئے ہیں۔

## ماحول اور فطری صلاحیتوں میں تطابق و توافق!

اس طرح ہر نوعِ مخلوق کا ایک خاص ماحول اس کی مخصوص جسمانی ساخت بدنی قویٰ اور ذہنی صلاحیتوں کے حسبِ حال ہوتا ہے اس طرز پر اس کی جسم و جان کی قوتیں فکری استعدادیں ذہنی صلاحیتیں ترکیبِ اعضاء و جوارح یہ سب کچھ اس خاص ماحول میں ہی اس کے واجباتِ زندگی کی بجا آوری میں اپنا صحیح مصرف پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے عورت کو ایسی منفرد خصوصیات اور مخصوص صلاحیتوں سے نوازا ہے جنہیں اگر اس کے وظیفۂ جبات کی مناسبت سے اور اس کے مقصد زندگی کی روشنی میں دیکھا جائے تو عقل یہ باور کرنے پر مجبور ہوتی ہے کہ مرد کے میدانِ عمل سے عورت کا دائرہ الگ اور متغائر ہی ہونا چاہیئے۔ نسلِ انسانی کی بقاء و تسلسل کی ذمہ داری کا غالب حصہ عورت ہی پر منحصر ہے تمدن کے لئے صرف ایک کارکن کی فراہمی کے لئے عورت اپنی فطری ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے چار مراحل سے گزرتی ہے۔

## حیاتِ نسواں کے مراحلِ اربعہ

۱۔ حمل ۲۔ وضع حمل ۳۔ رضاعت ۴۔ پرورش و تربیت۔ ان میں سے ہر مرحلہ عورت کی زندگی کا اہم اور دشوار گزار زمانہ ہوتا ہے۔ اول الذکر تین مراحل تو ایسے ہیں کہ ان میں عورت، صحت کی نسبت بیماری سے قریب تر ہوتی ہے

بلکہ فی الواقعہ وہ ایک قسم کی مریض ہی ہوتی ہے جس میں حفظانِ صحت کے لئے علاج معالجہ کی محتاج ہوتی ہے اس عرصے میں اس کی دانستہ یا نادانستہ معمولی سی بے احتیاطی بھی اس کی اور اس کے پیٹ یا گود میں پلنے والے بچے کی زندگی کو معرضِ خطر میں ڈال سکتی ہے علمائے طب نے اس موضوع پر کثیر مقدار میں ایسا تحقیقی لٹریچر شائع کیا ہے جو خواتین کے ان مراحل میں پیدا ہونے والی تکالیف اور ان کے علاج معالجہ سے بحث کرتا ہے۔ علم طب کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ اس جہانِ رنگ و بو میں ایک نئی جان کا اضافہ کرنے کے لئے عورت کو کیسی پُرخطر وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

## خواتین کے مراحل ثلاثہ کی تکالیف

ہم ڈاکٹر کاشی رام کی کتاب "امراضِ نسواں" میں سے خواتین کے ان ہر سہ مراحل کی تکالیف کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں تاکہ عورت کے فطری وظائف کی گرانباری کا کچھ تو اندازہ ہوسکے۔ واضح رہے کہ محترم عثمانی صاحب بھی طبی تحقیقات کو پیش کرنے کے لئے اسی کتاب کی طرف رجوع فرمایا کرتے ہیں۔

## زمانۂ حمل کی تکلیفات

ڈاکٹر صاحب موصوف "حمل کے زمانے کی تکلیفات اور ان کا علاج" کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں کہ

"(عورت کے رحم میں) نطفہ قرار پاتے ہی نظامِ جسم کا توازن قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ قوتِ حیات کا رخ ایک نئی زندگی کو نشو و نما دینے کے لئے رحم اور اس کے متعلقہ اعضاء کی طرف ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے باقی نظامِ جسم میں ہم آہنگی اور توازن نہ رہ کر ایک قسم کی پراگندگی اور تلاطم پیدا ہوجاتا ہے۔

بعض تکلیفات بہت معمولی ہوتی ہیں بعض نہایت گہری اور خطرناک چھپی ہوئی جسمانی اور خاندانی کیفیتیں ابھر آتی ہیں اور وہ سر اٹھا کر اہم ترین تکلیف

کا موجب بنتی ہیں۔ (ہونے والے بچے کے) والدین کو بھی موقعہ ملتا ہے کہ وہ اپنا اثر آنے والے بچہ پر ڈالیں۔" (امراضِ نسواں ص ۸۳)

"اس میں شک نہیں کہ مختلف عورتوں کو مختلف قسم کی تکلیفیں ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جسم کا کوئی عضو بھی اور بیماری کی کوئی نمود بھی ایسی نہیں جو حاملہ عورت کو نہ ہو سکے یا جو حمل کے دوران نمودار نہ ہو سکے تاہم میں نے دنیا کے ریکارڈ اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر آنے والی بیماری کو فرداً فرداً لیا ہے لیکن ایسی بیماریاں بھی ہو سکتی ہیں جن کا ذکر اس مختصر کتاب میں (جو بڑی تقطیع کے ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ قاسمی) نہیں آسکا۔۔۔۔۔ میں نے حمل کے زمانہ کی بیماریوں کو مفصلہ ذیل حصص میں منقسم کیا ہے۔

(۱) ہاضمہ کی نالی کی بے قاعدگیاں۔ ۲۔ رطوبتوں میں کمی، زیادتی اور تبدیلیاں ۳۔ دورانِ خون اور تنفس کی خرابیاں۔ ۴۔ رحم اور رحم کے متعلقہ اعضاء کی خرابیاں۔ ۵۔ جذبات و احساسات کی تبدیلیاں اور خرابیاں۔ ۶۔ نظام عصبی کی خرابیاں۔" (امراضِ نسواں ص ۸۴)

## تفصیل تکالیف دورانِ حمل

اب "زمانۂ حمل کی ان تکالیف" پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالئے جن کی تفصیل کتاب مذکور کے کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

"(الف) ہاضمہ کی نالی کی بے قاعدگیاں

۱۔ بھوک کی کمی اور مختلف اشیاء کی خواہش ۲۔ معدے کی خرابیاں یعنی قے، متلی، کلیجے میں جلن اور تیزابیت ۳۔ آنتوں کی خرابیاں یعنی قبض، دست مقعد اور مبرز میں ناسور، ریاح کا بند ہونا، ریاحی گڑگڑاہٹ، ریاحی دردِ شکم اور ریاحی قولنج۔

(ب) رطوبتوں کی کمی بیشی

۱۔ تھوک کی زیادتی ۲۔ کثرتِ بول، تقطیر بول اور قلتِ بول کے عوارض

۳۔ پیشاب میں البیومن کی زیادتی۔

(ج) آلاتِ تنفس کی خرابیاں

۱۔ کھانسی ۲۔ سانس میں دقت یا سینہ میں سکڑن۔

(د) نظام خون کی خرابیاں

۱۔ دورانِ خون میں تیزی ۲۔ بھُس (ANEGMA) ۳۔ یوریمیا (خون میں پیشاب کا مل جانا) ۴۔ استسقائی تکالیف ۵۔ بواسیر

۶۔ وریدوں کا بڑھنا اور پھُول جانا۔

(ہ) رحم سے متعلقہ تکلیفات (یہ تین اقسام پر مشتمل ہیں)

۱۔ احساسات مثلاً درد، اینٹھن اور ذکی الحسی ۲۔ رحم کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا ۳۔ غیر معمولی رطوبتوں کا نکاس مثلاً سیلان الرحم اور بچہ کی تھیلی (جس میں بچہ ہوتا ہے) میں استسقائی عوارض۔

(و) ملحقات رحم کی تکلیفات

۱۔ شرمگاہ پر خارش ۲۔ رحم کے متعلقہ اعضاء، بدن میں درد۔

(ز) اعضاء حرکت (LOCOMOTION) کی تکالیف

۱۔ پیڑو کے جوڑوں کا درد ۲۔ پیڑو کے جوڑوں کا ڈھیلا پڑجانا ۳۔ چلتے پھرتے نقاہت کے باعث گرپڑنے کا احساس۔

(ح) نظام عصبی کی تکالیف

۱۔ قوت سامعہ پر منفی اثرات ۲۔ آنکھوں کی تکلیفات ۳۔ اعصابی درد ۴۔ کوریا رعشہ ۵۔ ہسٹریا، اختناق الرحم، باؤ گولہ ۶۔ دماغی قویٰ کا تعطل ۷۔ دنیائے جذبات واحساسات اور عالم مزاج میں برہمی۔"

(امراضِ نسواں ملخص ص ۹۶ تا ص ۱۶۵)

یہ ہیں وہ تکالیف جن میں سے کم و بیش ہر عورت کو گزرنا پڑتا ہے اگر دورانِ حمل کسی وقت اسقاطِ حمل ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں لاحق ہونے والے عوارضات اس پر مستزاد ہیں حمل کا یہ تکلیف دِہ دَور گزرنے کے بعد وہ وقت آتا ہے۔ جب عورت کا چراغِ حیات زچگی کی تکلیفات کی آندھیوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے تاکہ تمدن کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لئے ایک نئی زندگی جنم پا سکے۔

## تکالیف وضع حمل

"وضع حمل کی تکلیفات" کا خلاصہ درج ذیل ہے جسے ڈاکٹر صاحب موصوف نے تین ابواب میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔

(الف) وضع حمل کی تکالیف

۱۔ وضع حمل کے درد ۲۔ رحم کے منہ میں سختی ۳۔ رحم کے درمیان میں غیر قدرتی سکڑن ۴۔ غشی ۵۔ تھکاوٹ و نقاہت کا احساس۔

(ب) سیلانِ خون

۱۔ اندرونی سیلانِ خون ۲۔ نہ رک سکنے والا سیلان ۳۔ وضع حمل کے بعد سیلانِ خون۔

(ج) عفونتی تشنجی دورے (جن کی تفصیل بڑی تقطیع کے چھ صفحات پر مذکور ہے)" (امراضِ نسواں۔ خلاصہ ص ۱۶۶ تا ص ۱۹۱)

## وضع حمل کے بعد کی تکالیف

وضع حمل کے بعد عورت کو صعوبتوں کی ایک اور دشوار گزار گھاٹی میں سے گزرنا پڑتا ہے جسے ڈاکٹر کاشی رام نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان تکالیف کا ملخص یہ ہے۔

۱۔ آنول کا رک جانا ۲۔ پیشاب کا رکنا ۳۔ وضع حمل کے بعد کے درد ۴۔ نفاس کی خرابیاں ۵۔ پیٹ کا لٹک جانا ۶۔ سطح شکم میں جھریوں اور شگاف کا نمودار رہنا ۷۔ ناف کا زخم ۸۔ وضع حمل کے

بعد بخار کا حملہ ۹۔ رحم کی وریدوں کا ورم ۱۰۔ کاذب پردۂ باریطون کا ورم ۱۱۔ عفونتی دیوانگی یا پرسوت کا پاگل پن ۱۲۔ ٹانگ کی ورید کا ورم۔ (امراض نسواں ملخص ص۱۹۲ تا ص۲۱۲)

یہ ہیں وہ تکالیف اور صعوبتیں جن سے عورت کو وضع حمل کے بعد اکثر و بیشتر سابقہ پیش آتا ہے اور کتنی ہی خواتین ایسی ہیں جو ان فطری مصائب کی اندھیوں میں اپنا چراغ ہستی بجھا کر نئی زندگی کے دیئے کو روشن کر جاتی ہیں۔

## تکالیف در زمانۂ رضاعت

تکلیفوں کا یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس کے بعد رضاعت کا زمانہ آتا ہے جو عورت پر نئی تکلیفات کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ پستانوں کے سروں (گھنڈیوں) کا پک جانا یا ان میں درد ہونا ۲۔ اختلال نظم جسم کی بناء پر شیر مادر کی غیر معمولی تراوش ۳۔ فقدان شیر مادر یا قلت شیر مادر ۴۔ دودھ کا چھاتیوں سے مسلسل ٹپکتے رہنا ۵۔ پستانوں میں ورم یا سوزش۔ (امراضِ نسواں[1]۔ خلاصۂ مواد ص۲۱۲ تا ص۲۲۰)

یہ ہیں وہ تکلیف دہ مراحل اور پُرصعوبت راستے جن پر سے عورت کو صرف ایک بچے کو جنم دینے کے لئے گزرنا پڑتا ہے۔ چار پانچ بچوں کو جنم دیتے ہوئے وہ نسلِ انسانی کی بقاء و حفاظت کے لئے جس صبر و پامردی اور استقلال و ثبات سے ان اذیتوں کو مسلسل جھیلتی رہتی ہے اس کا اندازہ ایک متاہل شخص ہی کر سکتا ہے۔ بقاءِ نسلِ انسانی کی جدوجہد میں مرد پر یہ اذیتیں وارد نہیں ہوتی ہیں کیونکہ وہ تو صرف ایک ساعت میں اپنا کردار ادا کر دیتا ہے اور وہ بھی لطف و نشاط اور فرحت و انبساط سے محظوظ ہوتے ہوئے لیکن عورت کو تو صحبتِ شوہر کی ایک ساعت کا نتیجہ برسوں تک بھگتنا پڑتا ہے اور وہ بھی شاداں و

[1] ہم نے "امراضِ نسواں" پر بحث کا انحصار دو وجوہ سے رکھا ہے۔ اولاً یہ کہ محترم عثمانی صاحب بھی عموماً اسی کتاب کے حوالے دیتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ اردو دان طبقہ بآسانی اسے پڑھ سکتا ہے۔ ورنہ دورِ جدید میں اس موضوع پر جید علمائے طب کی تحقیقی کتب کی کمی نہیں ہے۔ مغرب کے بعض جید علماءِ طب کی آراء کو مولانا مودودی مرحوم نے اپنی کتاب "پردہ" میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

فرحاں نہیں بلکہ نالاں و رہینِ ستم ہوتے ہوئے تاکہ جیتے جی خدمتِ تمدن کے لئے ایک کارکن فراہم کر جائے ؎

حاصل عمر نثار رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

## حیض کے عوارضات

علاوہ ازیں، ہر ماہ عورت پر کچھ ایسے ایام وارد ہوتے ہیں جن میں وہ ہیم مریضہ کی سی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ان ایام کی تعداد تین سے دس تک کے درمیان ہوتی ہے اس دوران عورت کی صحت کارکردگی اور مزاج پر جو منفی اثرات پڑتے ہیں انہیں کسی بھی طب کی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے بلکہ یہ ایسا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ متاہل اور شادی شدہ حضرات کے علاوہ عام مرد بھی حائضہ عورتوں کی ان کیفیات سے بخوبی آگاہ ہیں ان دنوں عورتیں عموماً اعصابی کمزوری، جسمانی تکان، اعضا شکنی، اضمحلالِ طبیعت اور سوءِ ہضم کا شکار ہوتی ہیں۔ بعض خواتین کو قبض کی شکایت لاحق ہو جاتی ہے کبھی کبھار قے اور متلی کا عارضہ مسلط ہو جاتا ہے۔ بعض مستورات کو چھاتیوں میں درد محسوس ہوتا ہے جو بعض صورتوں میں شدت اختیار کر کے ٹیسوں تک نوبت پہنچا دیتا ہے بعض عورتوں کے حلق کے غدود سوج جاتے ہیں اور گلا بھاری ہو جاتا ہے۔ بعض کو عمل تنفس میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ جسم کا درجۂ حرارت گر جاتا ہے۔ رفتارِ نبض سست پڑ جاتی ہے اعضاء گویائی بھی بعض تغیراتِ سوء کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ بعض خواتین کی طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے اور بلا وجہ رونے کو جی چاہتا ہے الغرض کوئی نہ کوئی تکلیف ہر عورت کو لاحق ہوتی ہے ایسی مستورات کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے جن کو ایامِ حیض کے دوران کوئی تکلیف بھی نہ پہنچتی ہو۔

## نتیجۂ بحث

اب ٹھنڈے دل و دماغ سے عورت کے فطری وظائف پر غور فرمائیے ان وظائف کی بجا آوری میں اسے جن تکلیف دِہ ادوار میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ انہیں بنظرِ غائر ملاحظہ

فرمائیے! دورانِ حیض ماہ بماہ اس کی قوتِ کارکردگی میں جو کلی یا جزئی کمی واقع ہوتی ہے اسے نگاہ میں رکھیئے اور پھر یہ غور فرمائیے کہ بھلا نوع انسانی کی وہ صنفِ لطیف جو اپنے فطری وظائف کو ان تکلیف دِہ مراحل میں سے گزرتے ہوئے بجا لاتی ہے۔ آیا وہ بیرونِ خانہ کے مشقت طلب اور قوت طلب امور سرانجام دے سکتی ہے؟ وہ ہستی جس کی طبعی کمزوریوں کا یہ عالم ہے کہ استقرارِ حمل سے وضع حمل تک اور ولادت اطفال سے اختتامِ رضاعت تک مریضانہ عوارض کا شکار رہتی ہے۔ آیا وہ مرد کے دائرہ کار میں مردانہ جفاکشی اور مستعدی کے ساتھ عدالت وسیاست، تجارت وزراعت، صنعت وحرفت یا مدافعتِ وطن کی گرانبار ذمہ داریوں کی متحمل ہو سکتی ہے؟ وہ صنفِ نازک جو مرد کی ایک ساعت کی صحبت کے نتیجہ میں برسوں تک ایسے مریضانہ حالات میں سے گزرتی ہے کہ اس کی کارکردگی میں خاطر خواہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ حاملہ نہ بھی ہو تب بھی اس پر ایامِ حیض کا ورود اس کی اہلیتِ کارکردگی کو ماہ بماہ معمول سے نیچے کھینچ لاتا ہو۔ کیا وہ زرعی فارموں، صنعتی کارگاہوں اور پیداواری فیکٹریوں کی گرانبار ذمہ داریاں اٹھا سکتی ہے؟ ـــــ ذرا اس متمدن متثقف (ثقافت زدہ) خاتون کو ملاحظہ فرمائیے۔ جو ایک بیرسٹر ہونے کی حیثیت سے اپنے دل ودماغ اور جسم وجان کی تمام قوتیں اس وقت قانون کی ضخیم کتب کھنگالنے میں اور مقدمے میں فریق ثانی کے خلاف ذہنی دنگل لڑنے میں صرف کر رہی ہوتی ہے جبکہ اس کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ اپنی بقاء وحفاظت کے لئے اس کی تمام تر توجہ اور التفات کا مستحق ہے اور ذرا اس بدنصیب شیرخوار بچے کو ملاحظہ فرمائیے جس کی ماں ---- کی رکن ہونے کے ناطے سے قوم کے لئے "ثقافتی شو" اور "کلچرل آرٹ" کے اہتمام میں مصروف مشغول ہے اور اس کا بچہ ماں کے سینے سے تازہ غذائے شیر پانے کے لئے جھولے میں بلک رہا ہے ـــــ اور ذرا اس معصوم جان کو ملاحظہ فرمائیے جس کی والدہ ---- کی پرجوش حمایت کے خیال میں دن رات ہجوم مصروفیات میں مستغرق ہے جبکہ وہ اپنی حقیقی ماں کے دستِ شفقت سے نکل کر کرائے کی خادماؤں کے رحم وکرم پر آ چکی ہے۔

کیا یہی عدل ہے کہ فطرت نے جو اولاد عورت کو بطورِ امانت سونپی ہے اسے کرائے کی ماؤں کے سپرد کر کے وہ خود مصنوعی مرد بن کر کارخانوں کے مزدوروں میں جذب ہو جائے؟ ــــــ کیا "آزادیٔ نسواں" کا یہ مطلب ہے کہ خاتونِ خانہ اپنے فطری وظائف سے گریزاں ہوتے ہوئے۔ بیرونِ خانہ مردانہ سرگرمیوں میں منہمک ہو جائے؟ ــــــ کیا عورت کے لئے اب یہی "معیارِ عزت" رہ گیا ہے کہ وہ اپنی فطری نسوانی ذمہ داریوں سے صرف نظر کرتے ہوئے غیر فطری واجبات کا بوجھ اٹھائے؟ ــــــ کیا "ترقی" اسی چیز کا نام ہے کہ عورت اپنے فطری فرائض سے جان چھڑاتے ہوئے (یا انہیں بجا لاتے ہوئے) تفریح گاہوں، ناچ گھروں، آرٹ کونسلوں، رقص گاہوں اور "ثقافتی" مراکز میں جا کر مردوں کا دل لبھائے؟ ــــــ کیا نسوانی خصوصیات کے "نشو و ارتقاء" کا یہی معنیٰ ہے کہ وہ مردوں کی نگاہِ ہوس کا مرکز بننے کے لئے بیش از بیش پرکشش بن کر ناز فروشی کرے اور اپنے بدن کے ان حصوں کو کھول دے جن میں شیطانی آنکھوں کے لئے کشش پائی جاتی ہے؟

## گھر عورت کا فطری میدانِ عمل

حقیقت یہ ہے کہ عورت، مرد سے تقریباً ہر پہلو سے کمزور واقع ہوئی ہے۔ فطرت نے اسے نسل انسانی کی بقاء و افزائش کے لئے پیدا کیا ہے اس کی فطری ذمہ داریاں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ اسے مردوں کی ہنگامہ خیز، پُر مشقت، قوت طلب اور جانگسل جدوجہد سے دور رکھا جائے اور اس کے لئے ایسا حصارِ عافیت مخصوص کر دیا جائے جہاں وہ سکون و اطمینان سے اپنے مفوضہ فطری وظائف کی بجا آوری کر سکے۔ نسوانی فطرت کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو ثقافت، کلچر اور آرٹ کا تقاضا یہ نہیں بنتا کہ اسے مصنوعی مرد بنا کر اس میں مردانہ خصوصیات ابھاری جائیں بلکہ یہ بنتا ہے کہ اس کی نسوانی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ان سے تمدن کے لئے مفید خدمت لی جائے۔ "آزادیٔ نسواں" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خواتین کو ان کی فطری ذمہ داریوں سے آزاد کر کے انہیں بیرونِ در کر دیا جائے اور ان پر مردانہ فرائض و واجبات کا بوجھ لاد دیا جائے بلکہ اس کا حقیقی مطلب

یہ ہے کہ معاشرے میں اسے بیٹی، بہن، بیوی اور ماں ہونے کی حیثیت سے اُسے ان کاموں کی آزادی ہو جو اس کی نسوانی فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ خواتین کے لئے "معیارِ عزت" یہ نہیں ہے کہ وہ بتکلف مردِ مؤنث بن کر وہ کام کریں جن کی انجام دہی صرف مرد ہی کر سکتے ہیں بلکہ ان کے لئے معیارِ شرف و کرامت یہ ہے کہ وہ عورت کے فطری مقام پر برقرار رہتے ہوئے اپنے فطری وظائف کی بجا آوری کریں۔ ترقی اس چیز کا نام نہیں ہے کہ ملکی پیداوار بڑھانے کی خاطر عورتوں کو کارخانوں اور کھیتوں میں دھکیل کر پیداواری ہاتھوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا نام ہے کہ عورتیں گھروں میں وقار سے رہتی ہوئی ان کارکنوں کو جنم دیں جن کی قوتِ بازو منجمد مشینوں میں حرکت اور ویران ریگستانوں میں سرسبزی و شادابی پیدا کرتی ہے۔ نسوانی اوصاف کے نشوو ارتقاء کا میدان رقص گاہیں، تھیٹر، کلچرل شو، فلمی صنعتیں اور مردانہ کارگاہیں نہیں ہیں بلکہ حصارِ خانہ کی وہ فضا ہے جس میں وہ اپنے بچوں کو صحیح تربیت دے کر ملک و ملت کا جاں نثار خادم بنائیں۔

الغرض عورتوں کو فطرت نے جن خصوصیات سے نوازا ہے اور جو وظائف و واجبات ان کے سپرد کئے ہیں ان کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ ان کا دائرۂ عمل مردوں کے میدانِ عمل سے الگ ہو اور یہ دائرۂ عمل حدودِ خانہ پر مشتمل ہے جیسا کہ محترم عثمانی صاحب کے درج ذیل اقتباس سے واضح ہے۔

> "مردوں کا دائرۂ عمل گھر سے باہر ہے اور عورتوں کا دائرۂ عمل گھر کے اندر ہے۔ عورتوں کو اولاد پیدا کرنا۔ انہیں پالنا پوسنا، پروان چڑھانا اور امورِ خانہ داری سے نمٹنا ہوتا ہے مردوں کو اکتساب رزق کے لئے جدوجہد کرنا، گھر کی اور خاندان کی حفاظت کرنا، ضرورت پڑے تو ملک اور قوم کی حفاظت کرنا اور مسلح جدوجہد میں حصہ لینا ہوتا ہے، چونکہ مردوں اور عورتوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے۔ اس لئے دونوں کی صلاحیتوں میں بھی فرق ہے۔ مردوں کو قوت و صلابت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انہیں

جگر پاش محنت و مشقت سے سابقہ پڑتا ہے اور عورتوں کو نرمی، نزاکت، لچک، رحمدلی اور شفقت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش، نگہداشت اور ان کی تیمار داری کرنی پڑتی ہے اس لئے دونوں کے دائرۂ کار کے مطابق صلاحیتوں میں بھی قدرت نے فرق رکھا ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۵۲)

حقیقت یہ ہے کہ مدنیتِ صالحہ کا قیام و بقا، اسی اصل پر قائم ہے کہ مرد بیرونِ خانہ امور کی انجام دہی کا ذمہ دار ہے اور عورت درونِ خانہ امور کو سرانجام دے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی اس اصل سے انحراف کیا گیا اور عورت کو اس کے فطری میدانِ کار سے اکھاڑ کر مردوں کے دائرۂ عمل میں دھکیلا گیا تو تمدن، فساد کا نشانہ بن گیا اور بالآخر زوال و انحطاط کا شکار ہوا، ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وضاحت محترم عثمانی صاحب فرماتے ہیں۔

"عورت کا گھر کی چار دیواری کو چھوڑنا عموماً دو وجوہ سے زوال کا سبب بنتا ہے ایک تو یہ کہ زندگی کا بہت بڑا حصہ معطل ہو جاتا ہے اور اس کے بیشمار مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں کیونکہ ان مسائل کو عورت ہی کا ناخنِ تدبیر حل کر سکتا ہے لیکن عورت جب مردانہ مسائل میں حصہ لینے لگتی ہے تو اس کے گھریلو مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں عورت کو انہیں حل کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا، وہ بھی انسان ہے اس کی صلاحیتیں لامحدود نہیں ہیں کہ وہ اپنے فرائض بخیر و خوبی ادا کرنے کے بعد بھی اس قابل رہ جائے کہ وہ مردوں کے حصے کے فرائض بھی انجام دے، جب وہ بیرونِ خانہ مسائل کی طرف رجوع کرتی ہے تو اندرونِ خانہ کے مسائل سے اغماض برتنا ہی پڑتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں مردوں کے قوائے عملیہ میں اضمحلال پیدا ہو جانا فطری تقاضا ہے کیونکہ جب کسی کو اپنے مسائل میں سہارا دینے والی کوئی ہستی میسر آجاتی ہے تو اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ یہ سارا کام

مجھے ہی سرانجام دینا ہے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس میں میرے کام کو ٹالنے والا بھی کوئی ہے اور اس یقین کی وجہ سے اس کے قوائے عملیہ کا سست پڑ جانا لازمی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۶۳-۶۲)

عورت کے ترکِ خانہ کو ان وجوہات کی بناء پر سببِ زوال تمدن قرار دے کر اب محترم عثمانی صاحب قرآن کھول کر "تبلیغِ دین" فرماتے ہیں اور قارئین کو وعظ کی خوراک "فقہ القرآن" کے کیپسول میں یوں دیتے ہیں کہ

"عورت ہر میدان میں عملی حصہ لے سکتی ہے ایسا کوئی میدان نہیں ہے جس میں مرد عملی حصہ لے سکتے ہوں اور عورت کے لئے اس میں عملی حصہ لینا ممنوع ہو، شہادت، تعلیم و تربیت، عبادات، انفرادی و اجتماعی عبادات، عملی جدوجہد، عسکری جدوجہد سربراہی خانہ، مشاورت، تنقید و احتساب، ذمہ دارانہ مناصب سنبھالنا، قاضی اور جج بننا، امامت صغریٰ سیاسی جدوجہد، سربراہی مملکت وغیرہ ----" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۲۶)

لیکن اس کے ساتھ ہی اسی کتاب میں اپنے گہرے مطالعے اور تجربے کی بنیاد پر یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ

"ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تنزل کے دور عام طور پر وہی رہے ہیں جب عورت گھر کی چاردیواری کو چھوڑ کر باہر نکلی ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۲)

TRUEMASLAK @ INBOX . COM

## باب ۳

# عورت کے فرائض و واجبات

عورت کا دائرۂ عمل اس کے طبعی و فطری واجبات و وظائف کی رُو سے تصریحِ قرآن کی بناء پر، اور محترم عثمانی صاحب کی بے لاگ تحقیق کی روشنی میں گھر کی دنیا تک محدود ہے، سوال یہ ہے کہ گھر میں اس کے فرائض اور واجبات کی تفصیل کیا ہے جن کی بنا پر اسے بیرون خانہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ عورتوں کی خانگی ذمہ داریوں کے متعلق سورۂ نساء کی ایک آیت کا یہ حصہ بڑا جامع ہے۔

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۔۔۔پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کی عدم موجودگی میں اللہ کی حفاظت و نگرانی میں شوہروں کے حقوق کی محافظ ہیں۔

قرآن کریم یہاں نیک خواتین کی دو صفات کو پیش کر رہا ہے اولاً قنوت (اطاعت اور فرمانبرداری) ثانیاً حفاظت (دیکھ بھال اور نگہداشت)۔ شوہر یا تو گھر میں موجود ہوگا یا گھر میں موجود نہیں ہوگا۔ دونوں حالتوں میں سے ایک حالت لازماً ہوگی۔ شوہر کی موجودگی میں بیوی پر جو حقوقِ شوہر عائد ہوتے ہیں، ان کا سرعنوان ہے شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری جسے قانتات کے لفظ میں سمو دیا گیا ہے شوہر کی غَیبت و عدم موجودگی میں اس پر عائد حقوقِ شوہر کو "حفاظت" کے جامع لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ آیت میں بیوی کے یہی دونوں فرائض، جو شوہر کا حق ہیں، مذکور ہیں۔

## پہلا فرض ـــــ اطاعتِ شوہر

قانتات کا معنیٰ و مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنے شوہروں کی مطیع فرماں ہوں۔ لیکن بیویوں کی یہ اطاعت و فرمانبرداری اسی طرح فرمانِ ایزدی کے تحت ہے جس طرح "حفاظت" کا فریضہ وہ حفاظت خداوندی (بما حفظ اللّٰہ) کے تحت ادا کرتی ہیں۔

گھر کا ادارہ جو معاشرے کی اولین اساسی اکائی ہے اور اپنے نظم کے اعتبار سے جس کی حیثیت ایک چھوٹی سی سلطنت کی ہے اس کا قیام و دوام اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اس مملکتِ خانہ میں ایک صاحبِ امر ہو اور دیگر افرادِ خانہ اس کی اطاعت کرنے والے ہوں۔ اگر دونوں میاں بیوی صاحب امر ہوں تو اس ادارے کا نظم درہم برہم ہو جائے اسلام نے صاحبِ امر ہونے کی یہ حیثیت مرد کو عطا کی ہے اور باقی افراد خانہ جن میں سب سے نمایاں شخصیت بیوی کی ہے، اس سلطنت کے "سربراہ" اور "کارفرما" کے پابندِ اطاعت ہیں۔ محترم عثمانی صاحب فرماتے ہیں۔

> "قرآن نے گھریلو نظم و نسق کو قائم رکھنے کے لئے شوہر کو قوام یعنی معاشی ذمہ دار اور گھر کا سربراہ (صدر) بنایا ہے نظم و نسق جب ہی قائم رہ سکتا ہے کہ سربراہ کی اطاعت کی جائے اس کی بات کو مانا جائے، حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب کہیں سفر کرو یعنی دو تین آدمی سفر کریں تو وہ بھی اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیا کریں زندگی کے سفر میں گھر وہ پہلا اجتماعی ادارہ ہے جس سے اجتماعیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ لہٰذا گھر کے افراد کو جن میں بیوی سرفہرست ہے اپنے امیر سربراہ کی جائز اطاعت و فرماں پذیری کرنی چاہیئے۔"
>
> (فقہ القرآن ج ۲ ص ۳۸۹)

بیوی شوہر کی اطاعت کیسے اور کیونکر کرے؟ ہر کام کے لئے ہر وقت شوہر سے اجازت طلب کرتے ہوئے اس کی اطاعت میں کام کرے اور وہ کوئی کام بھی بغیر اذن انجام نہ دے؟ ـــــ یا ـــــ شوہر بیوی کو چند واضح ہدایات دے کر اطاعت و عدم اطاعت کی حدود سمجھا دے اور بیوی ان حدود میں محدود رہ کر اس کی اطاعت و اتباع

کرے؟ اس کی عملی صورت کو تراضیٔ زوجین پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ قرآن صرف اطاعت و اتباع کا ذکر، فریضۂ بیوی اور حقِ شوہر کی حیثیت سے کرتا ہے اور بس۔ اس کی تعمیل کی عملی صورت مختلف حالات میں جو بھی اختیار کی جائے قرآن اس سے تعرض نہیں کرتا۔

### دوسرا فرض ـــــــ حفاظت

اطاعتِ شوہر کے بعد بیوی کا دوسرا فریضہ "حفاظت" ہے جو کئی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔

۱۔ شوہر سے متعلقہ امور کی حفاظت و نگہداشت ۲۔ گھر اور اشیائے خانہ کی حفاظت اور دیکھ بھال ۳۔ بچوں کی حفاظت، پرورش اور تربیت ۴۔ تہذیبی روایات کی حفاظت اور اشاعت۔

ان میں سے ہر چیز اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس بات کی متقاضی ہے کہ اس پر تفصیل سے بحث کی جائے، اس لئے ہم حفاظت کے ان چاروں پہلوؤں پر الگ الگ فصل میں اظہارِ خیال کریں گے۔

## پہلی فصل۔ شوہر سے متعلقہ اشیاء و امور کی حفاظت

شوہر سے متعلقہ اشیاء و امور میں سے سب سے اہم چیز اس کے نسب اور نطفے کی حفاظت ہے۔

### ۱۔ نسبِ شوہر کی حفاظت

اسلام کی نگاہ میں انسان کے حسب و نسب کی بڑی اہمیت ہے وہ یہ قطعاً پسند نہیں کرتا کہ لوگوں کے انساب، التباس و ارتیاب کا شکار ہو جائیں۔ اور پھر لوگوں کے حقوق کی تقسیم میں الجھنیں پیدا ہو جائیں۔ صحتِ انساب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اس کے لئے ایک پورا نظام مرتب کیا ہے۔ جو عفت و عصمت اور نسبی شرافت و نجابت کو معیار قرار دیتا ہے۔ اس نظام کی رو سے ہر وہ حرکت جو کسی درجے میں بھی عفت و عصمت اور تحفظ نسب کے منافی ہو، ایک جرم

قرار پاتا ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں بھی عفت و عصمت کی جو کچھ بھی اہمیت تھی وہ تحفظ انساب کے پیشِ نظر تھی آپ مردوں اور عورتوں میں سے جن امور پر بیعت لیتے تھے۔ ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ "وہ زنا نہیں کریں گے۔" اجتناب زنا پر بیعت کس لئے؟ محض اس لئے کہ انساب خلط ملط ہو کر نہ رہ جائیں، قرآن کے نزدیک زنا اور شرک متقارب الشناعۃ ہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے زنا کی شناعت و قباحت شرک سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ کفر اور شرک بہرحال ایک ایسی اعتقادی بُرائی ہے جسے ہمیشہ برائی نہیں سمجھا گیا لیکن زنا کو ہمیشہ اور ہر جگہ مسلمہ اخلاقی برائی قرار دیا گیا۔ (یہ "شرف" صرف اس "مہذب دور" کو حاصل ہے کہ زنا اب ایک "تفریح" قرار پا گیا ہے)۔

قرآن، زنا اور شرک کو ہم پلہ اور ہم مرتبہ قرار دیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ

| | |
|---|---|
| اَلزَّانِیُ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۲۴) | زانی مرد نکاح نہ کرے مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ کے ساتھ نکاح نہ کرے مگر زانی یا مشرک اور یہ نکاح حرام کر دیا گیا ہے اہلِ ایمان پر۔ |

زنا، قذف اور لعان کے یہ ضابطے صرف اسی اساسی مقصد کے تحت شریعت نے قائم کئے ہیں کہ لوگوں کے نسب محفوظ رہیں۔

الغرض، شوہر کی غیبت میں بیوی کا سب سے بڑا فرض ہے کہ وہ اس کے حسب نسب کی حفاظت کرے جسے داغدار کرنا خاندانی نجابت و شرافت کو بٹہ لگانا ہے۔ عورت کی عصمت اور شوہر کے نسب کی حفاظت میں اصل اور بنیادی کردار بیوی ہی کا ہے اور بیوی کے اس کردار کی ادائیگی کے لئے خود اسلام اس کی ہمت افزائی کرتا ہے جبکہ وہ مرد و زن کے باہمی اختلاط کو ختم کرتے ہوئے دونوں کے حدود عمل کو الگ الگ کر ڈالتا ہے اور حجاب کو حدِ فاصل قرار دیتا ہے۔

میے!

بیوی کا اپنی عصمت و آبرو کے تحفظ کا اہتمام کرنا صرف اس لحاظ سے ہی ضروری نہیں ہے کہ اس میں شوہر کا نسب محفوظ رہتا ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ ازدواجی زندگی کی خوشگواریاں اسی کی بدولت قائم رہتی ہیں اگر شوہر کے دل میں اپنی بیوی کی ازدواجی وفاداری کے متعلق کوئی ادنیٰ سا شبہ بھی پیدا ہو جائے تو بیوی کی کوئی خدمت اطاعت اور بھلائی بھی اسے اپنی طرف مائل نہیں کر سکتی۔

## ۲۔ شوہر کے رازوں کی حفاظت

تحفظِ نسبِ شوہر کے بعد بیوی کی دوسری اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے میاں کے رازوں کی حفاظت کرے، خواہ یہ راز اس کی نجی زندگی سے متعلق ہوں یا کاروباری زندگی سے، اس کے اقارب سے متعلق ہوں یا اجانب سے، ملکی سطح کے ہوں یا بین الاقوامی سطح کے۔ ایک وفادار نیک اور صالح بیوی کا یہ فریضہ ہے کہ وہ شوہر کے رازوں کو محفوظ رکھے میاں بیوی کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا جوڑا نہیں ہے جس کے افراد باہم اس قدر قریب ہوں جتنے زوجین۔ قرآن نے دونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دے کر یوں متحد و متقارب قرار دیا ہے کہ وہ ـــــ تا کس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری ـــــ کا مصداق بن جاتے ہیں۔ ان کا یہ اتصال و تقارب باہمی ان کے سینوں میں مخفی رازوں کو بھی ایک دوسرے پر بے نقاب کر دیتا ہے جس کی حفاظت اگرچہ دونوں پر لازم ہے لیکن چونکہ عورت فطرتاً جذباتی ہوتی ہے اسے جذباتیت کی رَو میں بہا کر اس سے بآسانی راز اگلوائے جا سکتے ہیں اس لئے اسے اس معاملے میں بہت ہی محتاط ہونا چاہیئے، وہ جاسوسی نظام جس کے جال بڑی طاقتوں نے اپنے مفادات کے تحت ہر چھوٹی بڑی مملکت میں پھیلا دیئے ہیں اس کی کامیابی ان خواتین کی بدولت ہوتی ہے جو مملکت کے بڑے بڑے عہدے داروں، حاکموں اور سول یا فوجی افسروں کی بیویاں ہونے کے باعث، مملکت کے حساس نوعیت کے رازوں کو بھی اپنے شوہروں کے توسط سے جانتی ہیں اور پھر انہیں افشا کر دیتی ہیں۔ ان میں سے بعض خواتین تو اس نظام کی باقاعدہ تنخواہ دار (PAID) ہوتی ہیں بہرحال بیوی خواہ عام شہری کی ہو یا کسی بڑے صاحبِ

منصب شخص کی، ہر سطح پر اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی حفاظت کرے تاکہ کوئی بدخواہ نقصان نہ پہنچا سکے۔

### ۳۔ عیوبِ شوہر کی پردہ پوشی

میاں بیوی کے باہمی قُرب و اتصال کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد دونوں کے سیرت و کردار کے کمزور پہلو ایک دوسرے پر بے نقاب ہونے لگتے ہیں۔ میاں بیوی میں سے اگرچہ ہر ایک پر ایک دوسرے کی ستر پوشی لازم ہے لیکن ہم موضوع کی مناسبت سے صرف بیوی کی ذمہ داریوں تک اپنی گذارشات کو محدود کر رہے ہیں۔

قرآن میاں بیوی کے باہمی ربط و تعلق کو نہایت ہی بلیغ پیرائے میں بیان کرتا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۖ تمہاری بیویاں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

لباس وہ چیز ہے جو جسمانی نقائص اور بدنی عیوب کو ڈھانپ لیتا ہے۔ پس میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی کوتاہیوں اور خامیوں کو ڈھانپنے والے ہیں۔

عورت کی سرشت میں جذباتیت کا عنصر غالب ہے جس کے باعث وہ شوہر سے معمولی تکرار پر بھی بعض اوقات اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں کر سکتی۔ غصہ یا جھنجھلاہٹ میں آپے سے باہر ہو جاتی ہے ایسی صورت میں اس کی زبان پر شوہر کے خلاف گلے شکوے اور ناسپاسی کے الفاظ آجاتے ہیں۔ جاہل عورتیں، شوہر کی (واقعی یا غیر واقعی) خطاؤں کا تذکرہ بیرونِ خانہ بھی کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ چیز اگرچہ مردوں میں بھی پائی جاتی ہے مگر عورتوں میں ایسی باتوں کا صدور ان کی جذباتیت کے تحت زیادہ ہوتا ہے اس لئے انہیں مردوں سے کہیں زیادہ اپنی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تاہم ستر عیوب شوہر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میاں کی کمزوریوں اور خامیوں کو پردہ پوشی کی آڑ میں برقرار رہنے یا نشوونما پانے دیا جائے، بیوی کو بڑی حکمت اور دانائی کے ساتھ خیر خواہی اور خلوص کے ساتھ، ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ، اچھے الفاظ اور دلآویز لب و لہجے کے ساتھ ان عیوب و نقائص

کے ازالے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے صبر وحکمت سے پیہم جدوجہد اپنا رنگ لا کر رہے گی۔

## ۴۔شوہر کے دیگر حقوق کی حفاظت

مندرجہ بالا حقوق کے علاوہ چھوٹے بڑے اور بھی ایسے حقوق ہیں جنہیں اگر بیوی خوشدلی سے پورا کرے، تو گھر کی فضا رشکِ جنت بن جائے۔ ان حقوق و فرائض کا تعلق زندگی کے بڑے بڑے اصولوں اور اعتقادی نظریات سے نہیں ہے بلکہ عادات وخصائل کی نہایت چھوٹی چھوٹی جزئیات سے ہے۔ مگر ان جزئیات کو محض اس لئے اہمیت نہیں دی جاتی کہ یہ معمولی چیزیں ہیں۔ یقیناً زندگی کی عمارت کی بنیاد تو بڑے بڑے افکار اور اعتقادی اصولوں پر ہی قائم ہے لیکن اس بنیاد پہ بالائی عمارت ان اینٹوں سے بنتی ہے جو روزمرہ عادات و اطوار کی جزئیات سے متشکل ہوتی ہیں، جس طرح بادی النظر میں بلند و بالا عمارت کا پورا قد کاٹھ نگاہوں میں آجاتا ہے اور اس کی بنیادیں نظروں سے اوجھل رہتی ہیں بالکل اسی طرح عادات وخصائل کی ان حقیر جزئیات سے جو سیرت و کردار تیار ہوتا ہے اسے انسان محسوس کر لیتا ہے لیکن جو اصول اس سیرت و کردار کی تہہ میں ذہنی بنیاد کا کام دیتے ہیں، وہ نگاہوں سے مخفی ہی رہتے ہیں۔ ذرا اس اصول پرست دیانتدار، کھرے اور بے لاگ شخص کو دیکھیئے جو حق گوئی اور نصرتِ حق میں کسی لومۃ لائم کی پروا نہیں کرتا لیکن اس حقیقت کے باوجود، اس کے عادات و اطوار میں ایک "دیانتدارانہ" پندار اور تبختر پیدا ہو گیا ہے جس کے باعث ترشروئی، بدخلقی اور سخت گوئی اس کا مزاج بن چکے ہیں۔ جن لوگوں کو اس سے سابقہ پیش آتا ہے، ان کے لئے اس کا یہ اندازِ تکلم جس قدر موجبِ زحمت اور باعثِ اذیت ہوتا ہے، اس کی اصول پرستی اور دیانتداری اس قدر وجہ رحمت اور سببِ راحت ثابت نہیں ہوتی۔ انسان کو متاثر کرنے والی چیز اس کے وہ افکار و نظریات نہیں ہوتے جو قلب و ذہن کے گوشوں میں پڑے ہوئے ہوں بلکہ اس کے وہ عادات وخصائل اور افعال و اعمال ہوتے ہیں جو عیاناً ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی میں اساسی افکار و اصول اور عادات و خصائل کا باہمی تعلق وہی ہے جو موٹر گاڑی میں پٹرول اور موبل آئل میں پایا جاتا ہے، پٹرول، گاڑی کو حرکت میں آنے کی قوت عطا کرتا ہے تو موبل آئل گاڑی کے پُرزوں کو باہمی رگڑ سے بچاتا ہے، اصول و افکار اگر زندگی کی گاڑی کو حرکت میں لاتے ہیں تو ناخوشگوار عادات و اطوار کی منفی جزئیات اس گاڑی کے پُرزوں میں وہ رگڑ پیدا کرتی ہیں جو معاشرتی روابط کے نرم و نازک رشتوں کو جلا دیتی ہے، اگر ازدواجی زندگی میں عادات و خصائل کی ان معمولی باتوں کا خیال رکھا جائے تو زندگی مسرتوں کا گہوارہ بن جائے۔

ذرا سوچیئے! جب شوہر، بیرونِ خانہ امور کی انجام دہی میں تھک ہار کر گھر آئے تو بیوی کی طرف سے متبسم چہرے کی استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ محبت بھری گفتگو، میاں کی کتنی کلفتوں کو ختم اور کتنے غموں کو دُور کر دیتی ہے، کسی ایک فریق کی خطاء اور غلطی پر دوسرے فریق کا جھنجھلائے بغیر مسکراہٹ سے ٹال دینا گھر کو کتنے جہنمی شعلوں کی لپیٹ سے بچا لیتا ہے، باہمی چپقلش اور ناراضگی کے بعد، دلآویز گفتگو کے ساتھ مہرِ سکوت کو توڑنے میں اولیت اختیار کرنا، قلبی کدورت کے ازالے کا کیسا مؤثر ذریعہ ہوتا ہے۔ حالتِ غیظ و غضب میں، تند و تلخ گفتگو کا جواب، دھیمے اور شیریں لب و لہجے میں دینا غصے کی بھڑکتی آگ پر کس قدر پانی ڈال دیتا ہے ـــــ لیکن اس کے برعکس ـــــ اگر بیوی، شوہر کی فرضی نہ سہی، واقعی غلطی پر طنز و طعن پر اتر آئے تو یہ رویہ میاں کو کس قدر بیوی سے دور کر دیتا ہے، کسی اختلافی مسئلے پر، بیگم اگر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کی بجائے، منہ بسور کر دوسرے کمرے میں چلی جائے تو باہمی اختلاف کی خلیج کس قدر وسیع ہو جاتی ہے، محض ضد میں آ کر فریقِ ثانی کے سامنے اپنی لغزش کا اعتراف نہ کرنا اور اپنی رائے پر اڑے رہنا، سکونِ خانہ کے لئے کس قدر غارتگر ثابت ہوتا ہے۔ ازدواجی شکر رنجی کی صورت میں پیدا ہونے والی تلخیوں کو ازدواجی دائرے تک محدود نہ رکھنا اور بیرونِ خانہ افراد کے کانوں میں، شوہر یا بیوی کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو اگل دینا دلوں کے نفرت کے الاؤ میں کس قدر ایندھن ڈال دے گا۔ اپنے ازدواجی مسائل کو (جو گھر کے مسائل

ہیں اور گھر ہی میں حل ہو سکتے ہیں)' ایکدوسرے پہ عدم اعتماد کی بدولت، دوسروں کے سامنے رکھنا، کس قدر فضیحت اور رسوائی کا باعث ہوگا۔ یہ ساری باتیں اگرچہ معمولی نوعیت کی ہیں لیکن ان کو ملحوظ نہ رکھنے کے باعث ازدواجی زندگی، گیلی لکڑیوں کی طرح سلگنے لگتی ہے اور زوجین، جسمانی قرب و اتصال کے باوجود ذہنی دُوری اور دماغی بُعد کا شکار رہتے ہیں۔

## دوسری فصل۔ گھر اور اشیائے خانہ کی حفاظت

مرد، اگر "سربراہِ خانہ" ہے، تو بیوی، اس سربراہ کی مُعین و نائب ہے۔

### ۱۔ اثاث البیت کی حفاظت

شوہر کے ذمّے چونکہ بیرونِ خانہ امور کی انجام دہی کا فریضہ ہے، اس لئے گھریلو ذمّے داریاں، بیوی ہی پر عائد ہوتی ہیں ان میں سے اولین ذمّے داری، گھر اور اشیائے خانہ کی حفاظت و دیکھ بھال ہے، یہی گھر جو عورت کو اس کے فطری وظائف کی بجا آوری کے لئے گوشۂ عافیت اور جائے سکون مہیا کر کے حقِ حیات کی حفاظت کرتا ہے، اس پر یہ ذمّے داری بھی عائد کرتا ہے کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے گھر اور اس کی ہر چیز اس کے شوہر کی طرف سے ایک امانت کی حیثیت رکھتی ہے جس کی کما حقہ حفاظت اس کے واجبات میں شامل ہے۔

### ۲۔ گھر کی صفائی ستھرائی

گھر اور اشیائے خانہ کی حفاظت و نگہداشت کے بعد اگلی ذمّے داری، جو خاتونِ خانہ پر عائد ہوتی ہے وہ صفائی و نظافت کی ذمّے داری ہے۔ گھر کی ہر چیز کو پاکیزہ اور صاف ستھرا رکھا جائے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے گھروں میں نظافت کا وہ معیار قائم نہیں ہے، جو ذوقِ سلیم سے میل کھاتا ہے، فرش، صحن، دالان اور کمرے گرد و غبار سے اٹے ہوئے نہ ہوں باورچی خانہ اور اس کا سامان صاف ستھرا ہو، دیواریں اور چھتیں

جالوں سے پاک ہوں، گھر کی نظافت اور پاکیزگی عورت کی وہ ذمے داری ہے جو روزمرہ خانگی پروگرام سے تعلق رکھتی ہے، اگر ایک دن کے لیئے صفائی ستھرائی سے صرفِ نظر کرلیا جائے تو گھر ڈربے میں بدل جائے، یہ ذمّے داری، ایک گھر گرہستن خاتون کی ہمہ وقتی توجہ کی طالب ہے۔

## ۳۔ گھر کی تزیین و آرائش

اشیائے خانہ کی حفاظت و نظافت کے بعد ان کو قرینے اور سلیقے سے آراستہ کرنا بھی گھریلو عورت کے فرائض میں داخل ہے۔ اس طرف سے معمولی سی غفلت بھی گھر کو کباڑیئے کی دکان میں تبدیل کر دیتی ہے، آرائشِ خانہ دراصل ایک فن ہے جس کا ذوق کم و بیش ہر مرد کو بالعموم اور ہر عورت کو بالخصوص ودیعت ہوتا ہے۔ گھر کو سلیقہ مندی سے آراستہ کرنا صرف اس لیئے ہی اہمیت نہیں رکھتا کہ تزیینِ خانہ بجائے خود بھی ایک اچھی عادت ہے بلکہ اس کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ تربیتِ اولاد کے لیئے خاتونِ خانہ کی بڑی اہم ذمہ داری ہے۔ ترتیب و سجاوٹ اور آرائش و زیبائشِ خانہ کا یہ تقاضا ہے کہ گھر کا ہر گوشہ عورت کی سلیقہ مندی کا مظہر قرار پائے، عام طور پہ دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص کسی کمرے میں داخل ہوا تو اس نے اگرچہ کمرے کی ہر چیز کو آراستہ و پیراستہ پایا، لیکن جونہی کسی چیز کی تلاش میں الماری کا پٹ کھولا، بے ترتیبی سے لگی ہوئی چیزوں کا ڈھیر فرش پہ آرہا۔ یعنی اشیاء کی بے ترتیبی کو کمرے سے منتقل کر کے الماری کے پیٹ میں چھپا دیا گیا تھا جو اب ظاہر ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ نظم و ترتیب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک مرئی و مشاہد جگہ کا بکھرا ہوا سامان اٹھا کر کسی دوسری جگہ جو نگاہوں سے اوجھل ہو ڈھیر کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر گوشۂ بیت، بے نظمی اور بے ترتیبی سے پاک ہو جائے اور ہر چیز اپنے اصل اور صحیح مقام پہ موجود ہو، ڈرائنگ روم، خوابگاہ، مطبخ، سٹور، مطالعہ گاہ، طعام گاہ اور غسل خانے۔ الغرض ہر مقام سے متعلقہ سروسامان اپنے صحیح موقع و محل میں یوں موجود ہو کہ اندھیرے میں بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہاتھ سیدھا شئے مطلوب پہ پڑے۔ ظاہر ہے کہ گھر کی یہ آراستگی، روزمرہ اور ہمہ وقتی توجہ کی

محتاج ہے۔

## ۴۔ اسراف و تبذیر سے اجتناب

آج مسلم گھرانوں کی دولت کا بیشتر حصہ اسراف و تبذیر میں اڑ جاتا ہے دنیا اور اس کی زینت کی طالب خواتین کا یہ رویہ ہوتا ہے کہ وہ مادی اشیاء کے حصول کے لئے اپنی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلا لیتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہاں تک دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک گھر کو ایک چیز کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس کی فراہمی صرف اس لئے واجب یا فرض کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ پڑوسیوں کے ہاں وہ آچکی ہے۔ ٹی، وی، فرج، ایئر کنڈیشنر، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر اور ٹیلیفون، آج ہر گھر کی "ضرورت" صرف اس لئے بن گئے ہیں کہ ان کے ہمسائیوں اور دیگر میل جول کے افراد کے ہاں یہ چیزیں گھروں میں موجود ہیں۔ کیونکہ مادّی دَوڑ میں کوئی شخص دوسروں سے پیچھے رہنا گوارا نہیں کر سکتا خواہ وہ ان چیزوں کی حقیقی ضرورت محسوس کرتا ہو یا نہ کرتا ہو یہ سب کچھ اسراف و تبذیر کی زد میں آتا ہے جس سے خواتینِ خانہ کو احتراز و اجتناب لازم ہے۔ بے جا اور فضول اخراجات گھروں کی پُرسکون، پُرامن اور خوشگوار زندگی کے لیے سمِ قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ خصلتِ بد، معاشی مسائل پیدا کرتی ہے جو جو زندگی کے شجرِ بہار پر آکاش بیل بن کر پھیل جاتے ہیں اور اسی کا جیون رس چُوس لیتے ہیں۔ ایک مسلمان خاتون کا یہ ایک اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں اسراف و تبذیر کے جرثوموں کو پیدا نہ ہونے دے ورنہ یہ جراثیم اس کی اولاد کے اخلاق و کردار پر بھی حملہ آور ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عادتِ بد کو ختم کرنے کے لئے خواتین بڑا مؤثر جہاد کر سکتی ہیں اگر وہ اپنے بھائیوں، باپوں اور شوہروں کو صاف صاف کہہ دیں کہ وہ حلال کمائی میں دال روٹی کھا کر ہی گذارا کریں گی، وہ حرام کمائی سے فراہم ہونے والی مرغن غذاؤں کو اپنے دین و اخلاق کے لئے زہر سمجھتی ہیں۔ نیز یہ کہ رشوت، دھوکہ اور فریب دہی سے حاصل کردہ آمدنی سے اپنے ڈرائنگ روموں کو سجانے کی بجائے حلال و جائز آمدنی میں کفایت شعاری سے زندگی بسر کریں گی۔ تو دیکھتے ہی دیکھتے گھروں کی بہت سی

الجھنیں جو معاشی بدحالی کی پیدا وار ہیں۔ خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

یہ ہیں ایک مسلم خاتون کی گھریلو ذمہ داریاں! جنہیں اگر پوری توجہ اور مستعدی کے ساتھ انجام دیا جائے تو ہماری خانگی زندگی فرحاں و شاداں ہو جائے، گھر جنت بکنار ہو جائیں۔ سکون امن اور اطمینان کی بہار لوٹ آئے کہ درنگاہِ قرآن گھروں کی اصل حیثیت یہی ہے ھُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا۔ حقیقت یہ ہے کہ گھروں کا رشکِ فردوس بننا، خواتینِ خانہ ہی کا مرہونِ منت ہے۔ جنہیں مولانا الطاف حسین حالی مرحوم یہ کہہ کر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں ؎

تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غم گیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دیں کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے

# تیسری فصل[1]۔ بچوں کی حفاظت، تربیت اور پرورش

گھر کی حیثیت، اولاد کے لئے ایک تربیتی ادارے کی ہے جس کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ حفاظتِ اولاد، تربیتِ اطفال اور پرورشِ ذریت کا خاطر خواہ انتظام کرے۔ قرآن پاک اس ضمن میں صاف کہتا ہے کہ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (۶۶/۶)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

---

[1] میں نے اس فصل کے مواد کی ترتیب میں ابن فرید کی کتاب "بچے کی تربیت" سے استفادہ کیا ہے۔

یہ آیت اربابِ بیوت اور اہلِ خانہ سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو جہنم سے بچانے کی فکر نہ کریں بلکہ اپنی اولاد کو بھی اس سے محفوظ رکھنے کی سعی و کاوش کریں۔ نیز یہ آیت اس بات کو بھی واضح کرتی ہے کہ والدین کی اصل فکر، اپنی اولاد کی دنیا سازی سے نہیں بلکہ تعمیرِ آخرت سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ قرآن کے نزدیک اصل فوز و فلاح اسی میں ہے کہ انسان عذابِ جہنم سے بچ جائے۔ فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ یہ اُخروی فوز و سعادت، بہرحال، اس پروگرام اصلاح سے ہی ممکن ہے جو گھر کے اس اولین ادارے میں قائم ہو جس کا سربراہ شوہر ہو اور جس کا نظم و نسق، شوہر کی اطاعت میں بیوی کے ہاتھ میں ہو۔ اولاد کی نگہداشت اور تربیت کا عظیم فریضہ زیادہ تر والدہ پر عائد ہوتا ہے کیونکہ بچے اپنی ابتدائی عمر میں اسی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور وہی اپنی اس وابستگی، مصاحبت اور ملازمت کے باعث بچوں پر اپنی تربیت کے ابتدائی نقوش مرتسم کرتی ہے۔ بلکہ یہی ابتدائی نقوش وہ بنیاد ہوتے ہیں جن پر اس کی سیرت کی عمارت بعد میں تعمیر ہوتی ہے۔ جیسا کہ دورِ جدید میں علم تجزیۂ نفس کے ماہرین کی یہ تحقیق ہے کہ بچے کو اپنی مستقبل کی زندگی میں جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ بنیادی طور پر اپنی عمر کے اولین دو تین سال میں بن چکتا ہے بلکہ ڈاکٹر جنگ (JUNG) تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ بچے کی سیرت و کردار کی بنیادیں اس عمر میں استوار ہو جاتی ہیں جب وہ ابھی بولنا بھی نہیں سیکھ پاتا۔ اس عمر میں وہ دھیرے دھیرے خاموشی سے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اس ماحول کو اپنے اندر سمو لیتا ہے جس میں وہ نشو و نما پاتا ہے اس کے بعد اس کی عمارتِ حیات انہی بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ بچے کی شخصیت کی بنیادیں اس وقت اُستوار ہونا شروع ہو جاتی ہیں جب وہ ہنوز شکم مادر میں نشو و نما پا رہا ہوتا ہے۔ ماں کے اس دور کے خیالات، سوچ کے دھارے فکر کے زاویئے اور قلب کی نیتیں اور ارادے بچے پر مستقل اثرات مرتب کرتے ہیں۔ خواہ یہ ارادے، افکار اور تخیلات پاکیزہ اور صالح ہوں یا گھناؤنے اور گندے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ علم تجزیۂ نفس کے ماہرین علمائے نفسیات اور شعبۂ طب سے

تعلق رکھنے والے اہلِ علم زمانۂ حمل میں عورت کو خوش و خرم، نظیف و صاف ستھرا رہنے دماغی پریشانیوں اور ذہنی الجھنوں سے مبرا ہو کر اچھا اور پاکیزہ لٹریچر پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ بطنِ مادر میں پلنے والے بچے پر اچھے اثرات و نقوش مرتسم ہوں[1]۔ خود قرآن کریم اُس ماں کے تربیتی کردار کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے جو اپنے پیٹ میں پلنے والی زندگی کو دینِ اسلام کے لئے وقف کر دینے کی حسین آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ پالتی ہے۔ اس کے نتیجے میں جو بچی پیدا ہوئی اُسے اللہ تعالیٰ نے "اصطفاء علےٰ نساء العالمین" کے مقام پر سرفراز فرمایا۔

الغرض، بچے کی اوائل عمری میں، اس کی سیرت و کردار کی بنیادیں، استوار کرنے میں ماں کا بہت بڑا رول ہے۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کی حفاظت و نگہداشت تعلیم و تربیت اور پرورش و نمو کے لئے مرد کی بجائے عورت کو ذمے دار قرار دیا ہے۔

> "حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے، حکمران بھی راعی ہے اور وہ اپنی رعیت کے معاملہ میں مسؤل ہے مرد اپنے اہلِ خانہ پر راعی ہے اور وہ انہی کے متعلق جوابدہ ہے، بیوی اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے، وہ انہی کے بارے میں جواب دہ ہے"۔ (متفق علیہ)

## گھر۔ اولین تربیت گاہِ اطفال

گھر اگرچہ جملہ اہلِ خانہ کے لئے اقامت گاہ اور جائے سکونت ہے مگر بچوں کے لئے پہلی

---

[1] اسلام، زنا کو کیوں گناہ اور جرم قرار دیتا ہے؟ اس کی بہت سی وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایسے بچہ کا نطفہ ہی اس حالت میں قرار پاتا ہے جب ماں اور باپ دونوں پر خالص حیوانی جذبات کا تسلط ہوتا ہے ایک شادی شدہ جوڑے میں صنفی عمل کے وقت جو صالح اور پاکیزہ انسانی جذبات ہوتے ہیں وہ ناجائز تعلق رکھنے والے جوڑے کو کبھی میسر آ ہی نہیں سکتے ان کو تو مجرد بہیمیت کا جوش ایک دوسرے سے ملاتا ہے، اس وقت تمام انسانی خصوصیات ان سے منفک ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایک حرامی بچہ طبعًا اپنے والدین کی حیوانیت اور بہیمیت ہی کا وارث ہوتا ہے۔ ایسے بچے کے والدین جس خود غرضانہ ذہنیت کے ساتھ محض اپنے انفرادی لطف و لذت کے لئے جسمانی اتصال میں گتھ جاتے ہیں۔ وہ ذہنیت بھی پیٹ میں پلنے والے بچے پر کم و بیش اپنا اثر ڈالتی ہے۔

اور ابتدائی تربیت گاہ ہے جس میں ماں کی حیثیت ایک مُربیّہ و مُعلّمہ کی ہے۔ اس کا اولین فرض یہ ہے کہ اس تربیت گاہ میں ایسا ماحول پیدا کرے جو بچے میں خصائلِ حسنہ پیدا کرنے کے لئے محرک بن جائے۔ گھر وہ جگہ ہے جہاں بچے کے ذہن پر اخلاق، تعلیم و تربیت اور صالح اطوار و عادات کے مشاہدات کے اولین نقوش ثبت ہوتے ہیں اس لئے گھریلو فضاء میں کوئی ایسی چیز نہیں ہونی چاہیئے جو اذہانِ اطفال میں غلط نقوش کے ثبت ہونے کا سبب بن جائے، گھر میں ایسا صاف ستھرا تربیتی اور تعلیمی ماحول پیدا کرنا کوئی کھیل نہیں ہے جو ہنسی خوشی، سرسری کوشش سے پیدا ہو جائے۔ بلکہ یہ ایسا مشقت طلب، جانگسل اور جگر سوز کام ہے جس کے لئے ماں کو ہمہ وقت چوکس اور محتاط ہو کر سعی پیہم کرنا پڑتی ہے۔ پھر گھر میں ایسی فضاء کو پیدا کر کے اسے دائماً برقرار رکھنا اس سے زیادہ محنت طلب فریضہ ہے۔ علاوہ ازیں ماں کے علاوہ گھر کے تمام افراد بھی اپنے آپ کو ان اوصاف سے مُتّصف کریں جو اس تربیتی ادارے کے مزاج و مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔ بچہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو وہ گھر میں ہر چیز کو کڑی نگاہ سے دیکھتا ہے چونکہ اس کی قوت امتیاز اور قوتِ فیصلہ، قوتِ باصرہ و سامعہ کے مقابلے میں قدرے تاخیر سے نشو و نما پاتی ہیں اس لئے اسے جو کچھ نظر آتا ہے وہ اسے ہی صحیح سمجھنے لگ جاتا ہے۔ لہٰذا ماں کا یہ فرض ہے کہ وہ کوشش کرے کہ بچے کو ابتداء ہی سے اچھی چیزوں کا مشاہدہ ہو۔ بُرے اعمال اور گندی حرکات اس کے مشاہدے میں آنے ہی نہ پائیں۔ چونکہ عام افراد خانہ کی نسبت، ماں بچے کے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے اس لئے اس کے لئے تو یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات میں اچھا نمونہ پیش کرے، بچے کے ذہنی اور اخلاقی معیار میں رفعت پیدا کرنے کے لئے ماں، باپ، بہن، بھائیوں کے علاوہ نوکروں تک میں اسی معیار کی تبدیلی لانا ضروری ہے کیونکہ بچہ سب سے پہلے انہی افراد کو دیکھتا ہے اور ان ہی کے اعمال کو دیکھ کر سیکھتا ہے۔ اس لئے ماں کا یہ فرض ہے کہ وہ بچے کی صالح تربیت کے لئے دیگر افرادِ خانہ میں بھی وہ مثبت تبدیلیاں پیدا کرنے کی فکر کرے جو بچے کے صالح سیرت و کردار میں معاون ثابت ہوں، اس مقصد کے لئے

جن نوکروں کو سدھارا جاسکتا ہے انہیں سدھارا جائے ورنہ انہیں چھٹی دے کر دوسرے نوکر رکھ لئے جائیں۔

## بچے کی ذات کی طرف توجہ

گھر کو سنوارنے اور سدھارنے کا مقصد محض بچے کی اصلاح اور سیرت سازی ہے ماں کی توجہ کا اصل ہدف دراصل وہ بچہ ہے جس کی خاطر یہ خانگی اصلاح اختیار کی جاتی ہے گھریلو اصلاح کے بعد اب ماں کا یہ فرض ہے کہ بچے کی طرف کما حقہ توجہ دے، بچے کی ذات کے دو پہلو ایسے ہیں جن کی طرف ماں کو ابتدا ہی سے متوجہ ہونا چاہیئے۔

(ل) جسمانی صحت کی طرف توجہ (ب) ذہنی صحت کی طرف توجہ

بچے کی صحت کے یہ دونوں پہلو ماں کی توجہ کے ازحد محتاج ہیں ان میں سے اگر کسی پہلو میں کوتاہی رہ گئی تو بچہ عمر بھر کے لئے دوسروں کا دستِ نگر ہو کر رہ جائے گا۔ وقت نکل جانے کے بعد والدین لاکھ جتن کر ڈالیں اس کوتاہی کا ازالہ محال نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔

## جسمانی صحت کی طرف توجہ

بچے کی جسمانی صحت کی دیکھ بھال کا کام اس وقت شروع ہوتا ہے جب بطنِ مادر میں اس کے وجود کی بناء پڑ رہی ہوتی ہے۔ دورانِ حمل اگر بچے کی صحت کا خیال نہ رکھا جائے تو ولادت کے بعد وہ لاغر اور کمزور ہونے کے باعث ہمیشہ بیماریوں کے حملوں کی زد میں رہے گا۔ اس لئے اس دوران ماں کو اپنی خوراک میں ان اشیاء اور اجزائے غذا کو شامل کرنا چاہیئے جو بیک وقت اس کی اور اس کے پیٹ میں نشو و نما پانے والے بچے کی صحت کو برقرار رکھیں۔

بعد از ولادت جب تک بچہ دودھ پیتا رہتا ہے۔ اس وقت تک ماں کو بچے کی جسمانی صحت کا بطور خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ اس کی غذا اسے باقاعدہ اور منضبط وقفوں کے ساتھ دی جائے بعض خواتین جب بھی بچہ روتا ہے انہیں دودھ دے دیتی ہیں۔ اس طرح وقت بے وقت شیر خوری نومولود کے نظامِ ہضم میں فتور کا سبب بنتی ہے۔ بچے

کی عمر کا یہ حصہ بچے کی انتہائی ضعف و ناتوانی کا دور ہوتا ہے جس میں اپنی کسی تکلیف کا ازالہ تو درکنار، اظہار تک نہیں کر سکتا۔ اس صورت احوال میں ماں ہی کو توجہ کرنی پڑتی ہے۔ پیشاب پاخانے کی صورت میں اگر بچے کے جسم، لباس، بستر اور فرش کی بروقت صفائی نہ ہو تو غلاظت کا وجود اس کی صحت پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ دودھ کے علاوہ بھی بچے کو وقتاً فوقتاً ایسی غذا دیتے رہنا چاہیے جو مفید صحت ہونے کے علاوہ بچے کے لئے یا تو از خود مرغوب ہو یا اس کی رغبت اس میں پیدا کر دی گئی ہو۔

بچے کی جسمانی صحت کا انحصار دیگر امور کے علاوہ اس بات پر بھی ہے کہ اسے جسمانی محنت سے محروم نہ رکھا جائے۔ اس کی قوت کو جس قدر بھی استعمال کا موقع ملے گا اسی قدر اس میں صحتمندی ارتقاء پذیر ہو گی، لاڈ، پیار اور محبت میں بچے پر ہر وقت اپنا سایہ مسلط رکھنا اور اسے آزادانہ حرکت و عمل کا موقع فراہم نہ کرنا اس کی نشوونما میں خلل انداز ہو گا۔ ورزش صحتمندی کا زینہ ہے۔

بہرحال بچے کو مناسب غذا بروقت مہیا کرنا۔ اسے اور اس کے ماحول کو صاف ستھرا رکھنا، اس کی جسمانی قوتوں کے استعمال میں بروقت رہنمائی کرنا، ماں کا ایسا فریضہ ہے جو ہمہ وقتی توجہ کا طالب ہے۔

## ذہنی صحت کی طرف توجہ

جسمانی صحت کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ بچے کی ذہنی صحت کی طرف پوری توجہ دینا ماں کی اولین ذمہ داری میں شامل ہے۔ باشعور اور عقلمند مائیں مندرجہ ذیل باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں:۔

۱۔ بعض بچے فطری اور پیدائشی طور پر کسی ذہنی یا دماغی کوتاہی کا شکار ہوتے ہیں لیکن پیدائشی اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ گھر میں بچے کو اپنی عقل و دماغ کے استعمال کا موقع نہیں دیا جاتا یا اگر وہ اپنی عقل سے کام لے کر کوئی غلط حرکت کر بیٹھتا ہے تو اسے بری طرح ڈانٹ دیا جاتا ہے جس سے وہ اپنے قوائے عقلیہ کو بروئے کار لانے سے رک جاتا ہے۔ ایک اچھی اور عقلمند ماں کا یہ کام ہے کہ وہ بچے کو اپنی قویٰ استعمال

کرنے کا موقع بھی فراہم کرے، اس میں اس کی مدد اور رہنمائی بھی کرے، اور بچے کی حوصلہ افزائی بھی کرے۔ کوتاہی یا غلطی کی صورت میں بچے کو کبھی بھی "کم عقل" یا "بے وقوف" وغیرہ جیسے الفاظ سے نہ ڈانٹے۔ ورنہ اس کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ بلکہ حکمت کے ساتھ عقلی قوتوں کے استعمال میں بچے کی رہنمائی کرے، لیکن بچے میں کبھی بھی "احساسِ ناکامی" نہ پیدا ہونے دیں۔

۲۔ بچے سے ماں کو جو کام لینا مقصود ہو یا جس کام کی طرف اسے راغب کرنا مطلوب ہو، اس کے لئے اس میں پہلے آمادگی بلکہ اشتیاق پیدا کیا جائے، دلچسپی اور آمادگی پیدا کئے بغیر اگر بچے کو کسی کام میں جوت دیا جائے تو وہ اس سے متنفر ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر تعلیم کے لئے بھی بچے میں آمادگی و دلچسپی کو پیشگی پیدا نہ کیا گیا تو وہ اس سے بددل ہو جائے گا۔ تاہم بچے کو کام اور ذمہ داری کا احساس ضرورت سے زیادہ دلا کر بھی اس کے ننھے سے ذہن کو بوجھل نہیں کرنا چاہیئے۔ بچے کی ذہنی مصروفیت میں اس کی عمر کا بھی لحاظ رکھا جائے۔

۳۔ بچے جب اوٹ پٹانگ باتیں سوچنے پر اتر آئیں تو اس موقعہ پر ماؤں کو بڑی حکمت اور دانشمندی کے ساتھ ان کی مدد اور راہنمائی کرنی چاہیئے تاکہ بچہ سوچنے کا صحیح انداز بھی سیکھ سکے۔

الغرض بچے کی ذہنی صحت کی نگہداشت اس کے قوائے عقلیہ کے استعمال میں اس کی مدد اور راہنمائی، دورانِ راہنمائی اس کی حوصلہ شکنی سے مکمل احتراز اوٹ پٹانگ سوچ و بچار کے وقت صحیح اندازِ غور و فکر کی طرف بروقت اور مناسب راہنمائی یہ سب کچھ ماں کی ہمہ وقتی توجہ کا محتاج ہے۔ ہر وقت اور ہر درجۂ عمر میں بچے کی ذہنی صحت کو برقرار رکھنے بلکہ نکھارنے اور چمکانے کے لئے ماں کا بچے کی طرف ہر وقت متوجہ رہنا ایک فریضہ ہے جسے چوبیس گھنٹے کی مستعد نگ و دو سے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔

بچے کی شخصیت کی سو[illegible]:

بچوں کی صحیح تربیت کرنا ہی ان کی شخصیت کی تشکیل کرنا ہے۔ صحیح تربیت

کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بچے کی ذات میں ودیعت شدہ استعدادوں اور صلاحیتوں کو ٹھیک طور پر پروان چڑھایا جائے۔ اس سلسلے میں ہم مندرجہ ذیل پہلوؤں پر اختصار واجمال کے ساتھ کلام کریں گے جو بچے کی شخصیت کی صحیح نشوونما کے لئے اساس وبنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ جذباتی نشوونما ۲۔ حواس کی نشوونما ۳۔ بول چال کی نشوونما

۴۔ جنسی نشوونما ۵۔ معاشرتی نشوونما۔

۱۔ جذباتی نشوونما

بچہ تو خیر کیا ، ہر فرد بشر کی زندگی کا تانا بانا ، چند جذبات سے متشکل ہوتا ہے۔ مثلاً غصہ، خوف ، حیرت ، نفرت ، محبت ، رنج وغیرہ دنیا کے رنگارنگ انسانوں کا جداگانہ تشخص ، انہی جذبات کے اجزائے ترکیبی کے اختلاف پر مبنی ہے ، جذباتی نشوونما کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ان جذبات کو صحیح طریقے سے پروان چڑھایا جائے ، ورنہ یہ جذبات ــــــ (۱) بچے کے ذہنی توازن کو بگاڑ دیتے ہیں ــــــ (۲) جسمانی اختلال کا سبب بنتے ہیں ــــــ (۳) معمولی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں اور بھڑکنے کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی ــــــ (۴) دیر تک قائم رہنے کی صورت میں ، مستقل شکل اختیار کر کے موڈ میں تبدیل ہو جاتے ہیں ــــــ (۵) ہمہ گیر ہوتے ہیں جن سے بچے بڑوں کی نسبت زیادہ تیزی سے متاثر ہوتے ہیں ــــــ (۶) ایک ہی جذبہ اگر بار بار طاری ہو تو جذباتی عادت ڈالنے کا موجب ہو جاتا ہے ــــــ (۷) ان کا اثر متعدی ہوتا ہے یعنی ایک فرد پر جو جذبات طاری ہوتے ہیں دیکھنے والے پر بھی وہی جذبات طاری ہونے لگتے ہیں۔

جذباتی نشوونما کے لئے والدہ کو درج ذیل باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیئے :۔

۱۔ بچے کی تربیت میں اگر تسلسل وتوازن کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے تو بچے کے جذبات کی اٹھان افراط وتفریط کا شکار ہو جاتی ہے اس لئے ایک دانا اور عقلمند ماں بچے کی جذباتی نشوونما میں توازن اور تسلسل کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی بچے عموماً حسنِ سلوک

اور محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ ماں کو بچے کے ساتھ انتہائی شفیق، حلیم اور محبت آمیز ہونا چاہیئے۔ اگر کہیں بچے کو سزا دینے کی نوبت بھی آجائے تو جلد ہی حسنِ سلوک سے اس کی تلافی بھی کر ڈالنی چاہیئے۔ تاکہ سزا کے نتیجے میں بچے کے منفی جذبات میں جو ہیجان پیدا ہو چکا ہے اسے کالعدم کیا جا سکے۔

۲۔ سزا دینے کے فوراً بعد ماں کو، بچے کو ہدایات دینے سے گریز کرنا چاہیئے، کیونکہ جذبات کی شدّت میں یہ ہدایات بچے پر کوئی مثبت اثر نہ ڈال سکیں گی، اور یہ ممکن ہے بچہ ضد میں آکر ان ہدایات سے نفور ہوتے ہوئے اپنی غلط روش پر اور جم جائے۔

۳۔ ماں کا یہ فرض ہے کہ وہ بچے کو دیگر بہن بھائیوں اور ہمجولیوں سے حسنِ سلوک اور شفقت و محبت کا برتاؤ کرنے پر ابھارتی رہے، اگر کبھی بد مزگی پیدا ہو جائے تو والدہ کو چاہیئے کہ وہ جلد ہی صلح و صفائی کرا دے، یہ چیز بچوں میں جذباتی لگاؤ اور باہمی وابستگی پیدا کرے گی اور اطفال کے تعلقاتِ باہمی کو ہر حال میں استوار رکھنے میں معاون ثابت ہوگی۔

۴۔ ماؤں کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیئے کہ بچوں میں ناروا سلوک یا باہمی بد مزگیاں (اگر صلح و صفائی سے انہیں بروقت زائل نہ کیا جائے تو) ان میں نفرت، کینہ اور بغض و عداوت کے جذبات کو پال کر بالآخر انہیں بغاوت اور مقاطعہ و مفارقت پر آمادہ کرتی ہیں۔ جن کے نتائج بسا اوقات انتہائی خطرناک ہوتے ہیں، دینی گھرانوں (بلکہ دینی مدارس) کے بچوں کا بڑے ہو کر ملحدوں اور خدا کے باغیوں کی صف میں جا شامل ہونا، شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں کا خودکشی یا عصمت فروشی تک پر اتر آنا اور بڑے آدمیوں کی اولاد کا جرائم پیشگی پہ مائل ہونا وغیرہ دراصل بچے کے اسی ناروا سلوک کے شاخسانے ہوتے ہیں جن کا اثر بڑی عمر تک پہنچتے پہنچتے قوی ہو جاتا ہے اس لئے ماؤں کو بچوں کے باہمی تعلقات کی استواری پر غیر معمولی توجہ صرف کرنی چاہیئے۔

۵۔ بچے کے جذباتِ لطیف اور ذوقِ سلیم کی تربیت کے لئے گھر کی اس اولین درسگاہ کو حتی الامکان صاف ستھرا، دلکش اور جاذب نظر رکھنا ماں کی اہم ذمے داری ہے

سامان خانہ کی ترتیب میں خوش سلیقگی، گفتگو میں حلیمی و خوشگواری، برتاؤ میں شائستگی آدابِ حیات کی پابندی دستکاری، آرٹ کرافٹ اور ہلکی پھلکی باغبانی کی مادری تعلیم، بچے میں مطلوبہ ذوقِ سلیم اور جذباتِ لطیف کی تربیت کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوگی۔

۶۔ بچے میں پاکیزہ جذبات اور اعلیٰ تصورات کو پروان چڑھانے کے لئے معیاری شخصیتوں کے واقعات کو اگر مائیں خوشگوار پیرایۂ بیان میں پیش کریں تو بچے اپنی تاریخ کے بڑے آدمیوں سے نہ صرف یہ کہ واقف ہوں گے بلکہ ان کے کارناموں سے متاثر ہو کر، ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا عزم اور حوصلہ بھی اپنے اندر پیدا کریں گے۔

## ۲۔ حسی نشوونما

حسی نشوونما سے مراد، حواسِ خمسہ کی نشوونما ہے۔ قدرت نے ہر فردِ بشر کو پانچ حواس سے نوازا ہے۔

۱۔ دیکھنے کی حس یعنی قوتِ باصرہ ۲۔ چکھنے کی حس یعنی قوتِ ذائقہ
۳۔ سونگھنے کی حس یعنی قوتِ شامّہ ۴۔ چھونے کی حس یعنی قوتِ لامسہ
۵ سننے کی حس یعنی قوتِ سامعہ۔

ان حواسِ خمسہ کو ابوابِ علم (FIVE GATES OF KNOWLEDGE) بھی کہا جاتا ہے۔

بچے ان حواس کو برتنے کا سلیقہ اور شعور نہیں رکھتے۔ ان کی قوتِ باصرہ شوخ رنگوں کو پسند کرتی ہے مگر وہ ان شوخ رنگوں سے تیار ہونے والی اچھی اور بری چیزوں میں تمیز نہیں کر پاتے نتیجتاً وہ اپنی جیبوں کو سرخ شیشے کے ٹکڑوں سے بھر کر پھاڑ لیتے ہیں جو ماں کو ناگوار گزرتا ہے۔ وہ اپنی قوتِ ذائقہ کو آزماتے ہوئے کسی پتھر کو منہ میں رکھتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ ان حواس کو کس سلیقہ سے برتا جائے۔ وہ قوتِ لامسہ کو استعمال کرتے ہیں مگر اس شعور سے بے بہرہ ہوتے ہوئے کہ پھول کو ہاتھ میں لینا باعثِ راحت ہے اور انگارہ آگ باعثِ اذیت۔ علیٰ ہذا القیاس وہ اپنے قوائے حسیہ کو ان کے صحیح استعمال کے شعور سے تہی دست ہو کر آزماتے ہیں ان قویٰ کا بُرا اور غلط استعمال ماں پر گراں گزرتا ہے اگر

وہ خود بچوں کو، حواس کے صحیح استعمال پر مجبور و مضطر کرتی ہے تو بچے اسے اپنی آزادی میں مداخلتِ بے جا تصور کرتے ہیں اور اگر والدہ صرفِ نظر کرتی ہے تو بچے ایک طرف ان قوتوں کے غلط استعمال سے نقصان اٹھاتے ہیں اور دوسری طرف صحیح استعمال کی تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔

والدہ کا حواسِ خمسہ کے استعمال کی صحیح تربیت دینے کا فریضہ، بڑا اہم اور نازک فریضہ ہے اسے چاہیئے کہ:۔

۱۔ وہ افراط و تفریط کی انتہاؤں پر جانے کی بجائے اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے دورانِ تربیت نہ تو بچے پر اپنی پسند کو زبردستی مسلط کرے اور نہ ہی وہ اسے محرومِ توجہ رکھے ماں کو چاہیئے کہ وہ اعتدال اور دانشمندی کے ساتھ بچوں کو اپنے احساسات پر بھروسہ کرنا سکھائے ان کے احساسات میں نہ تو بے جا دخل دینا چاہیئے اور نہ ہی ان پر اپنی مرضی اور پسند کو جبراً ٹھونسنا چاہیئے۔

۲۔ بچے اگر کسی شوخ رنگ کی طرف لپکتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ ان رنگوں کی گندی غلیظ اور مضر اشیاء کو جمع کریں۔ والدہ کو چاہیئے کہ وہ انہی الوان پر مشتمل اچھی خوشنما اور صاف ستھری اشیاء بچے کو مہیا کر دے۔ علیٰ ہٰذا القیاس، اس کی ہر حس اور قوت کی تربیت کے لئے بچے کی پسند میں سے راہ نکالتے ہوئے والدہ کو ایسے کھلونے اور اشیاء فراہم کرنی چاہیئے جن سے ایک طرف اس کی حسیات کی تسکین ہو سکے اور دوسری طرف اس میں ان حسیات کو برتنے کا سلیقہ پیدا ہو سکے۔

۳۔ حسیّات اور جذبات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ والدہ اگر بچے کی ابتدائی ناقص حسیات کی تربیت کو نظر انداز کر دے تو اس کے جذبات ناقص رہ جائیں گے، ایک تعلیمیافتہ خاتون سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ احساسات کے بغیر زندگی کا رنگ پھیکا ہوتا ہے۔ اخلاق کا وسیع نظام احساسات کے رنگ میں رنگے بغیر ذہن کو اپیل نہیں کر سکتا۔ اس لئے ان کی تربیت کرنا اور انہیں پروان چڑھانا ماں کے فرائض میں شامل ہے۔

## ۳۔ بول چال کی نشوونما

بچہ اپنی ابتدائی عمر میں "بے زبان" ہوتا ہے دراصل اس کی یہی بے زبانی، زبان کا کام دیتی ہے۔ اس کی آوازیں ہمارے لئے بے معنیٰ ہوتی ہیں لیکن وہ اپنی انہی آوازوں کے ذریعے اپنی ضرورت، تکلیف وراحت یا پسند وناپسند کا اظہار کرتا ہے وہ کوئی اپنی پسندیدہ چیز (مثلاً کھانا یا کھلونا وغیرہ) دیکھتا ہے تو اس طرح کی بے معنیٰ آوازوں میں اپنی پسند یا ناپسند کا معنیٰ پیدا کر دیتا ہے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو اس کی کلکاریاں، تسکینِ شکم اور آسودگیٔ طبع کا مظہر بن جاتی ہیں۔ جب کوئی پسندیدہ چیز اس سے کھو جاتی ہے تو منہ بسورنا اور رو دینا، اس کی آزردگیٔ خاطر کا مظہر بن جاتا ہے۔ الغرض بچے کی یہ بے معنیٰ آوازیں بھی، با معنی کلام بن جاتی ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کی انہی آوازوں سے جان لیتی ہیں کہ بچہ کس چیز کا طالب ہے یا اسے کیا تکلیف لاحق ہے ماں کے فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ بچہ انہی بے معنیٰ آوازوں میں جو معنویت پیدا کرتا ہے اسے بیان وکلام کا لباس پہنانے کے لئے ماں مناسب الفاظ تجویز کر کے بچے کی راہنمائی کرے اس سلسلے میں درج ذیل باتوں کا بطور خاص خیال رکھنا چاہیئے۔

۱۔ بچہ خواہ غلط لفظ ہی بولے لیکن ماں کو اس کی راہنمائی کے پیشِ نظر صحیح اور درست الفاظ ہی بولنے چاہئیں تاکہ بچے کے کان درست الفاظ اور اس کے صحیح تلفظ سے آشنا ہوں۔

۲۔ بعض اوقات ماں یا دیگر افراد خانہ بچے کو مخاطب کرتے ہوئے لاڈ پیار میں الفاظ کا تلفظ بگاڑ دیتے ہیں یہ بڑی غلط حرکت ہے ماں اور بچے کے متعلقین کی یہی کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ الفاظ کو اس کی صحیح صورت میں ادا کریں تاکہ بچے کے کان غلط الفاظ اور اس کے غیر صحیح تلفظ سے آشنا ہی نہ ہونے پائیں۔

۳۔ بول چال کے دوران اس کے ذخیرۂ الفاظ میں وسعت پیدا کرنے کے لئے اسے مناسب چیزیں دکھائیے اور ان کے ناموں سے متعارف کروائیے تاکہ وہ اسماء کو اشیائے مسمیات کے ساتھ ازبر کر سکے۔

۴۔ بچے کے سامنے اس کی توتلی زبان سے محظوظ ہوتے ہوئے لاڈ پیار میں خود توتلی زبان کو اختیار نہ کیجئے ورنہ وہ اسی توتلے پن کو معیار زبان قرار دے لے گا۔

۵۔ کم ازکم بچے کی موجودگی میں فحش الفاظ اور گالیاں کبھی اپنی زبان پر نہ لائیے، یہ چیز اس کی زبان اور اخلاق کو برباد کر دینے والی ہے۔

۶۔ بچے کو نام سکھاتے وقت یا مختلف اشیاء کی شناخت اور تعارف کرواتے وقت ایسی شخصیتوں اور چیزوں کو اس کے سامنے لائیے جو اس کی اخلاقی اصلاح کے لئے مفید اور مددگار ثابت ہوں۔ بری اور گندی شخصیتوں کو خواہ وہ ماضی کی ہوں یا حال کی، اس کی معلومات میں دینے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

۷۔ بچے کی باتوں میں دلچسپی لیجئے اس سے وہ بہت جلد بولنا سیکھ لے گا۔

۸۔ بچہ، اظہار خیال کے دوران اگر مناسب الفاظ نہ پا کر اٹک جاتا ہے تو اسے بروقت مناسب الفاظ فراہم کیجئے اور ان الفاظ کو مختلف جملوں میں بار بار دہرائیے تاکہ وہ اچھی طرح بچے کے ذہن نشین ہو جائیں۔

### ۴۔ جنسی نشوونما

زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو جنس (SEX) سے متعلق ہے۔ جب بچہ سوچ بچار اور غور و خوض کی عمر کو پہنچتا ہے تو وہ جنسی پہلو سے بھی سوچتا ہے۔ "میں لڑکا کیوں ہوں؟"۔ "سلمیٰ لڑکی کیوں ہے؟" "میں پیدا کیسے ہوا ہوں؟"۔ جب بچے بڑوں سے اس قسم کے سوالات کرتے ہیں تو مشرق کی روایتی شرم و حیاء انہیں جواب دینے میں مانع ہوتی ہے۔

### مغرب اور جنسی نشوونما

مغربی ماحول میں ایسے سوالات کا سامنا کرنا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے کیونکہ وہاں بچوں کو جنسی معلومات کھلے عام فراہم کی جاتی ہیں بلکہ سرکاری طور پر جنسی تعلیم کو بچوں کے مدارس میں شاملِ نصاب رکھا گیا ہے۔ بعض ممالک میں تو صورتحال یہ ہے کہ:۔

باوجود پبلک احتجاج کے بعض ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں حکومتی سرپرستی

میں کنڈر گارٹن سطح سے بالائی جماعت کے طلبہ تک جنسی تعلیم (SEX EDUCATION) روز افزوں پھیل رہی ہے۔

## سکنڈے نیوین ممالک

سکنڈے نیوین ممالک جنسی تعلیم کی اختلافی بحث میں بالآخر یہ فیصلہ کرتے ہوئے کوئی نئی بات نہیں پاتے کہ آٹھ برس کے بچوں کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر وہ جنسی تعلیم دی جائے جس کا آغاز یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے کیا گیا ہے۔ سویڈن میں بچوں کے لیے سات سال کی عمر سے تیرہ سال کی عمر تک جنسی تعلیم لازمی ہے۔ اب سویڈن عمر کی ابتدائی حد کو چھ سال قرار دینے کے لئے قانونی کاروائی کے عمل سے گزرنا چاہ رہا ہے لیکن گذشتہ تین برسوں سے اس نے جو جنسی تعلیم ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر دی ہے وہ ان بچوں کے لئے ہے جو ابھی مہد میں ہیں، ٹی وی فلموں کے ذریعے بچے کی پیدائش کا مکمل منظر اس کی تمام جزئی تفصیلات سمیت، دکھایا جاتا ہے اور یہ بات کہنے سے بڑی احتیاط اور سوچ سمجھ سے کام لے کر گریز کیا جاتا ہے کہ

"والدین کا مرتبہ پانے کے لئے شادی کوئی لازمی اور ناگزیر ضرورت ہے۔"

مزید برآں، سویڈش رائل کمیشن نے جو جنسی معلومات مہیا کرنا ہے سکول اساتذہ کی راہنمائی کرنے والے دستی کتابچوں (HAND BOOKS) میں ایسی تبدیلی کی تجویز پیش کی ہے جس سے ان میں جدید ترین مانع حمل ذرائع سے متعلق معلومات بھی جگہ پا سکیں۔ کمیشن نے اب اس پیراگراف کو حذف کرنے کے لئے کہا ہے جسکی رو سے نوجوان اساتذہ بچوں کے سامنے جنسی عمل کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے۔

## ڈنمارک

ڈنمارک بھی جنسی تعلیم کی اجازت دینے میں سویڈن کی طرح "فراخدل" ہے ریاست ڈنمارک کی ٹیلی ویژن سروس ابتدائی جماعتوں کے سلیبس میں ہی جنسی

تعلیم کو شامل کرتی ہے، مزید برآں کوپن ہیگن کے اخبارات جنسی موضوعات پر بے تکلفی سے مضامین اور مقالات شائع کرتے ہیں۔

"یہ بی بی سی لندن ہے"

"بچے کہاں سے آتے ہیں؟" یہ وہ عنوان ہے جس پر برٹش براڈ کاسٹنگ کمپنی (بی بی سی) نے جنسی تعلیم کا پروگرام مرتب کیا ہے جو اگلے سال ٹی وی پر آغاز پذیر ہوگا۔ پرائمری جماعتوں کے بچے جن کی عمر دس سال سے زیادہ نہ ہوگی، عشق و محبت کرتے ہوئے کئی جوڑوں کو ٹی وی سکرین پر دیکھیں گے لیکن ان عشاق کے اجسام کے صرف وہی حصے فلمائے جائیں گے جو کمر سے اوپر ہوں گے۔ بی بی سی کا ایک دوسرا ریڈیو اور ٹی وی پروگرام بچے کی پیدائش کی وضاحت پیش کرے گا۔ یہ متحرک تین سطری[1] نظام کا ایک حصہ ہے جو فلم سلائیڈز کے ذریعے، ٹی وی پر تعلیم اطفال کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی بھی راہنمائی کرے گا۔ اس میں بچے کی پیدائش کے مناظر کو ٹی وی اناؤنسر کی توضیحات کے ساتھ نذر ناظرین کیا جانے گا۔ بی بی سی کے نمائندے نے ان اطلاعات کی تردید کی ہے کہ اس پروگرام میں مانع حمل ذرائع کے طریقہ ہائے استعمال کی وضاحت بھی کی جائے گی، پبلک کے شدید احتجاجات کے باوجود، بی بی سی، اس عزم پر تلی ہوئی ہے کہ وہ جنسی تعلیم کی توسیع کے اس "مقدس" جہاد کو اور آگے بڑھائے گی۔ یہ ہے وہ پہلی کوشش جو برطانیہ میں قومی سطح پر جنسی تعلیم دینے کی خاطر کی جا رہی ہے۔

امریکہ کے نصف سے زائد سکولوں میں جنسی تعلیم کو قدرے ترمیم شدہ شکل میں رائج کیا گیا ہے بعض رومن کیتھولک مدارس میں بھی، جنسی تعلیم کو کنڈر گارٹن کی سطح سے شروع کیا گیا ہے، رہے وہ سکول جو پبلک سرمائے سے

---

[1] اصل الفاظ ہیں "THREE TIER SYSTEM" میں نے اس کا ترجمہ "متحرک تین سطری نظام" کیا ہے، جو ایک لغوی ترجمانی ہے اگر یہ کوئی فنی یا تیکنیکی اصطلاح ہے تو میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ قاسمی

چل رہے ہیں تو ان میں حیاتیات کی جماعتوں میں تو جنسی تعلیم سے گریز نہیں برتا جاسکتا۔ امریکی شہریوں کا ایک گروپ جو وہاں "جمعیت حفظان جنس" (SANITY ON SEX) کے نام سے متعارف ہے، جنسی تعلیم کے خلاف مہم چلا رہا ہے، اس گروہ کے مطابق 'ایک سکول میں ایک خاتون ٹیچر اور مرد استاد نے کمرۂ جماعت میں اپنے کپڑے اتار دیئے تاکہ کمسن بچے خود علم الاعضاء کی روشنی میں، مرد وزن کے باہمی فرق کو اس عملی توضیح (PRACTICAL DEMONSTRATION) کے ساتھ برأی العین دیکھ لیں"۔

SEX EDUCATION: TELLING THEM THE NAKED TRUTH.
THE PAKISTAN TIMES, LAHORE: NOVEMBER 24, 1969.
WESTERN CIVILIZATION, CONDEMNED BY ITSELF
PAGE 730-731.

**یہ جنسی تعلیم کدھر لئے جا رہی ہے؟**

اس سوال کا جواب اس کتابچے کے مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے، جس کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کیا گیا ہے۔

شہر نیویارک کے مقامی محکمۂ صحت نے تمام ہائی سکولوں کو ایک غیر معمولی نوعیت کا کتابچہ ارسال کیا جس کا عنوان تھا

"EMERGENCY PROCEDURES RELATING TO PREGNANT TEENAGERS ATTENDING SCHOOLS."

یہ کتابچہ ابتدائی طبی امداد کی ہدایات جاری کرتا ہے جبکہ جغرافیہ پڑھتے ہوئے کمرۂ جماعت میں کوئی طالبہ اچانک وضع حمل کے مرحلہ سے دوچار ہو جائے۔ نیویارک شہر کے ثانوی مدارس کی تقریباً اڑھائی ہزار طالبات کے لئے ایسا فوری نوعیت کا انتظام ایک عام سی بات ہے اب سے دو سال قبل یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ کوئی طالبہ حاملہ پائی جانے کے بعد بھی سکول میں رکھی

جاسکتی ہے لیکن اب ۱۳ سے ۱۹ سال کی لڑکیوں میں استقرار حمل کے صد فیصد اضافے کی بلند پایہ شرح نے بورڈ آف ایجوکیشن کی پالیسی کو یکسر تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے جس کے نتیجے میں اب حاملہ طالبات کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں مدارس میں داخل رکھا جاتا ہے اِلاّیہ کہ وضع حمل کی خاطر انہیں چند روز قبل فارغ کر دیا جائے۔

اگر مدارس کی طالبات ایسا کرنے میں کوئی مشکل یا کم از کم عدم سہولت محسوس کرتی ہیں تو انہیں ان مخصوص تعلیمی مراکز کا رخ کرنا چاہیئے جو خالصتاً حاملہ لڑکیوں کے لئے کھولے گئے ہیں۔ ان مراکز میں انگلش گرامر اور ریاضی کی معمول کے مطابق تعلیم و تدریس کے علاوہ نومولود بچوں کی نگہداشت اور مانع حمل ذرائع و وسائل کے متعلق خصوصی خطابات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے“

کچھ معلمات کو قبل ازیں یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ تعلیمی فرائض کے ساتھ دایہ اور قابلہ کے واجبات بھی انجام دیں۔ معلمات کو یہ بات ناگوار گزری اس سلسلے میں متذکرہ کتابچے میں یہ کہا گیا ہے کہ

”کچھ معلمات اس خیال پر کہ وہ طالبات کے لئے دایہ گیری کے فرائض بھی انجام دیں ناگواری محسوس کرتی ہیں حالانکہ ان کے لئے محکمہ صحت کے پمفلٹ میں یہ حوصلہ افزا تجویز بھی موجود ہے کہ اب ہر وہ ہائی سکول جس میں حاملہ طالبات موجود ہوں اپنے ہاں ایک کمرہ جس میں ایک بلند میز یا بنچ دھیا ہو۔ مخصوص کر دے گا تاکہ وہ اچانک یا ہنگامی وضع حمل کی صورت میں استعمال ہو سکے ہر پرنسپل ادارہ پر یہ لازم ہے کہ وہ کم از کم دو معلمات کو قابلہ گیری کے فرائض ادا کرنے پر مامور کرے“

اسی حوصلہ افزاء انداز میں محکمہ صحت کا یہ کتابچہ واضح کرتا ہے کہ

”قبل از وقت، ولادتِ اطفال اور اسقاط حمل کا تناسب بڑی عورتوں کی نسبت ان نوجوان لڑکیوں میں کہیں زیادہ پایا جاتا ہے، بعض اوقات وقت سے

پہلے ہی پیدا ہونے والے بچوں کی اچانک اور جلد پیدائش، ایمبولینس کی آمد سے قبل فوری ہنگامی تدابیر کی متقاضی ہوتی ہے۔"

TEACHERS AS MIDWIVES (JOYCE EGGENGTON)
THE PAKISTAN TIMES, LAHORE; MARCH 15, 1970.
WESTERN CIVILIZATION, CONDEMNED BY ITSELF:
PAGE 731-732

## جنسی پہلو اور مشرقی ماحول

مغربی ماحول کے برعکس، مشرقی ماحول میں، جنسی معلومات کو بچوں کے علم میں لانا شرم و حیا کے منافی گردانا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بچوں کی طرف سے جب جنسی پہلو سے سوالات پوچھے جاتے ہیں تو ایسے سوالات کا سامنا بالعموم کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ

(الف) ایسے سوالات کرنے والے بچے کو یا تو ڈانٹ دیا جاتا ہے یا سزا دی جاتی ہے۔

(ب) جنسی سوالات کا غلط سلط جواب دے کر بچے کو خاموش کر دیا جاتا ہے۔

(ج) ایسے سوالات کے جواب میں بچے کو بلا جھجک سب کچھ بتا دیا جاتا ہے یہ طرزِ عمل ہمارے انتہائی ماڈرن طبقوں نے اختیار کر رکھا ہے جو جسم کے اعتبار سے مشرقی اور مزاج کے لحاظ سے مغربی ہیں۔

یہ تینوں طرز عمل غلط ہیں۔ ان کے ذریعے بچہ بگڑ جائے گا، اس میں برائی زیادہ شدت سے جڑ پکڑے گی اور بالآخر وہ جنسی آوارگی کی ایسی راہ پر چل نکلے گا، جسے مہذب سوسائٹی بالعموم اور مسلم سوسائٹی بالخصوص ناپسند کرے گی۔

پہلے طرزِ عمل میں یہ خامی ہے کہ بچے کے ایک ایسے سوال کے جواب میں اُسے جھڑک دینا جسے وہ بزعم خویش معقول سوال سمجھتا ہے اس کی الجھن کا فی الواقع کوئی معقول حل نہیں ہے، وہ مجیب کی ڈانٹ ڈپٹ کو غیر مناسب اور لغو جواب قرار دیتے ہوئے خود تحقیق و جستجو اور کھوج کرید پہ اتر آئے گا، کیونکہ بچے کے معقول سوال کے مناسب جواب کا دروازہ بند کر دینے کا مطلب، اسے نامعقول ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کرنے کے

مترادف ہے۔ اگر اہل خانہ بچے کے خود معقول مجیب نہ بنیں گے تو وہ دوسروں کو اپنا مجیب قرار دے لے گا جو ضروری نہیں کہ اچھے لوگ ہوں۔ اس طرح بچے کے یہ سوال وجواب اس کی نازیبا حرکات اور آوارگی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔

دوسرے طرز عمل میں یہ خرابی ہے بچے کو غلط جواب دے کر جھوٹ بولنے کا جو عملی نمونہ پیش کیا ہے وہ اخلاقی تربیت کے یکسر منافی ہے علاوہ ازیں بعد میں بچے کو جب اس جواب کی غلطی کا علم ہوگا تو وہ جان لے گا کہ مجیب نے جھوٹا جواب دیا تھا جس سے بچے کا اس پر اعتماد مجروح ہوگا۔

تیسرا طرز عمل صرف یہی نہیں کہ مشرقی روایات کے منافی ہے بلکہ یہ کھلی کھلی اس تہذیبِ مغرب کی تقلید ہے جس کا نقطۂ عروج شرم وحیا سے بالاتر ہو کر جنسی ہوا و ہوس اور شہوت پرستی کا اخلاق سوز ماحول ہے، بچہ ان معلومات کو پاکر اپنی تجرباتی فطرت کے عین مطابق ان کی عملاً جانچ پڑتال کرتا ہے اور یہی وہ نقطۂ آغاز ہے جس پر چل کر بچہ عریانی اور فحاشی، بے حیائی اور بے شرمی کے گناہوں میں ڈوب جاتا ہے۔

بہر حال بچے کی جنسی نشو ونما بھی اس کی مجموعی نشو ونما کا ایک حصہ ہے اس کی جنسی تربیت کے لئے ماں کو مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

۱۔ بچے کے سامنے خواہ مخواہ جنسی مسائل نہ چھیڑے جائیں اگر بچہ خود متوجہ نہیں ہے تو اس کی توجہ کو جبراً ان مسائل کی طرف نہیں کھینچنا چاہیئے۔

۲۔ جنس کے معاملے میں بچے اگر سوال کریں تو انہیں ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش سے نہیں نوازنا چاہیئے ورنہ وہ جنسی معلومات کے حصول کو یا تو بجائے خود جرم سمجھ لیں گے یا کوئی ایسا سربستہ راز جو ان سے چھپایا جاتا ہے۔

۳۔ بچے کے جنسی سوالات کے جواب میں مصنوعی یا ضرورت سے زیادہ شرم سے اگر کام لیا جائے تو وہ خواہ مخواہ ذہنی الجھاؤ کا شکار بن جاتے ہیں۔

۴۔ جواب دیتے وقت حکمت اور دانشمندی سے بچے کو صرف اتنی بات ہی بتائی جائے جتنی اس کے لئے مناسب اور ضروری ہو۔

۵۔ جب اس کا ذہن جنسی امور کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہو تو اسے دوسرے امور میں مصروف کر کے اس کی توجہ کو جنسی امور سے ہٹا دیا جائے۔

۶۔ بعض گھرانوں میں ایسے بے تکلف مذاق ہوتے ہیں جن میں جنسی رنگ غالب ہوتا ہے، دیور بھاوج کی نوک جھونک ایک عام معمول ہے اور اسے یہ سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے کہ چھوٹے بچوں کو ان باتوں کا کیا علم؟ یہ قطعی غلط بات ہے بچے کڑے مشاہدے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسے مذاقوں سے پرہیز لازم ہے۔

## ۵۔ معاشرتی نشوونما

بچے کی معاشرتی نشوونما کے سلسلے میں ماں کی ذمہ داریاں حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ یہ بات ازحد ضروری ہے کہ ہم بچے کو جن معاشرتی اقدار اور سماجی اصولوں کا علمبردار بنانا چاہتے ہیں، انہیں ہم اپنے ماحول میں عملاً اختیار کریں، زندگی کے بہترین اصول اگر بچے کے سامنے مسلسل زیرِ عمل رہیں تو وہ خود ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریگا اور انہیں جزوِ حیات بنالے گا اس لئے ماں کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ گھر کو اس کی پوری فضاء اور ماحول سمیت اسلامی اصول و روایات کے سانچے میں ڈھال دے تاکہ بچہ خود اس سانچے میں ڈھل کر اپنی اقدار کا علمبردار ہو، اگر بچے کو اسلامی اصول و مبادیات اور دینی اقدار و روایات کا علمبردار ماحول میسر آتا ہے تو وہ خود ایک اعلیٰ درجے کا مومن و مسلم ہوگا اس کے برعکس اگر اسے پست اور گھٹیا ماحول میسر آتا ہے تو اس کی معاشرتی نشوونما بھی پست اور گھٹیا ہوگی، الغرض، بچہ جس معیارِ معاشرت میں زندگی بسر کرتا ہے وہی معیار وہ خود اختیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پست خیال و عمل کے گھرانوں میں معیارِ معاشرت پست نظر آتا ہے اور بلند فکر و نظر کے گھرانوں میں اعلیٰ معیار دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ یاد رکھئے اگر بچے کو ابتداء ہی سے اعلیٰ فکر و عمل کا مطلوبہ ماحول میسر نہ آئے تو بعد میں اسے پست معاشرتی ماحول کے خول سے نکل کر بلند ماحول میں داخل ہونے کے لئے دُہری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے بچے کو مستقبل کی ان مشکلات سے نجات دلانے کی واحد صورت یہ ہے کہ ماں گھر کو (جو بچے کی اوّلین تربیت گاہ ہے) ابتداً

ہی سے اعلیٰ اقدار و روایات سے منور رکھے تاکہ بچے کا معاشرتی نشو و نما ایک تسلسل کے ساتھ ہموار اور سیدھے راستے پر برقرار رہے، پست طرز زندگی کو بدل کر اعلیٰ اور برتر طرز معاشرت اختیار کرنا، کسی راہنما کے بغیر ممکن نہیں ہے اور کون جانتا ہے کہ اگر بچے کو ابتدا ہی سے ماں کی صورت میں شفیق راہنما اور گھر کی صورت میں مطلوبہ تربیتی ماحول فراہم نہ کیا جائے تو کل اس کے لئے ضرور ہی کوئی راہنما میسر آجائے گا۔ اس لئے والدہ کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ کل کی موہوم امید پر تکیہ کرنے کی بجائے آج ہی اس کی راہنمائی کرے اور اسے مطلوبہ ماحول فراہم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔

۳۔ بچے کو اچھی عادات پر دادِ تحسین دی جائے، اس سے اس کی ہمت افزائی ہوگی۔ آئندہ کے لئے وہ اِن عاداتِ حسنہ کو اپنے اندر ابھارنے پر آمادہ ہوگا تاہم بچے کو دادِ تحسین و تبریک پیش کرنا ہی وہ واحد محرک نہیں ہے جو اسے صالح عادات و اطوار سکھاتا ہے بلکہ اعلیٰ و برتر اصول و اقدار پر مشتمل مسلسل عملی نمونہ پیش کرنا ہی اصل اور دیرپا محرک ہے جو اس کی زندگی کو بلند پایہ خصائل و شمائل سے مزین کرتا ہے۔

۴۔ بچے کو ذہنی اور عملی طور پر اپنی ملّی روایات اور اسلامی تہذیب سے وابستہ و پیوستہ رکھنے کے لئے ازحد ضروری ہے کہ ماں، تاریخ اسلام کی نمایاں اور درخشاں شخصیتوں کا تعارف، کہانیوں اور پہیلیوں کی صورت میں کرواتی رہے۔

## چند ہنگامی مسائل کا حل

بچوں کی نشو و نما اور تربیت کے یہ وہ نمایاں پہلو ہیں جو بچے کی معمول کی زندگی سے متعلق ہیں۔ اگر بچہ معمول کے مطابق پرورش و تربیت پاتا رہے تو اس کی راہنمائی مندرجہ بالا خطوط پر ہی کی جاتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ہنگامی طور پر کچھ ایسی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جن کے ازالہ و حل کے لئے معمول سے قدرے زیادہ احتیاط و توجہ سے کام لینا پڑتا ہے اس وقت ماں کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، یہ مشکلات تقریباً اس عمر میں پیدا ہوتی ہیں جب بچہ قدرے غور و فکر اور سوچ بچار کے قابل ہو جاتا ہے اگرچہ ایسی مشکلات کی فہرست بہت طویل ہے تاہم ہم چند ایک کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے اس

ضمن میں ماں کے فرائض کی طرف اجمالی اشارات کئے دیتے ہیں ۔

### ا ۔ بچّے کا دودھ چھڑانا

بچے کو دودھ پلانے کے متعلق عام طور پر مائیں یہ سمجھتی ہیں کہ اس کا مقصد محض بچے کی بھوک کا ازالہ کرنا ہے ۔ یہ قطعی غلط ہے بچہ اپنی ماں کا دودھ پیتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اپنی بھوک مٹاتا ہے بلکہ وہ نرم ونازک آغوشِ مادر سے سکون بھی پاتا ہے ۔ ماں کے ہاتھوں کی تھپتھپاہٹ اسے پیار اور شفقت مہیا کرتی ہے دوران شیر خوارگی بچے کو ماں کا اپنی چادر سے ڈھانپ لینا ۔ اسے گوشۂ عافیت کے حصول کا احساس دلاتا ہے جس میں وہ دودھ پیتے ہی سکون کی نیند سو جاتا ہے چونکہ مائیں رضاعت کو صرف بچے کی شکم پُری تک محدود گردانتی ہیں اس لیئے انفطام کے وقت رضاعت کے ساتھ وابستہ ان نفسیاتی لوازمات کو نظر انداز کر دیتی ہیں جس کے باعث دودھ چھڑانا ایک مسئلہ بن جاتا ہے ان کے نزدیک بات صرف اتنی ہی ہے کہ بچے کو دودھ نہ پلایا جائے جبکہ بچہ یہ سمجھتا ہے کہ والدہ کا دودھ پینے کی بدولت وہ جس محبت بھری گود اور شفقت بھرے ہاتھوں کی تھپتھپاہٹ، پیار بھری گفتگو اور الفت بھری نگاہ سے سکون پایا کرتا تھا، اب وہ اس سے محروم ہو گیا ہے اس طرح بچے کے جذبات اور والدہ کے نقطۂ نظر میں ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث، انفطام (دودھ چھڑانا) ایک مسئلہ بن جاتا ہے پھر اس مسئلے کی سنگینی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب مائیں دو سال کی مقررہ مدت سے قبل یا بہت بعد میں دودھ چھڑاتی ہیں ۔ یہ دونوں باتیں سخت نقصان دہ ہیں پہلی صورت میں بچہ ماں کی آغوشِ محبت سے قبل از وقت محروم ہو جاتا ہے، والدہ کے ہاتھوں کا سکون بخش لمس اور اس کی محبت بھری لوریاں اس سے چھن جاتی ہیں اب اسے ماں کی گود کا راحت افزا گوشۂ عافیت بھی نصیب نہیں ہوتا ۔ یہ سب کچھ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا اب اس کا کوئی محافظ نہیں رہا ۔ یہ احساسِ محرومی بچے کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ دوسری طرف اگر بچے کو بعد از وقت بھی دودھ پلایا جاتا رہے تو یہ چیز بچے کی ذہنی کیفیت کے لیئے مفید نہیں ہوتی، بچہ جب زیادہ عرصے تک دودھ پیتا رہتا ہے تو ماں کی محافظت پر اس کا بھروسہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اب کوئی کام بھی وہ

خود کرنے پہ آمادہ نہیں ہوتا اور ہر کام ماں ہی سے کروانے کی ضد کرتا ہے، یہ چیز اسس کو خود اعتمادی سے محروم کر دیتی ہے اور ہر ضرورت میں اسے دوسروں کا دستِ نگر بنا دیتی ہے۔

بعض مائیں دودھ چھڑانے کے لئے اپنی چھاتیوں پر کوئی کڑوا مادہ لگا دیتی ہیں تاکہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دے پھر بھی اگر بچہ باز نہیں آتا تو جبری انفطام کی خاطر اس کی پٹائی کر دیتی ہیں، یہ سب کچھ غلط ہے۔ اس سے بچہ ایک طرف تو ضدی بن جاتا ہے اور دوسری طرف وہ جبراً محروم شیر ہو کر ہر اس چیز سے متنفر ہو جاتا ہے جو دودھ سے تیار شدہ ہو اس طرح یہ مسئلہ غذائی پسندیدگی کے نقطۂ نظر سے پیچیدہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ شیر یا مصنوعہ شیر غذا سے بددل اور متنفر ہو جاتا ہے۔

مائیں اس مسئلے سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتی ہیں بشرطیکہ وہ مندرجہ ذیل امور کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ بچے کی مدت رضاعت دو سال ہے، انفطام میں بے جا تقدیم یا ناروا تاخیر سے احتراز کیجئے الّا یہ کہ طبی اعتبار سے ڈاکٹروں کی طرف سے اس قسم کی ہدایت ہو۔

۲۔ دودھ چھڑاتے وقت بچے پر یہ کسی طرح بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ آپ کی محبت اور شفقت میں کمی ہو رہی ہے اس سے سابقہ محبت آمیز برتاؤ جاری رکھئے۔ اگر ماں اپنے دودھ سے بچے کو محروم کر رہی ہے تو اسے اپنی محبت، الفت، شفقت اور پیار سے قطعاً محروم نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس میں اضافہ ہی ہونا چاہیئے۔

۳۔ جب بچہ کھانا شروع کر دے اور چیزوں کو دانتوں سے کاٹنے لگ جائے تو اسے رغبت دلا کر اشیاء کو چبانے کا موقع دیجئے اور اسے یہ احساس دلائیے کہ دانتوں کا اصل مقصد غذا کو خوب چبا کر استعمال کرنا ہے اس طرح وہ دودھ پینے کے بجائے کھانے میں دلچسپی لے گا اور دودھ چھڑانے کا کام آسان ہو جائے گا۔

## ۲۔ بستر خراب کرنا

ماں کی ایک پریشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ بچہ اکثر بستر پہ پیشاب یا پاخانہ کر ڈالتا ہے ماں کو جب روزانہ بول و براز سے آلودہ کپڑوں کو دھونے کی بے جا مشقت برداشت کرنا

پڑتی ہے تو آخر اس کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے اور وہ بچے کو ٹوکنا دھمکانا اور بالآخر سزا دینا شروع کر دیتی ہے لیکن اس کی یہ عادت اس کے باوجود برقرار رہتی ہے۔

ایک عقلمند ماں، اس تکلیف کا ازالہ درج ذیل ہدایات کی روشنی میں بخوبی کر سکتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے وہ یہ دیکھے کہ بچے میں یہ عادت کیوں کر پیدا ہوئی؟ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچہ جب رفع حاجت کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ رو دھو کر ماں کو متوجہ کرتا ہے مگر ماں یا تو رونے کا مقصد نہیں سمجھتی یا وہ اپنی مصروفیت کے باعث فوری توجہ نہیں کر پاتی نتیجتاً بچہ ماں سے محروم توجہ ہو کر بستر پہ ہی رفع حاجت کر ڈالنے کو اپنی عادت بنا لیتا ہے۔ ایسی صورت میں خود ماں کا یہ فرض ہے کہ یہ خیال رکھے کہ بچہ کس وقت کس چیز کا حاجتمند ہے پھر اس کی ضرورت کو پورا کرے، اگر ماں بروقت توجہ کر کے بستر سے اتر کر رفع حاجت میں بچے کی راہنمائی کرے تو بچہ بستر خراب کرنے کی بجائے، ہمیشہ بستر سے اتر کر ہی رفع حاجت کرے گا۔

۲۔ بستر خراب کر دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سونے سے قبل اس کو پیشاب نہ کروایا جائے۔ اگر بچے کو روزانہ سونے سے قبل پیشاب کروا کر لٹایا جائے تو وہ اس ناپسندیدہ حرکت کا عادی نہ بن پائے گا۔

۳۔ بستر پہ پیشاب کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ بچہ ڈر کر ایسی حرکت کرتا ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے یا خوف اور ڈراؤنے خواب کے باعث وہ ڈر جاتا ہے اور بستر پہ پیشاب کر ڈالتا ہے، اگر خرابیٔ بستر کی وجہ یہی ہو تو بچے کو ڈرا دھمکا کر یا سزا دے کر اس حرکت سے باز رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس طریقے سے اس کی عادت اور مستحکم ہو گی اس کا علاج یہی ہے کہ بچے کو تنہا نہ چھوڑیئے تاکہ وہ تنہائی میں خوفزدہ نہ ہو۔ ڈراؤنا خواب دیکھے تو ماں اسے ہمدردی اور شفقت کے ساتھ آغوش میں لے اور نہ صرف یہ کہ اس کی حرکت کو نظر انداز کر دے، بلکہ اس کو اس کا احساس بھی نہ ہونے دے۔

۴۔ سوتے میں پیشاب کر دینے والے بچے کا مذاق نہ اڑایا جائے اسے شرمندہ نہ کیا جائے اس کے بدوضع نام نہ گھڑے جائیں اس کی ہنسی نہ اڑائی جائے، اس سے بچہ اپنی

بے عزتی محسوس کرتا ہے اس قسم کی باتوں سے اگر اس کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ وہ ایک بُرا بچہ ہے تو اس کی اصلاح اور بھی مشکل ہو جائے گی۔

ان ہدایات پر عمل پیرا ہونے سے مائیں اپنے بچوں کی اس عادت کا ازالہ کر سکتی ہیں۔

## ۳۔ بچے کا توتلانا اور ہکلانا

بعض اوقات بچے کی زبان میں توتلاہٹ، لکنت یا ہکلاہٹ پائی جاتی ہے یہ عیب فطری اور ناقابل علاج بھی ہو سکتا ہے لیکن اکثر معاملات میں یہ غیر پیدائشی ہوتا ہے جسے علاج معالجہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔

بچوں میں نقالی کا رجحان بہت ہوتا ہے بلکہ نقل ان کے تعلّم کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر بچے الفاظ کی نقل میں کوتاہی برتتے رہیں یا صحیح لفظ کو توتلے لب و لہجے میں مسلسل ادا کرتے رہیں تو عادت کا یہ تسلسل ان میں مستقل نقص پیدا کر دیتا ہے ماں اگر احتیاط کو لازم رکھے تو بچے کو اس عیب سے پاک کیا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ بچے کی گفتگو کی ابتدائی کوششوں میں (جبکہ وہ صحتِ تلفظ پر کماحقہ قادر نہیں ہوتا) توتلا کر بولتا ہے تو اس کی یہ توتلی زبان بڑی بھلی لگتی ہے بچے کی ماں اور دیگر افرادِ خانہ اس سے محظوظ ہونے کی خاطر، انہی الفاظ کو دوبارہ اس سے سننے کی کوشش کرتے ہیں جس سے بچہ انہی الفاظ کو دوبارہ اسی توتلے انداز میں ادا کرتا ہے جب یہ معاملہ بار بار واقع ہو جاتا ہے تو بچہ توتلا کر بولنے ہی کو اپنی عادت بنا لیتا ہے، عقلمند مائیں جب بھی اپنے بچے کو توتلاتے یا ہکلاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو اسے فوراً صحیح الفاظ کا لقمہ دے دیتی ہیں۔ ماؤں کی یہ بروقت راہنمائی بچوں کو توتلاہٹ یا لکنت میں نادیر نہیں رہنے دیتی اس طرح وہ ماؤں کی راہنمائی سے صحیح لب و لہجہ اور درست لفظ پا لیتے ہیں۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بچہ، اظہار خیال کے لئے مناسب الفاظ نہیں پاتا، وہ مناسب الفاظ کی تلاش میں ہکلانا شروع کر دیتا ہے ایسے موقعوں پر ماں اور دیگر اہل خانہ کا یہ فرض ہے کہ بچے کو مناسب الفاظ فراہم کر دیں۔

جن الفاظ کو ادا کرتے ہوئے بچہ ہکلاتا ہے، انہیں بار بار کہنے پر اسے مجبور نہ کیا جائے۔
بچے کی لکنت اور ہکلاہٹ کی ایک وجہ شدتِ جذبات میں تیزی سے بولنا بھی ہے جب وہ اس کیفیت میں تیزی سے گفتگو کرتا ہے تو ہکلا جاتا ہے۔ کوشش کی جائے کہ بچے کے جذبات کو برانگیختہ ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔
ہکلاہٹ کے شکار بچے کو ٹوکنا، جھڑکنا اور سرزنش کرنا ایک غیر مناسب بات ہے جسے اگر اختیار کیا جائے تو بچہ کم ہمت ہو جاتا ہے اور اپنی عادت کو ترک نہیں کر پاتا۔

## بچوں کی چند اخلاقی ناشائستہ حرکات

اب تک عام تربیت سے ہٹ کر ہم نے ان طبعی نقائص کا ذکر کیا ہے جو ماں کی عدم توجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ان سطور میں اب ہم بچوں کی اُن غیر شائستہ حرکات کا ذکر کریں گے، جو اخلاقاً معیوب ہیں۔
بچے کے بچپن کا دور ایسا ہوتا ہے کہ اس کی نس نس میں چلبلاہٹ، پھرتیلا پن، شوخی اور چستی بھری ہوتی ہے جس کے باعث وہ مجبور ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتا رہے، اگر کوئی بچہ ان اوصاف سے محروم ہے تو یوں سمجھئے کہ وہ مٹی کا مادھو ہے جو بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے۔ یہ شوخی اور پھرتیلا پن، اگر صحتمندی اور توانائی کے ساتھ ہو تو بچے کی استعداد بڑھ جاتی ہے، اور یہ ممکن نہیں رہتا کہ بچہ خاموشی سے ٹک کر بیٹھ جائے اس لئے وہ کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہوتا ہے قطع نظر اس سے کہ یہ "کچھ نہ کچھ" جو وہ کر رہا ہے صحیح ہے یا غلط اس کی یہی حرکات، شرارت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ماں کو یہ شرارتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں وہ تادیباً سزا دیتی ہے مگر بچہ ہر تادیبی سزا کو بھول کر وہی کچھ پھر کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اس سزا کو وہ اپنی عزتِ نفس کے خلاف گردانتا ہے ضد میں آ کر وہی کچھ کر گزرتا ہے جس پر اسے تادیب و سرزنش کی گئی تھی اس طرح بچے کی ناشائستہ حرکات پر ماں کی بڑھتی ہوئی "جفائیں" اس کی قبیح و شنیع حرکات سے "وفاؤں" میں اضافہ کر ڈالتی ہیں۔
اس سے بچے کی تادیب اور سزا کا مسئلہ ابھر آتا ہے۔

## ۱۔ بچہ اور سزا

اگر ماں بچے کو نظر انداز کرتی ہے تو یہ بات اشیاء خانہ کی توڑ پھوڑ اور نقصان کے علاوہ، اس کی اخلاقی تربیت سے غفلت کا ذریعہ بن جاتی ہے لیکن اگر وہ تادیباً سزا و عقوبت دیتی ہے تو بچہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے! اور پھر بھی اپنی روش سے باز نہیں آتا۔

مائیں اگر درج ذیل ہدایات کو پیش نظر رکھیں تو یہ مسئلہ بخوبی حل ہو جائے گا۔

۱۔ بچے کی چلبلاہٹ، پھرتیلاپن، چستی اور شوخی، جن اعمال سے ظاہر ہوتی ہے مائیں انہیں شرارت سمجھتی ہیں۔ شرارت سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ بچوں کی شرارتیں اگر ایک طرف غیر شائستہ ہوتی ہیں تو دوسری طرف بچے کی ذہانت اور فطانت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہیں۔ ان حالات میں بچے کی راہنمائی، سزا و سرزنش کی بجائے، پیار اور محبت کے ذریعے سے بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔

۲۔ سزا دیتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بچہ بھی اپنی عزت اور وقار کا احساس رکھتا ہے اسے دوسروں کی موجودگی میں سزا پا کر ذلیل و رسوا ہونا گوارا نہیں ہوتا اس لئے اسے سزا دے کر بغاوت پر نہ اکسایا جائے۔

۳۔ سزا دینے سے قبل بچے کے جرم کی تحقیق کر لینی چاہیئے بے جا سزا بچے کو آپ سے متنفر کر دے گی، پھر سزا کا مقصد اذیت رسانی نہیں بلکہ اصلاحِ اطفال ہے اس لئے سزا بقدر جرم دیجئے اور بعد از تحقیق دیجئے۔

۴۔ بچے کو محض سزا کی دھمکی پر اکتفا نہیں کرنی چاہیئے، اس سے بچہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے اسے سزا کی دھمکی دے کر اپنے الفاظ کو جھوٹا نہ ہونے دیجئے۔

۵۔ معمولی بات پر بہت بڑی سزا دینا، بچے کے فسادِ طبع اور ذہن کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے اصل طریقۂ اصلاح یہ ہے کہ بچے میں اس کی غلطی کا احساس پیدا کر دیا جائے۔

۶۔ جہاں بچہ غلطی کے بعد خود اپنی خطا کو محسوس کر رہا ہو وہاں بچے کو معاف کر دینا ہی بہتر طرز عمل ہے۔ یہی وہ موقعہ ہے جب بچوں کو خوف خدا کی تلقین مؤثر ثابت ہوتی ہے۔

۷۔ مائیں عام طور پر ایک غلطی یہ کرتی ہیں کہ بچے کی شکایت باپ یا کسی دوسرے بزرگ سے کر ڈالتی ہیں لیکن بعد میں وہ ماما کے جذبات میں بہہ کر بچے کی حمایت پہ اتر آتی ہیں یہ طرز عمل بچے کی نظر میں باپ یا دیگر بزرگ کو ظالم اور جفا کار قرار دینے کے مترادف ہے۔ اس سے پرہیز لازم ہے۔

## ۲۔ بچوں کی ضد

بچوں کی ضد کا مسئلہ تقریباً ہر گھر میں پایا جاتا ہے بچے کی والدہ اسے کوئی کام کرنے سے منع کرتی ہے لیکن وہ اسے کر گزرتا ہے۔ ماں جس قدر بچے کو منع کرتی ہے وہ اسی قدر اسے کر گزرنے پہ مصر ہوتا ہے، والدہ جب سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ سے بھی بچے کو اس حرکت سے باز نہیں رکھ پاتی تو وہ مار پیٹ پہ اتر آتی ہے۔ بچہ ضد میں آکر پھر وہی حرکت کر ڈالتا ہے۔ ماں کے لئے بچے کا یہ رویہ بڑا تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے اور یوں بچوں کی ضد ایک مسئلہ بن جاتا ہے تاہم یہ کوئی لاینحل مسئلہ نہیں ہے اسے بآسانی حل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مائیں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

۱۔ بچے کو اگر کسی کام سے باز رکھنا مقصود ہو تو محض "حکم" کے زور سے اسے منع نہ کیا جائے بلکہ اسے اس کام کی وجہ بھی سمجھا دی جائے ورنہ اس کا ذہن الجھن کا شکار رہے گا۔ یاد رکھئے کہ بچہ ضد اسی وقت کرتا ہے جب وہ کسی بات کو صحیح سمجھتا ہے اگر اس کی ضد ختم کرنے کے لئے اس کام کی خرابی کو اس پہ واضح کر دیا جائے تو وہ برضا و رغبت اسے چھوڑنے پہ آمادہ ہو جائے گا۔

۲۔ اگر ضد کی وجہ بیماری یا جسمانی نقاہت ہو تو اس کا علاج کیا جائے۔

۳۔ ضدیں، پیار، محبت، شفقت، نرمی اور رحمدلی کے ساتھ جس قدر دور کی جا سکتی ہیں اتنی آسانی سے شاید کسی اور طرح دور نہ کی جا سکیں اس لئے ماں کو اس مسئلہ پر قابو پانے کے لئے "تحکمانہ" انداز اختیار کرنے کی بجائے محبت آمیز اور ہمدردانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔

## ۳۔ بچوں میں غصہ

غصہ کرنا ایک ایسی عادت ہے جس پر قابو پانے کی تربیت اگر ابتداء ہی سے بچے کو نہ دی جائے تو غصہ کرنا اس کا مستقل مزاج بن جاتا ہے۔ اس معاملہ میں بچے کی تربیت کرتے ہوئے ماں کو مندرجہ ذیل امور ملحوظ خاطر رکھنے چاہئیں۔

۱۔ بعض گھروں میں بچے کو چھیڑ چھیڑ کر اسے ناراض کیا جاتا ہے تاکہ چہرے پر ہویدا ہونے والے اثراتِ ناراضگی سے حظ اٹھایا جائے، یہ چیز حَظ اٹھانے والے کے لئے بھی اخلاقاً معیوب ہے اور بچے کی تربیتِ فاسدہ کا بھی سبب ہے اس لئے اس سے سخت پرہیز لازم ہے۔

۲۔ غصے کو "خاندانی فخر" بنا کر بچے کے سامنے پیش نہ کیا جائے ورنہ وہ اسے خوبی سمجھ بیٹھے گا۔

۳۔ اگر بچہ اپنی بات سمجھانے میں ناکام رہتا ہے اور جھنجھلا اٹھتا ہے تو ماں اور دیگر افرادِ خانہ کا یہ فرض ہے کہ وہ خود تحمل سے کام لیں۔

۴۔ بیماری کے زمانے میں بچے کی طبیعت چڑچڑی ہو جاتی ہے اسے غصہ زیادہ آتا ہے۔ اس کے مطالبات بڑھ جاتے ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ پورے نہیں کئے جا سکتے ان حالات میں یہ اور بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ زیادہ محبت، شفقت، نرمی اور تحمل سے پیش آیا جائے۔

۵۔ غصے کی حالت میں، بچے کی توجہ کو کسی دلچسپ مشغلے کی طرف موڑ دیجئے، غصہ ختم ہو جائے گا۔

۶۔ کوشش کیجئے کہ غصے کے مواقع کم سے کم پیش آئیں تاکہ بچے کے ناگواری اور تلخی کے جذبات کم سے کم حرکت میں آئیں۔

## ۴۔ بچوں میں خوف

بعض بچے ڈر جاتے ہیں۔ ہر وقت خوف ان پر چھایا رہتا ہے۔ اندھیرے سے ڈرنا عظیم الجثہ چیزوں سے ڈرنا۔ بعض خیالی یا وہمی چیزوں سے ڈرنا۔ بچوں کا ایک عام سا مسئلہ ہے۔ مائیں تربیتِ اطفال میں اگر مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھیں تو وہ بچوں کو

خوف سے نجات دلا سکتی ہیں۔

۱۔ بچہ، پیدائشی طور پر کسی چیز سے خوف نہیں کھاتا اسے وہ آئندہ زندگی میں اپنے ماحول سے سیکھتا ہے، جن اشیاء سے وہ واقف نہیں ہوتا یا جن اشیاء اور ہستیوں کو وہ اپنی قوت سے بالاتر گردانتا ہے بچہ ان سے خوف کھانے لگتا ہے اس لئے بچوں کو ان چیزوں کی حقیقت اگر سمجھا دی جائے جن سے وہ خوف کھاتا ہے تو اس کی لرزاں و ترساں رہنے کی کیفیت ختم ہو سکتی ہے مثلاً اندھیرے میں ڈرنے والے بچے کو ستاروں اور کہکشاؤں کی روشنی سے مانوس کر کے اور تاریکی میں گھڑی کے چمکنے والے ہندسوں اور سوئیوں کی مدد سے اس کا خوف دور کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ بچے کے سامنے خوف کا مظاہرہ کرنا، خود بچے کو خوف کی تربیت دینے کے مترادف ہو گا۔ اس لئے افراد خانہ کو اپنی گھبراہٹ اور خوف کو (کم از کم) بچے کے سامنے ضرور قابو میں رکھنا چاہیئے۔

۳۔ بچے کو بعض اوقات، مائیں خیالی یا وہمی ہستیوں سے ڈراتی ہیں اور بچہ خوف زدہ رہتا ہے اس سے پرہیز لازم ہے البتہ غیر مرئی ہستیوں میں سے صرف اللہ کی ذات ایسی ہے جس کے نافع اور ضار ہونے کا تصور بچے کے ذہن میں ابھارتے رہنا چاہیئے اور اسے اس بات کی تربیت دیتے رہنا چاہیئے کہ مسلمان اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ یہ چیز اسے صرف اللہ ہی سے خوف زدہ رکھے گی۔

۴۔ بلاوجہ بچے کو جھڑکنا، ڈانٹنا، ناراض ہونا اور ٹوکتے رہنا اس کے اندر خوف بٹھا دیتا ہے اس سے ماں اور دیگر اہل خانہ کو پرہیز کرنا چاہیئے۔

## ۵۔ جھوٹ کی عادت

بچے کا جھوٹ بولنا، موجودہ فاسد ماحول میں ایک سنگین مسئلہ ہے۔ بچہ ترکِ زُور پر آمادہ نہیں ہے والدین کو بچے کی یہ حالت بہت کھلتی ہے، وہ بچے کی اصلاح کی جو کوشش بھی کرتے ہیں اس میں ناکام رہتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ بچہ جھوٹ کا عادی کیسے ہو گیا۔ اس سوال پر جس قدر بھی غور کیا جائے یہی واضح ہوتا ہے کہ بچہ اس برائی کو

پیدائشی طور پر لیئے ہوئے اس دنیا میں نہیں آتا ہے اس نے یہ عادت بد اپنے ماحول سے اخذ کی ہے، بچے کا قریبی اور اولین ماحول وہی ہے جو گھر میں اسے میسر ہے اس لئے وہ گھر ہی سے یہ حرکت سیکھتا ہے مثلاً ایک پڑوسن کوئی چیز لینے کے لئے گھر میں آئی اہل خانہ نے اس خیال سے کہ پڑوسی کے ہاتھ میں آکر وہ چیز خراب ہو جائے گی۔ بستر کے نیچے چھپا دی اور اس سے یہ کہہ دیا کہ ___ "نہیں! وہ چیز تو اس وقت فلاں گھر میں ہے"۔ بچہ اس جھوٹ کو دیکھتا ہے اور اس حرکت سے مانوس ہو جاتا ہے ___ بچے نے دیکھا کہ اُس کے بڑے بھائی نے اس قیمتی کھلونے کو جو دو چار دن پہلے ہی خریدا گیا تھا توڑ دیا ہے والدہ نے بڑے بھائی سے پوچھا تو اس نے کوئی بہانہ گھڑ کر ماں کو مطمئن کر دیا اور اس کی ناراضگی سے بھی محفوظ رہ گیا۔ بچے نے اب محسوس کیا کہ جس "جھوٹ" سے وہ مانوس ہے وہ بعض اوقات ڈانٹ ڈپٹ، سرزنش اور سزا سے بھی محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے اور بڑا کامیاب ذریعہ ہے اس طرح بچہ پہلے جھوٹ کو دیکھتا ہے اس سے مانوس ہوتا ہے۔ پھر اسے دفع مضرت کا کارگر ہتھیار سمجھتا ہے تب وہ جلب منفعت کے لئے استعمال پر بھی اتر آتا ہے۔ اگر والدہ اور دیگر اہل خانہ بچے کے سامنے یوں جھوٹ کا عملاً مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تربیت کے اہتمام سے بے بہرہ اور لاشعور بھی ہیں تو جھوٹ بچے کا مستقل شیوہ بن جاتا ہے۔ تاہم بچے کو اس گناہ سے محفوظ رکھنے کے لئے ماں کو درج ذیل ہدایات پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

۱۔ بچے کو کبھی بھی عدم توجہی کا شکار نہ ہونے دیا جائے بچے کے "جھوٹ" کا یہی بڑا سبب ہوتا ہے۔

۲۔ بچے کے سامنے قطعاً جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ کبھی بھی جھوٹ نہ بولا جائے ظاہر ہے کہ جب بچے کے کان کبھی جھوٹ سے آشنا ہی نہ ہوں گے اس کے دل و دماغ کا تعارف ہمیشہ صداقت ہی سے ہوگا تو "جھوٹ" اس کے لئے اجنبی اور صداقت ایک جانی پہچانی "معروف" چیز ہوگی۔

۳۔ مذاق کے طور پر بھی جھوٹ نہ بولا جائے عموماً اسے اہمیت نہیں دی جاتی لیکن بچے کی تربیت کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے اس لئے اس سے سخت پرہیز لازم ہے۔

۴۔ بچے پر کبھی بدگمانی نہ کیجئے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ جب تک کہ آپ کو اس کے جھوٹ ہونے کا قطعی علم نہ ہو قطعی علم ہو جانے پر بھی اس کو دانشمندی اور حکمت سے جھوٹ کی برائی سمجھائی جائے تاکہ وہ خود بخود اسے ترک کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

۵۔ بچہ اگر جھوٹ بول رہا ہے مگر والدہ کو اس کے جھوٹ کا یقین نہیں ہے تو بچے کو خواہ مخواہ جھوٹا ثابت کرنے کے لئے جرح نہیں کرنی چاہیئے۔ جرح کے ردعمل میں بچہ اس برائی پر بضد ہو جاتا ہے جس سے والدہ اسے بچانا چاہتی ہے۔

## ۶۔ دوسرا بچہ بحیثیت شریک

ہمارے ہاں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ دوسرے بچے کی پیدائش پر، پہلے بچے کو بہت حد تک نظر انداز کر دیا جاتا ہے اہلِ خانہ کی توجہ کا مرکز نومولود بن جاتا ہے۔ سب اسے ہی گود میں لے رہے ہیں، چوم رہے ہیں، تھپک تھپا رہے ہیں۔ گدگدا رہے ہیں، بہلا رہے ہیں، اس کے رونے پر سب متوجہ ہو رہے ہیں، وہ پیشاب کر دیتا ہے تو تقریباً سبھی لوگ اس کے کپڑے بدلنے کو پہنچ جاتے ہیں سب ہی اس کی صحت اور دیکھ بھال کے لئے متردد ہوتے ہیں لیکن پہلا بچہ ہے کہ اب وہ کسی کے پاس جاتا ہے تو اس سے عدم اعتناء نہیں تو قلتِ اعتناء کا مظاہرہ ضرور ہوتا ہے وہ کسی کو کھیلنے کے لئے کہتا ہے تو اسے ٹال دیا جاتا ہے اسے بھوک محسوس ہوتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ "ذرا صبر کرو" "مُنّے کو دودھ پی لینے دو پھر تمہیں دودھ پلاتے ہیں۔" بچہ اہل خانہ کو دیکھتا ہے کہ تقریباً سب ہی کی طرف سے ایک سا رویہ ظاہر ہو رہا ہے۔

پھر بچہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ یہ سب کچھ اس نومولود کی بدولت ہے جس کی آمد پر اس کے حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ نتیجتاً وہ نومولود کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہی ناپسندیدگی آگے چل کر نفرت، حسد اور کینے میں بدل کر دیگر معاشرتی مسائل کو جنم دیتی ہے والدہ اگر چند باتوں کو ہمہ وقت ذہن میں رکھے تو وہ اس مسئلہ سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔

۔ دوسرے بچے کی پیدائش پر بھی پہلے بچے کو محبت، شفقت، ہمدردی اور توجہ کا پورا

حق ملنا چاہیئے اس سے اعتناء و توجہ میں کمی نہیں ہونی چاہیئے ورنہ وہ دوسرے بچے کو اپنا دشمن سمجھ لے گا۔

۲۔ اگر پہلا بچہ اپنے بچپن میں دوسرے بچے کی آمد پر آپ کی نازبرداریوں سے محروم رہ گیا تو وہ ساری عمر یہ تشنگی محسوس کرتا رہے گا۔

۳۔ آنے والے بچے کے لئے سابقہ بچے کے دل میں پہلے ہی سے محبت اور دلچسپی کے جذبات پیدا کر دیں تاکہ وہ خود بھی نومولود سے دلچسپی اور انس کا تعلق قائم کرے۔

یہ ہے ان فرائض و واجبات کی جھلک جو بیوی اور ماں ہونے کی حیثیت سے ایک خاتونِ خانہ کو گھر کی چار دیواری میں سرانجام دینے ہوتے ہیں۔ یہ ہیں وہ عظیم ذمہ داریاں جو عورت کو "قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ" کے زیرِ امتثال ادا کرنی پڑتی ہیں۔ شوہر کی اطاعت، گھربار کی حفاظت، شوہر اور خانۂ شوہر سے متعلقہ ہر چیز اور ہر امر کی نگہداشت، بچوں کی ذہنی، جسمانی، طبی، اخلاقی اور دینی تربیت کا فریضہ ان سب فرائض و واجبات پر توجہ کیجیئے ان میں سے ہر فریضہ عورت کی ہمہ وقتی توجہ کا طالب ہے۔ ہر ذمہ داری خاتونِ خانہ کے ہر آن چوکس، محتاط اور حاضر دماغ رہنے کا تقاضا کرتی ہے، ہر واجب اس کے ہمہ وقت التفات و توجہ کا مقتضی ہے۔

گھر کی دیکھ بھال، تدبیرِ امورِ خانہ اور پرورش و تربیتِ اطفال، عورت کے ایسے فرائض ہیں کہ اگر وہ فرض شناسی اور مستعدی کے ساتھ انہیں سرانجام دیں تو اسے سر کھجانے کی فرصت نہ ملے کجا یہ کہ وہ بیرونِ خانہ سرگرمیوں میں منہمک ہو، جناب پرویز صاحب رقمطراز ہیں۔

"ایک فرض شناس ماں کے لئے، ایک بچے کی پرورش، تعلیم اور تربیت کا کام اتنا ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی دوسری طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔"

(طاہرہ کے نام ص ۱۸۳)

محترم عثمانی صاحب، عورت کی درونِ خانہ مصروفیات کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

"انہیں بچوں کی نگہداشت، پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے وہ اکتساب رزق کے جھمیلوں کے لئے وقت نہیں نکال سکتیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۸)

لیکن جب ایک فرض شناس ماں اور اطاعت شعار بیوی کی حیثیت سے تدبیر امورِ منزل اور بچوں کی پرورش و تربیت کے پیشِ نظر، عورت کو وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کا قرآنی حکم سنا کر انہیں وقار سے گھروں میں ٹک کر اپنے فرائض کی بجا آوری کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے تو اس پر عملی جدوجہد سے "بیگانہ" اور "عضوِ معطل" ہونے کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ اسے "زینتِ خانہ بننے والی ناکارہ اور بے عمل" خواتین قرار دیا جاتا ہے۔

"...عورت کو محض تفریحِ طبع کا ایک کھلونا اور عمائدینِ ملت کی حرم سراؤں کی زینت و آرائش بنا کر انہیں عملی جدوجہد سے بالکل بیگانہ اور عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۱۱)

کون سی عملی جدوجہد؟

گھر کی چار دیواری والی؟ جو تدبیر امورِ خانہ اور پرورش و تربیت اطفال سے تعلق رکھتی ہے؟ وہ تو عورت کا فطری وظیفہ ہے اس سے کون روکتا ہے۔

بیرونِ خانہ کی جدوجہد؟ جو مردوں کے میدانِ عمل سے تعلق رکھتی ہو؟ تو اس "عملی جدوجہد" سے خود قرآن ہی عورتوں کو یہ کہہ کر الگ کر دیتا ہے کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (اپنے گھروں میں وقار سے ٹکی رہو)۔ پھر یہ "عملی جدوجہد سے بیگانہ" ہونے اور "عضوِ معطل" ہونے کی پھبتی کیسی؟

اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ

"زینتِ خانہ بننے والی ناکارہ اور بے عمل خواتین کی گود میں جو نسل پروان چڑھے گی اس سے آپ خالد بن ولید، عمرو بن العاص، سعد بن ابی وقاص، ابو عبیدہ ابن الجراح، عکرمہ ابن ابی جہل، یزید ابن ابی سفیان، محمد بن قاسم طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر اور قتیبہ بن مسلم باہلی جیسے جنرل اور کمانڈر

پیدا نہیں کرسکتے"۔ (فقہ القرآن ج ۳ ص۲۱)

"زینت خانہ" کی پھبتی بھی خوب رہی گویا اسلامی معاشرت میں عورت کو گھر میں گڑیا بنا کر رکھا جائے گا۔ گھر کا نظم و نسق چلانا، امور خانہ داری کو انجام دینا بچوں کو پالنا پوسنا، ان کی پرورش و تربیت کرنا، ان کی اسلامی نہج پر نشو و نما کرنا اور اخلاقی اور دینی روایات کے مطابق ان کی سیرت سازی کا کام کرنا۔ عورت کے وہ فرائض ہیں جنہیں اگر صحیح طریقہ سے انجام دیا جائے تو اس پر کم از کم وہ شخص "زینت خانہ" کی پھبتی چست نہیں کرسکتا جو تہذیب مغرب کی بجائے، قرآنی تہذیب کا علمبردار ہو۔

یقیناً خالد بن ولید ----- اور ----- قُتَیبَہ بن مسلم باہلی جیسے جنرل اور کمانڈر" ناکارہ اور بے عمل" خواتین کی گودوں میں پروان نہیں چڑھے تھے، وہ ان ماؤں کی آغوش میں پلے تھے جن کے عمل اور کارکردگی کا دائرہ قرآن نے خانگی چار دیواری تک سمیٹ دیا تھا۔ یہ خواتین اگرچہ نیزے، بھالے اور تلواریں نہ اٹھا سکتی تھیں مگر ایسے مجاہدین کی مائیں بننے کی سعادت ان کے نصیب میں تھی جن کی نوک شمشیر نے نئی دنیا تعمیر کرڈالی۔ یہ خواتین اگرچہ مردانہ کارگاہوں کی جانگسل اور مشقت طلب امور انجام نہ دے سکتی تھیں، مگر گھر کی درس گاہ میں اپنے بچوں کو جہانبانی، جہانداری اور جہانگیری کی تعلیم و تربیت دینا ان کا فرضِ منصبی تھا۔ یہ خواتین، عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ کی حکومت میں (جو کسی صنف بشر کے حقوق کی سالب نہیں تھی)۔ اگرچہ قاضی، جج، گورنر، محصل، عامل یا خلیفہ کے منصب[۱] پر فائز نہ تھیں، مگر ان مناصب پر متمکن ہونے والے دنیا میں عدل و انصاف کے علمبرداروں کو جنم دینا اور ان کی تربیت اور رہنمائی کرنا، انہی خواتین کا مرہونِ منت تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ جو کچھ بھی تھے وہ ان ماؤں کی تربیت کا صلہ تھے جو گھر کی چار دیواری میں انہیں تعلیم و تربیت دیتی تھیں۔ عورت کے گھریلو فرائض جن میں تربیتِ اطفال بھی شامل ہے اس قدر اہم اور توجہ طلب ہیں کہ اگر وہ کماحقہ انہیں ادا کرے تو اسے سر کھجانے کی فرصت ہی نہ ملے کجا یہ کہ وہ بیرون خانہ امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی بابت

---

[۱] رہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جنگ جمل میں قیادت کا مسئلہ تو اس پر بحث آگے آرہی ہے۔

کچھ سوچیے!

عورت کے ان فرائض و واجبات کا شعور، ان خواتین کو کیوں کر ہو سکتا ہے جو بچے کے لئے بازار سے ڈبے کا دودھ منگوا لیتی ہیں۔ جاہل، اجڈ اور غیر مہذب آیا کو بچہ پالنے کے لئے ملازم رکھ لیتی ہیں اور تعلیم کے لئے انہیں نرسری سکول میں بھیج دیتی ہیں اور خود یہ کہہ کر کلب کی راہ لیتی ہیں کہ ـــــ "کیا کیا جائے، بیکار بیٹھے وقت نہیں کٹتا" یا پھر اپوا کی ممبر بن کر خواتین کی معاشرتی پستی اور زبوں حالی پر آنسو بہانے اور لیکچر دینے کا فریضہ سنبھال لیتی ہیں، جس کے نتیجے میں "مادر وطن" کا اعزاز ان خواتین کو حاصل ہو جاتا ہے جو خود اپنے بچوں کی مائیں نہیں بن پاتیں۔

ہمارے دور کے متجددین و مستغربین کی یہ ستم ظریفی بھی قابل دید اور قابل داد ہے کہ ایک طرف وہ عورت کے بحیثیت ماں تربیتِ اطفال کے فریضے کو اس قدر ہمہ گیر قرار دیتے ہیں کہ یہ فریضہ اسے کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دیتا اور دوسری طرف ہمارے یہ پروردگارانِ نورِ علم جب خاتونِ خانہ کو گھر کی اس اولین تربیت گاہ میں، تربیتِ صبیان اور پرورش و تعلیمِ اطفال میں منہمک دیکھتے ہیں تو اس پر "قید خانہ" کی پھبتی چست کرتے ہیں۔

> "عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دینا ایک سزا ہے جسے قرآن ان عورتوں کے لئے تجویز کرتا ہے جن سے کچھ بیحیائی کی بدعنوانیاں مترشح ہو رہی ہوں۔" (طاہرہ کے نام ص ۱۹۷)

گویا عورت کا اپنے فطری وظائف کی بجا آوری کے لئے اپنے گھر کی چار دیواری میں وقار سے ٹکے رہنا اور کسی جرم و گناہ کے باعث گھر میں تعزیراً بند کیا جانا ایک ہی معنیٰ رکھتا ہے۔ وزیر جیل خانہ جات کا کسی کمرۂ جیل میں بغرض معاینہ جانا اور ایک مجرم کا بغرض عقوبت وہاں جانا مساوی درجہ رکھتا ہے۔ وزیر اعظم کا حاکم مختار بن کر پھانسی کی کوٹھڑی میں جانا اور اس کا ارتکابِ قتل کے نتیجے میں "اسیرِ اعظم" بن کر محبوس کیا جانا ایک سی اہمیت کا حامل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت کو کسب معاش اور دیگر بیرون خانہ مشاغل سے فارغ کر کے اس کے دائرۂ عمل کو گھر کی دنیا تک سمیٹ دینا محض اس عظیم مقصد کے پیش نظر ہے کہ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ، تدبیرِ منزل اور تربیت اطفال کا وظیفہ بجا لائے۔ یہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جو عورت کی ہمہ وقتی توجہ کی محتاج ہے، مستقبل کی نسل جن بنیادوں پر نشوونما پاتی ہے وہ بنیادیں، بچے کی ابتدائی عمر میں ماں ہی کے ہاتھوں رکھی جاتی ہیں، بچے نے اپنی انتہائی عمر میں جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ دراصل اسی عرصۂ زندگی میں بن چکتا ہے تعمیر سیرت کی بعد کی پوری عمارت انہی بنیادی خطوط پہ استوار ہوتی ہے جو ماں نے اس کے لئے طے کئے ہوتے ہیں۔ جو لوگ، عورت کے ان گھریلو فرائض کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ترقی کی معراج یہی سمجھتے ہیں کہ عورت، کارخانوں، فیکٹریوں صنعت گاہوں اور دیگر کارگاہوں میں، مرد کے شانہ بشانہ کام کرے، وہ عورت کی طبعی کمزوریوں اور اس کے فطری فرائض وواجبات سے بھی ناآشنا ہیں اور اسلامی معاشرت کے مزاج اور رنگ سے بھی لاعلم ہیں۔ بلکہ وہ "ترقی" کے حقیقی مفہوم سے بھی جاہل ہیں، ان جاہلوں کے نزدیک "ترقی" یہ ہے کہ "تربیت اطفال" کا کام حقیقی ماؤں کے دستِ شفقت سے نکال کر، کرائے کی مصنوعی ماؤں کے سپرد کر ڈالا جائے اور خواتین خانہ کو گھروں سے نکال کر، مردانہ کارگاہوں کی طرف ہانک دیا جائے تاکہ "پیداواری ہاتھ" دوگنے ہو جائیں، اِنْ هِيَ اِلَّا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (النجم)۔

فسادِ فکر ونظر کی اس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی اور مثال ہو۔

TRUEMASLAK @ INBOX. COM

باب ۴

# حجابِ نسواں

عورت کے فطری فرائض وواجبات کی نوعیت ایسی ہے کہ اسے بیرون خانہ سرگرمیوں سے دستکش ہو کر اپنی پوری توجہ تدبیر منزل اور تربیت اطفال پہ مبذول رکھنی پڑتی ہے۔ قرآن نے اسی لئے اس کے دائرۂ عمل کو گھر کی چار دیواری تک محدود رکھا ہے، پردہ جس میں عورت کا اپنی زیب وزینت، آرائش وزیبائش اور بناؤ سنگار کے ساتھ چہرے کو محجوب ومستور رکھنا بھی شامل ہے، اسلامی معاشرت میں مرد اور عورت کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے متجددین ومستغربین جو مغربی معاشرت کو آئیڈیل معاشرت گردانتے ہیں، پردے پر بڑے برہم ہیں۔ جناب پرویز صاحب رقمطراز ہیں۔

> "عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر دینا جرمِ فحش کی سزا ہے۔ لہٰذا ہمارا مروجہ پردہ جس میں عورتوں کو گھروں کے اندر قید رکھا جاتا ہے، نہ صرف منشائے قرآنی کے خلاف ہے بلکہ جرم ہے کیونکہ کسی بیگناہ کا حبسِ بیجا عرفاً وشرعاً جرم ہے۔" (طاہرہ کے نام ص ۱۹۸)

جناب پرویز صاحب اگر تھوڑی سی مزید ذہانت کا مظاہرہ فرماتے تو وہ مسجد میں داخل ہونے کو بھی "حبسِ بے جا" قرار دے دیتے، کیونکہ قرآن نے ایک مقام پر تحبسونهما من بعد الصلوٰة (تم نماز کے بعد انہیں روک رکھو) کے الفاظ میں گواہوں کو "محبوس کر ڈالنے" ہی کا حکم دیا ہے جبکہ خواتین کو اپنے دائرۂ کار میں رہنے کا حکم وَقَرْنَ

فِی بُیُوتِکُنَّ ـــــــ (تم اپنے گھروں میں وقار سے ٹکی رہو) کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کسی کارگاہ میں کسی کو اس کے فرائض کی بجا آوری کے لئے متعین کر دینا اور اسے کسی جرم کی بناء پر وہیں محبوس کر دینا، دونوں جداجدا باتیں ہیں، جن میں سے کسی ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق ہے۔ لیکن ہمارے یہ مہربان ایک مقام کی آیات کو اس کے سیاق وسباق سے اکھاڑ کر، دوسرے محل کی آیات سے بے تکلف نتھی کر دیتے ہیں۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

محترم عثمانی صاحب مردوں کو دیئے جانے والے غضِ بصر کے قرآنی حکم پہ رقمطراز ہیں کہ

"نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم مردوں کو اسی لئے تو دیا گیا ہے کہ غیر محرم عورتوں پہ ان کی نگاہ نہ پڑے، اگر عورتیں مستقلاً سارے بدن کو چھپا کر نکلیں کہ نہ ان کا چہرہ کھلا ہوا ور نہ ہاتھ پاؤں، وہ ہر طرح ڈھکی چھپی ہوں تو مردوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دینے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے وہ اپنی نگاہیں اوپر بھی رکھیں تو انہیں کیا نظر آسکتا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص۲۱۵)

مولانا مودودی صاحب اس اشکال و اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو کھلے منہ پھرنے کی عام اجازت تھی، تبھی تو غضِ بصر کا حکم دیا گیا ورنہ اگر چہرے کا پردہ رائج کیا گیا ہوتا تو نظر بچانے یا نہ بچانے کا کیا سوال، یہ استدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے اور واقعے کے اعتبار سے بھی، عقلی حیثیت سے یہ اس لئے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پہ رائج ہو جانے کے باوجود ایسے مواقع اچانک پیش آسکتے ہیں جبکہ اچانک کسی مرد اور عورت کا آمنا سامنا ہو جائے اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے ـــــ پھر مسلمان عورتوں میں پردہ عام طور پہ رائج ہو جانے

کے باوجود بہرحال غیر مسلم عورتیں تو بے پردہ ہی رہیں گی لہٰذا محض غضِ بصر کا حکم، اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مستلزم ہے اور واقعے کے اعتبار سے یہ اس لئے غلط ہے کہ سورۂ احزاب میں احکامِ حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا تھا اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا۔" (تفہیم القرآن ج ۳ صلا۳۸)

مولانا مودودی مرحوم کی اس عبارت سے اگرچہ اس استدلال کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے جو محترم عثمانی صاحب نے کیا ہے لیکن بہرحال اس عبارت میں مودودی صاحب نے اس بنیاد کو تو تسلیم کر ہی لیا ہے کہ آیت میں غض بصر کا حکم خارج از بیت معاشرت سے متعلق ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بنیاد ہی غلط ہے آیت کا تعلق ہرگز ہرگز بیرونِ خانہ معاشرت سے نہیں ہے بلکہ درونِ خانہ معاشرت سے ہے۔ غیر مسلم خواتین کے عدم حجاب کی صورت میں تو اس حکم کو گھر سے باہر کی زندگی سے مربوط کیا جاسکتا ہے لیکن مسلم خواتین کے معاملے میں اسے کسی طرح بھی بیرونِ خانہ معاشرت سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ آیت کا سیاق وسباق اسے قطعی طور پر خانگی معاشرت سے وابستہ کر دیتا ہے۔ قرآن اٹھائیے تو آپ کو سورۂ نور میں خانگی معاشرت سے متعلق احکام کا آغاز آیت ۲۷ سے ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ ان آیات کو غضِ بصر والی آیت تک ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غض بصر کا حکم باقی آیات کے احکام کی طرح خانگی معاشرت ہی سے متعلق ہے۔ (۱)

ان آیات پر ایک نظر ڈالئے۔

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ | اے لوگو، جو ایمان لائے ہو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو، اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو |

(۱) یہ مصنف کی ذاتی رائے ہے۔ (ادارہ)

| | |
|---|---|
| لَّکُمْ ۚ وَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْکٰى لَکُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ○ لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّکُمْ ۚ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَکْتُمُوْنَ ○ (۲۴ / ۲۷-۲۹) | اجازت نہ دیدی جائے اور اگر تم سے واپس ہو جانے کو کہا جائے تو واپس ہو جاؤ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے البتہ تمہارے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے یا کام کی کوئی چیز ہو تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو سب کی اللہ کو خبر ہے۔ |

ان آیات میں جو احکام مذکور ہیں وہ کسی طرح بھی بیرون خانہ معاشرت سے وابستہ قرار نہیں دیئے جا سکتے ہیں۔ ٹھیک انہی احکام کے ساتھ مسلم خواتین و حضرات کو یہ احکام بھی دیئے گئے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۚ ذٰلِکَ اَزْکٰى لَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ○ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ | اے نبی، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظر بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ اور اے نبی! مومن عورتوں سے کہدو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں وہ اپنا بناؤ سنگار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، |

بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۚ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

(۲۴ / ۳۰-۳۱)

بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے لونڈی غلام، وہ زیر دست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا لوگوں کو علم ہو جائے اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو توقع ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

غضِ بصر سے متعلقہ ان دونوں آیات کو غور سے پڑھیئے۔ کیا کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی ایسا ملتا ہے جو ان احکام کو بیرونِ خانہ معاشرت سے متعلق قرار دیتا ہو؟ کیا بیویوں کے شوہر ان کے بیٹے، ان کے باپ، ان کے مملوک اور دیگر اقربا (جن کا نام آیت میں لیا گیا ہے) خواتین کو گھر میں ملنے کی بجائے کلبوں، دفتروں، رقص گاہوں اور سرود گاہوں میں ملا کرتے ہیں کہ احکام آیات کو خارج از بیت معاشرت سے وابستہ قرار دیا جائے، ہمارے نزدیک غضِ بصر کے ان احکام کو بیرونِ خانہ معاشرت سے متعلق قرار نہیں دیا جا سکتا۔[1]

---

[1] ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ جب ان آیات میں غضِ بصر کا حکم اندرونِ خانہ معاشرت سے ہے تو پھر بیرونِ خانہ معاشرت کا حکم کہاں سے لیا جائے گا تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قرآن بنصِ صریح 'ازواج نبوی' بنات رسول اور خواتین امت کو 'يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ' کے الفاظ میں نقاب و حجاب کا حکم دیتا ہے اور دوسرا یہ کہ جب قرآن مجید، اقربا، کی موجودگی میں خانگی معاشرت میں غضِ بصر کا حکم دونوں اصناف بشر کو دیتا ہے تو بیرونِ خانہ معاشرت میں غیر مسلم اور غیر محرم خواتین کی موجودگی میں اس حکم کے مخاطب تمام مسلمان بدرجہ اولیٰ ہوں گے۔

## احکامِ سورۂ نور

بہرحال سورۂ نور کی ان آیات سے جو زیر بحث ہیں اور جن کا تعلق گھر کے اندر کے پردے سے ہے، مندرجہ ذیل احکام نکلتے ہیں۔

۱۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے گھر میں داخل نہیں ہو سکتا الا یہ کہ

(ا) اہلِ خانہ سے اس کی جان پہچان ہو وہ ایک دوسرے سے موانست رکھتے ہوں، آنے والا اور صاحبِ خانہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ ہوں (حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا) یہ الفاظ نووارد کی طرف سے طلبِ اذن کے بھی مقتضی ہیں۔

(ب) وہ اہل خانہ کو سلام کہہ کر داخل ہونے کی پیشگی اجازت لے لے جو جوابِ سلام کی صورت میں ہوگی (وَتُسَلِّمُوْا عَلٰی اَهْلِهَا)

۲۔ اگر صاحب خانہ گھر پر موجود نہ ہو تو بھی بلا اجازت داخل نہیں ہونا چاہیئے (فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰی یُؤْذَنَ لَكُمْ) اور اگر وہ موجود ہو اور اپنی کسی مصروفیت کی بناء پر واپس لوٹ جانے کے لئے کہہ دے تو اسے برا محسوس کئے بغیر واپس لوٹ جانا چاہیئے۔ (وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا)

۳۔ غیر مسکونہ گھروں میں، جن میں تمہارے فائدے یا کام کی چیزیں موجود ہوں، اگر تمہارا جانا ناگزیر ہو تو داخل ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

۴۔ گھر میں داخل ہونے والے شخص پر غضِ بصر اور شرمگاہ کی حفاظت لازم ہے اسی دوران خواتینِ خانہ پر درج ذیل ہدایات کی پیروی لازم ہوگی۔

(ا) اپنی نگاہوں کو بچائے رکھیں اور شرم و حیاء کی جگہوں کی حفاظت کریں۔

(ب) اپنے کپڑوں کو اپنی زینت سمیت اس طرح سنبھال کر اور سمیٹا کر رکھیں کہ ان کا بناؤ سنگار ظاہر نہ ہونے پائے اِلّا یہ کہ کوئی چیز از خود، ان کے ارادہ کے بغیر ظاہر ہو جائے۔

(ج) اپنے سینوں کو اوڑھنیوں سے ڈھانپ کر رکھیں۔

(د) چلتے پھرتے ہوئے ایسا انداز نہ اختیار کریں کہ زیور و زینت (مثلاً پازیب وغیرہ

اپنی جھنکار سے) آشکارا ہوجائیں اس لئے کہ عورت کی بول چال اور اس کے لب ولہجے کی طرح اس کی چال ڈھال بھی، مریض دل کے لئے باعث فتنہ ہوتی ہے ؎

نہ تنہا عشق از گفتار خیزد

بسا ایں آتش از رفتار خیزد

اسلام یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ مسلم گھروں میں بد چلنی، بد نگاہی اور بے حیائی راہ پائے اس لئے معاشرتی زندگی کو خوشگوار اور آسان رکھنے کے لئے ایک طرف وہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ اہل خانہ کے متعلقین کو گھروں میں آنے جانے اور ملنے جلنے کی آزادی دی جائے اور دوسری طرف اخلاقی مفاسد کا دروازہ بند کرنے کے لئے وہ یہ بھی ضروری گردانتا ہے کہ ان پر کچھ پابندیاں عائد کی جائیں۔ تاکہ گھروں کی چاردیواریاں اخلاقی رذائل و مفاسد سے پاک رہ سکیں۔ اسی لئے اسلام نے ان آیات میں جو احکام دیئے ہیں ان میں ان دونوں پہلوؤں میں توازن و اعتدال کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

## اِلَّا مَا ظَهَرَ کا استثناء

سورۂ نور کی زیر بحث آیات میں ایک استثنائی جملہ محتاجِ وضاحت ہے قرآن یہ کہتا ہے کہ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (خواتین اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے) اس آیت میں اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کے الفاظ سے جو استثناء مذکور ہے بعض لوگوں نے اس سے چہرے اور ہاتھوں کا استثناء مراد لیا ہے، جناب عثمانی صاحب بھی ان لوگوں میں شامل ہیں لفظ يُبْدِيْ باب افعال کا مضارع ہے جس کا معنی "کھول دینا" یا "ظاہر کر دینا" ہے۔ جبکہ ظَهَرَ ثلاثی مجرد سے ماضی کا صیغہ ہے جس کا معنی "ظاہر ہوا" ہے سیدھی سی بات ہے کہ قرآن، عورتوں کو اپنی زینت "ظاہر کر دینے" سے روک رہا ہے اور اس زینت کو مستثنیٰ کر رہا ہے جو خود "ظاہر ہوئی" ہے "ظاہر کر دینے" اور "ظاہر ہو جانے" میں جو کھلا کھلا فرق پایا جاتا ہے اسے صرف وہی شخص نظر انداز کر سکتا ہے جو خوفِ خدا سے عاری ہو کر تہذیب مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر مطلب جُو یانہ ذہنیت سے قرآن

کا مطالعہ کرتا ہے۔ آیت خواتین کو جس چیز سے منع کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کو (خواہ وہ مجرد جسمانی حسن و جمال ہو یا اس پر مستزاد بناؤ سنگار ہو) ظاہر کریں اور جس چیز کو قرآن مستثنیٰ کر رہا ہے وہ 'وہ زینت ہے جو خواتین کے ارادے کے بغیر خود ظاہر ہو جائے (مثلاً ہوا کے زور سے چادر کا پلو اٹھ گیا اور زینت ظاہر ہو گئی یا وہ بڑی اوڑھنی جو کپڑوں کے اوپر اوڑھی جاتی ہے کیونکہ اس کا چھپانا تو بہرحال ممکن نہیں ہے)۔ بہرحال اس استثناء سے چہرے اور ہاتھوں کا استثناء مراد لینا قطعی غلط چیز ہے، سلف میں سے بھی بعض لوگوں نے اگرچہ یہی استثناء سمجھا ہے لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے جو حدودِ ستر اور حدود حجاب میں امتیاز نہ کرنے کی وجہ سے لاحق ہوئی ہے۔ محترم عثمانی صاحب، تہذیبِ مغرب کی تقلید میں جان بوجھ کر اگر ایسا نہیں کر رہے ہیں تو وہ بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اسی لئے وہ آنکھیں بند کر کے "حدود ستر" سے متعلقہ سلف کی عبارات نقل کرتے ہیں اور ان کو "حدود حجاب" سے متعلقہ احکام کی دلیل بناتے ہیں۔ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

> "علامہ ابن رشدؒ قرطبی فرماتے ہیں کہ
>
> عورت میں ستر کی حد، تو اکثر علماء کا یہی خیال ہے کہ چہرے اور دونوں ہاتھوں کے علاوہ عورت کا تمام بدن ستر (چھپانے کی چیز) ہے امام ابو حنیفہ کا خیال ہے کہ اس کے قدم بھی یعنی پاؤں بھی ستر نہیں ہیں۔ ابو بکر ابن عبدالرحمان اور امام احمد بن حنبل کی رائے میں عورت سب کی سب ستر ہے۔
>
> ("فقہ القرآن" ج ۳ ص ۳۲۷ بحوالہ "بدایۃ المجتہد" ج ۱ ص ۱۱۵")

علامہ ناصر الدین البانی کی ایک کتاب سے عثمانی صاحب نے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں یہ الفاظ بھی شامل ہیں۔

> "ابن جریر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ اس استثناء سے مراد' چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں، چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ اس بارے میں صحت سے قریب تر قول انہی حضرات کا ہے جنہوں نے اس سے چہرے اور دونوں ہاتھوں

کو مراد لیا ہے جس میں سرمہ انگوٹھی کنگن اور خضاب سب داخل ہیں اور ہم نے اسے صحیح تر قول پوری امت کے اس اجماع کی وجہ سے قرار دیا ہے کہ ہر صلوٰۃ پڑھنے والے پر اپنے ستر کو چھپانا ضروری ہے ستر کو چھپائے بغیر صلوٰۃ نہیں ہوتی۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۱۷)

"حدود ستر" سے متعلق ایسے اقتباسات کو نقل کر کے محترم عثمانی صاحب "حدود حجاب" کی بحث کے آخر میں اپنا فیصلہ ان الفاظ میں ثبت فرماتے ہیں کہ "ہم بھی ان فقہائے کرام کے قول کو ترجیح دیتے ہیں جو چہرہ، ہاتھوں اور پیروں کے ستر ہونے کے قائل نہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۲۸)

محترم عثمانی صاحب کا اپنا یہ اقتباس اور ابن رشد اور ناصر الدین البانی کے اقتباسات صرف "حدود ستر" سے بحث کرتے ہیں جن کو "احکامِ حجاب" سے کوئی واسطہ نہیں ہے، لیکن محض غلط فہمی کی بناء پر "حدود ستر" اور "حدود حجاب" کو خلط مبحث کا شکار بنایا جا رہا ہے اور حجاب و نقاب کو جسے اسلامی شریعت نے عورتوں کے لباس کا ایک جزو بنا دیا ہے محض اس دلیل کی بناء پر رد کیا جا رہا ہے کہ منہ اور ہاتھ، عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں حالانکہ "ستر" اور "حجاب" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ "ستر" تو وہ چیز ہے جسے عورت اپنے محرم رشتہ داروں مثلاً باپ، دادا، ماموں، بیٹا اور بھائی وغیرہ کے سامنے بھی نہیں کھول سکتی۔ لیکن حجاب و نقاب کو ان محرم اعزاء و اقارب کے سامنے کھولا جا سکتا ہے۔ پس حجاب، ستر سے ایک زائد چیز ہے، جہاں ستر کی حدود ختم ہوتی ہیں وہاں سے حجاب کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ حجاب و نقاب کو خواتین اور تمام غیر محرم کے درمیان حد فاصل قرار دیا گیا ہے۔

## آیت سورۃ احزاب

اب ہم ان آیات کو زیر بحث لاتے ہیں جو سورۃ احزاب میں واقع ہیں یاد رہے کہ یہ آیات، سورۃ نور کی آیات سے قبل نازل ہو چکی تھیں، محترم عثمانی صاحب نے سورۃ احزاب

کی انہی آیات سے "شرعی پردہ" کے زیرِ عنوان اپنی بحث کا آغاز فرمایا ہے۔

يَانِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِي بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ (۳۳ / ۳۲-۳۳)

نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص، لالچ میں پڑ جائے۔ بلکہ صاف اور سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی سے گندگی کو دور کر دے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔

اس آیت کے ضمن میں محترم عثمانی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اسے ہم افہام و تفہیم کی خاطر تین حصوں میں (خود انہیں کے الفاظ میں) پیش کئے دیتے ہیں۔

"(۱) اس آیت کریمہ میں خطاب ازواج مطہرات کو ہے۔ (۲) اور بات شروع ہی ان الفاظ سے ہوئی ہے کہ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو) جس سے صراحتاً ثابت ہے کہ ان آیات کریمہ میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ عام مسلمان خواتین کے لئے نہیں ہیں بلکہ ازواج مطہرات کے لئے خصوصی احکام ہیں۔ (۳) لیکن اگر عام مسلمان اور ہمارے علماء کرام اپنے آپ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنی ازواج کو ازواج مطہرات کا درجہ دینا چاہتے ہیں تو اس کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں وہ شوق سے ایسا کریں لیکن ہم ان احکام کو عام مسلمان خواتین کے لئے شرعی احکام نہیں کہہ سکتے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۰۶)

قرآنی الفاظ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو)

کا کیا معنیٰ و مفہوم ہے؟ اسے ہم بعد میں بیان کریں گے۔ فی الحال تو یہ دیکھئے کہ آخر "ازواج مطہرات" میں وہ کیا "عیب" اور "نقص" تھا جس کی بناء پر انہیں یہ اخلاقی ہدایات دی گئیں؟ کیا ان ہدایات و احکام کی عام خواتینِ اسلام کو ضرورت نہیں ہے؟ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ازواج مطہرات کے علاوہ باقی خواتین نرم و نازک اور شیریں لہجے میں گفتگو کرکے دل کے مریضوں میں طمع و رغبت کی چنگاریاں سلگائیں؟ عام عورتیں، لوگوں سے نیکی اور بھلائی کی بات نہ کیا کریں؟ ازواج مطہرات تو گھروں میں وقار سے رہیں مگر عام مستورات، ساق و سینہ کی عریانی کے ساتھ قدیم جاہلیت کے سے بناؤ سنگار دکھاتی پھریں؟ کیا واقعی اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ ازواج مطہرات کے علاوہ باقی خواتین اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ اور اطاعتِ خدا و رسول سے دستکش ہو جائیں؟ کیا فی الواقع منشائے ایزدی یہی ہے کہ بیگماتِ نبویؐ کو تو رجس و پلیدی سے پاک کیا جائے اور باقی خواتینِ اسلام کو رجس میں آلودہ اور ناپاکی و پلیدی میں لتھڑا ہوا رہنے دیا جائے؟ اگر ایسا نہیں ہے (اور اللہ نبیؐ کی بیویوںؓ کے علاوہ باقی خواتین کو بھی ان صفات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے جن کا حکم ازواج مطہرات کو دیا گیا ہے) تو پھر ان احکام کو ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص کرنے کا جواز کیا ہے؟

اور یہ بھی کیا خوب بات کہی، شاباش!

؎ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

"عام خواتین کو ان احکام کا مخاطب قرار دینا انہیں ازواج مطہرات کا درجہ دینا ہے۔"

؎ پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی
جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

حقیقت یہ ہے کہ محترم عثمانی صاحب کی یہ مضحکہ خیز دلیل ان کے مقام و مرتبہ سے بہت فروتر ہے جسے ممکن ہے کہ وہ اپنے لئے شایانِ شان سمجھتے ہوں۔ اس دلیل سے تو یہ

کہہ کر سارے قرآن سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے کہ یَآیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد صرف صحابہ کرامؓ ہیں۔ ان کو جو احکام دیئے گئے ہیں وہ انہی کے ساتھ خاص ہیں ان احکام کو دوسرے لوگوں کے لئے عام کرنا، صحابہ کرامؓ کے مقام و مرتبہ پر فائز ہونے کے مترادف ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ قرآن نے ازواجِ مطہرات کو لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو) جو فرمایا ہے تو اس کا حقیقی مفہوم و مطلب کیا ہے؟ اس کا جواب خود عثمانی صاحب ہی کی یہ عبارت پیش کر رہی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعدد ازواج کی مصلحتوں کو بیان کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ

"ان کے ذریعہ سے (یعنی ازواج مطہرات کے ذریعہ سے) اسلامی معاشرہ کی مستورات کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام فرمانا تھا۔ کیونکہ عورتوں کی تعلیم و تربیت عورتوں ہی کے ذریعے سے بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۲ ص ۳۱۶)

ایک اور مقام پر محترم عثمانی صاحب رقمطراز ہیں۔

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم و تربیت کا ایک مرکز قائم فرمایا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں عام صحابہ کو تعلیم و تربیت فرماتے تھے تو ازواج مطہرات مسلم خواتین کو تعلیم و تربیت فرماتی تھیں۔ پہلے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کرتی تھیں اور پھر اسے آگے بڑھاتی تھیں جن مسائل کے متعلق انہیں علم نہیں ہوتا تھا ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر مسلمان خواتین کو بتلاتی تھیں مستورات کے بے شمار مسائل ہوتے ہیں جنہیں وہ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں پوچھ سکتی تھیں۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۲۲-۳۲۱)

واقعی حق تعالیٰ نے بجا فرمایا کہ ازواج مطہراتؓ عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں کیونکہ وہ خواتین اسلام کے لئے اسوۂ حسنہ ہیں، عام مستورات ان کی اقتدار کرنے والی ہیں

اور ازواجِ مطہرات ؓ ان کی مقتدا و پیشوا ہستیاں ہیں۔ اس لئے ازواج مطہرات واقعی عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں۔ اب جبکہ امہات المؤمنین ؓ اہل ایمان خواتین کے لئے نمونۂ اطاعت وانقیاد قرار پائیں تو عام خواتین پر یہ صرف مستحب ہی نہیں بلکہ واجب اور فرض ہے کہ وہ ہر اس حکم پر عمل پیرا ہوں جس کا مقصد اللہ نے ازواج مطہرات ؓ کو رجس ونجس سے پاک کرنا اور انہیں مجسمۂ طہارت و پاکیزگی بنانا قرار دیا ہے۔

محترم عثمانی صاحب تو ان آیات کو ازواج مطہرات تک محدود و مخصوص کرنے پر تلے ہوئے ہیں مگر جن کے وہ فکری ہمنوا بلکہ مقلد ہیں۔ وہ ان احکام کو دوسری خواتین تک عام اور متعدی سمجھتے ہیں۔

"عام طور پر عورت کا مستقر، گھر ہے اور اسے باہر ضرورتاً ہی جانا چاہیئے جس طرح عام طور پر مرد کا دائرۂ عمل گھر سے باہر ہے اور وہ گھر پر ضرورتاً ہی آتا ہے اسی بناء پر ارشاد ہوا کہ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (۳۳/۳۳) ان سے کہدو کہ ان کا مستقر ان کا گھر ہے۔ اس لئے وہ معمولاً گھروں میں رہا کریں۔ اگرچہ یہ آیت رسول اللہ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق آئی ہے اور اس سے قبل ان کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو لیکن اس سے یہ اصول تو مستنبط ہوتا ہے کہ عورت کے فرائض کا مرکز گھر ہے۔"

(طاہرہ کے نام صفحہ ۲۰۱ غلام احمد پرویز)

ایک اور مقام پر اسی آیت کے متعلق پرویز صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"خطاب نساء النبی سے ہے جن میں حضور کی ازواج مطہرات اور دیگر محترم خواتین بھی آجاتی ہیں۔" (تفسیر مطالب الفرقان ج ۲ صفحہ ۲۱۱، غلام احمد پرویز)

بہرحال سورہ احزاب کی زیر بحث آیات میں کوئی ہدایت یا حکم بھی ایسا نہیں جو صرف ازواج مطہرات تک محدود و مخصوص ہو ان میں مذکور ہر بات، ہر مسلمان خاتون کے لئے واجب العمل ہے۔ ان فرامینِ الٰہیہ سے خانگی معاشرت کے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں وہ بھی عام مسلمان خواتین کے لئے ہیں۔ انہیں صرف ازواج مطہرات تک محدود و مخصوص

کرنا اور عام مستورات کو ان ہدایات کا مخاطب قرار نہ دینا سخت بیجا بات ہے۔

## قابل غور بات

پردے کے نقطۂ نظر سے سورۂ احزاب کی زیر بحث آیات میں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو دیکھئے جو ازواج مطہرات کے توسط سے عام مسلم خواتین کو دیا گیا ہے کہ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ (اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو لوچدار اور لگاوٹ والی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے)۔ یہ الفاظ اس حقیقت کو اظہر من الشمس کر دیتے ہیں کہ مسلم خواتین کو گفتگو کرتے ہوئے سپاٹ لہجہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ان کی آواز میں دلکشی، لب و لہجہ میں لوچ اور لگاوٹ اور گفتگو میں ایسی شیرینی نہ گھلی ہوئی ہو جو کسی مریضِ قلب کے جذبات کو بھڑکا کر اسے ان سے غلط توقعات وابستہ کرنے پر اکسائے اور جادۂ شر پہ پیشقدمی کی ترغیب دلائے، گفتگو کے یہ آداب جن سے کوئی دل کا مریض غلط توقعات قائم کر لے، متقی خواتین کے شایان شان نہیں ہے بلکہ یہ اندازِ کلام فاسق وفاجر خواتین کا ہے، سورہ احزاب کی اس ہدایت کو اگر سورۂ نور کے اس حکم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے کہ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (خواتین، زمین پر اس طرح پاؤں مار کر نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے وہ لوگوں پر عیاں ہو جائے)۔ تو شارع کا مقصد دو اور دو چار کی طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ عورت کی آواز بھی پابندِ حجاب ہے۔ اگر اسے بضرورت گفتگو کرنی ہی پڑے تو وہ ایسا اندازِ تکلم اختیار کرے جو متقی اور پارسا خواتین کو زیب دیتا ہے نہ کہ وہ جو بدکردار اور بے حیا عورتوں کا شیوہ ہے۔ عورت کی آواز تو رہی ایک طرف اس کے زیور تک کی جھنکار کو بھی اجنبی مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچنا چاہیئے۔

## قرآن اور جدید کلچر

اب اس بات پر غور فرمائیے کہ جو دین، عورت کو مردوں سے بات چیت کرنے

کی بھی بضرورت اجازت دیتا ہے اور پھر اس پر یہ پابندی بھی عائد کرتا ہے کہ وہ لوچ دار اور بے تکلفی کا لب و لہجہ اختیار نہ کرے اس کی آواز تو رہی ایک طرف اس کے زیورات تک کی آواز، مردوں کے کانوں تک نہ پہنچے وہ دین یہ بات کیونکر برداشت کر سکتا ہے کہ عورت ساق و سینہ کی عریانی کے ساتھ، شوخ و شنگ اور بھڑکیلے لباس زیب تن کر کے مخلوط سوسائٹی میں ناز نخرے دکھلائے، سٹیج کی زینت بن کر "ثقافت" کی آڑ میں عریاں یا نیم عریاں حالت میں رقص کرے اور جسم کے خط و خال کو اس طرح نمایاں کرے کہ مردوں کے دل و دماغ نارِ شہوت سے بھڑک اٹھیں، فحش اور مخرب اخلاق گیت گا کر لوگوں کے سفلی جذبات کو آگ لگا دے۔ شہوت انگیز ایکٹنگ سیکھ کر مخلوط سوسائٹی کے ڈراموں میں حصہ لے۔ لوگوں کے دل لبھا لینے والی "تربیت" پا کر ہوائی میزبان بنے، بدن کے تمام نشیب و فراز کو مہین اور باریک لباس کی سطح پر اجاگر کر کے "کلچرل پروگراموں" میں کسی کی بیوی بن کر اور کسی کی بیٹی بن کر کسی کی محبوبہ بن کر اور کسی کی داشتہ بن کر ناز فروشی کرے ـــــ آخر یہ "ثقافت" یہ "کلچر" اور یہ "تمدن" کس قرآن سے برآمد کیا جا رہا ہے۔ خدا کی کتاب تو کسی ایسی بے حیا، ایمان سوز اور مخرب اخلاق ثقافت کی قطعاً روادار نہیں ہے، کسی کو اگر فرنگی تہذیب کی تقلید کرنی ہی ہے تو وہ شوق سے کرے مگر اسے قرآن کا نام لے کر وہ چال چلن اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو مزاج اسلام اور روحِ قرآن سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔

## آیت حجاب

سورہ احزاب کی دوسری آیت جسے محترم عثمانی صاحب زیر بحث لاتے ہیں۔ یہ ہے

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا | اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ نبی کے گھروں میں |
| بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ | بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت |
| إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ | تاکتے رہا کرو ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے |
| وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا | تو ضرور آؤ مگر جب کھانا کھا لو تو منتشر ہو |
| طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ | جاؤ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو، تمہارا یہ |

لِحَدِیْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ ۫ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ ؕ وَمَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَآ اَنْ تَنْکِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمًا ○

(۳۳/۵۳)

طرزِ عمل نبی کو تکلیف دیتا ہے مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبی کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لئے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔ تمہارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔

محترم عثمانی صاحب اس آیت کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

"اس آیت کریمہ میں بھی ازواجِ مطہرات کے سلسلے میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں، نبی کے گھروں میں بلا اجازت کھانا کھانے کے لئے نہ جانا کھانا پک کر تیار ہونے کے انتظار میں جم کر نہ بیٹھ جانا۔ بات چیت کے شوق میں یا کھانے کے شوق میں جمے نہ رہنا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی ازواجِ مطہرات سے نکاح کا ارادہ بھی نہ کرنا یہ تمام وہ احکام ہیں جن کا تعلق عام مسلمان خواتین سے نہیں ہے بلکہ صرف ازواجِ مطہرات سے ہے، ان آیات میں خاص طور پر یہ حکم کہ اگر ازواجِ مطہرات سے کچھ مانگنا ہو تو پردہ کے پیچھے سے مانگا جائے، یہ خصوصیت کے ساتھ ازواجِ مطہرات کے سلسلے میں عام مسلمانوں کو ہدایت ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۰۰)

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں ماسوا اس حکم کے کہ "آپؐ کی ازواجِ مطہرات سے اہلِ ایمان، کبھی بھی نکاح نہ کریں" — کوئی حکم اور ہدایت ایسی نہیں ہے جو

ازواج مطہرات سے خاص ہو اور عام مسلمان خواتین و حضرات سے اس کا تعلق نہ ہو کیا ہمارے متجددین کا یہ خیال ہے کہ لوگ نبی کے گھروں میں تو بلا اجازت کھانا کھانے کے لئے نہ جایا کریں مگر دیگر اہلِ ایمان کے گھروں میں اس مقصد کے لئے بلا تکلف اور بلا اجازت گھس جایا کریں۔ ازواجِ مطہرات کے ہاں تو کھانا پک کر تیار ہونے کے انتظار میں نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ مگر باقی سب گھروں میں دھرنا مار کر بیٹھ جانا چاہیے بیگمات نبوی کے ہاں تو بات چیت کے شوق میں بعد از طعام نہیں جمے رہنا چاہیئے مگر عام گھروں میں گپ شپ کے لئے "گلِ محمد" بنے رہنا چاہیئے۔ حلائل نبوی سے کسی چیز کی حاجت ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگنی چاہیئے مگر عام خواتین سے کوئی چیز درکار ہو تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آمنا سامنا کرتے ہوئے لینی چاہیئے، کیا ازواج مطہرات میں معاذاللہ، معاذاللہ کوئی خاص عیب و نقص تھا جس کی بناء پر انہیں یہ خاص حکم دیا گیا کہ ان سے پردے کی اوٹ میں سے کوئی چیز مانگی جائے حالانکہ وہ امہات المؤمنین ہیں؟ مگر عام عورتوں کو (بقول عثمانی صاحب) یہ حکم نہیں دیا گیا جبکہ ان کے اور عام مردوں کے درمیان ماں بیٹے کا یہ مقدس تعلق بھی مفقود ہے آخر یہ کیوں؟ کیا قرآن یہاں ازواج مطہرات سے پردے کی اوٹ میں سے مردوں کے کسی چیز کے مانگنے کو دونوں اصنافِ بشر کے لئے "پاکیزہ طرزِ عمل" قرار نہیں دیتا؟ اگر واقعی پسِ حجاب یہ لین دین، اللہ کی نگاہ میں "پاکیزہ طرزِ عمل" ہے تو اسے صرف بیگماتِ نبوی تک محدود کیوں رکھا جائے کیوں نہ اس "پاکیزہ طرزِ عمل" کے حکم کا جملہ مسلم خواتین کو مخاطب سمجھا جائے۔

اگر محترم عثمانی صاحب اور ان کے ہمنوا مغربی تہذیب کی تقلید میں پردے کے خلاف تعصب لئے ہوئے اس آیت کا مطالعہ نہ فرماتے تو وہ کسی طرح بھی اس کے احکام کو ازواجِ نبویؐ تک مخصوص و محدود قرار نہ دیتے۔ پسِ حجاب (من وراء حجاب) ازواج مطہرات سے لوگوں کے کوئی چیز مانگنے کے فعل کو قرآن استحسان کی نظر سے دیکھتے ہوئے، یہ کہتا ہے کہ ذَالِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ۔ یہاں

پاکیزگیٔ قلب کو صرف حلائل نبوی تک محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ عام مسلمانوں کو بھی (جو پسِ حجاب ان خواتین سے اشیاء مانگتے ہیں) پاکیزگیٔ قلب کی نعمت سے نوازا گیا ہے پس جو چیز (یعنی طہارتِ قلب) اس فعل کے نتیجہ میں ازواج مطہرات کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کو میسر آسکتی ہے اس سے عام خواتینِ اسلام کو محروم رکھنا ایک بیجا بات ہے اگر عام مسلمان پسِ پردہ کوئی چیز طلب کر کے اپنے لئے طہارتِ قلب کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ تو عام خواتین پسِ پردہ رہتے ہوئے مطلوبہ شئے دے کر کیوں نہ پاکیزگیٔ قلب کو حاصل کریں۔

رہا عثمانی صاحب کا یہ ارشاد کہ

"اس میں شک نہیں کہ یہ ایک نہایت اچھی ہدایت ہے اور احتیاط کا تقاضا ہے لیکن اسے عام مسلم خواتین کے حق میں مستحسن اور مستحب ہی کہا جاسکتا ہے ان کے لئے لازمی نہیں کہا جاسکتا۔"

تو یہ تارِ عنکبوت سے بھی کمزور اور لچر بات ہے۔ ازواجِ مطہرات مسلم خواتین کے لئے معلمات اور نمونۂ عمل ہیں، پس جو ہدایت ازواج مطہرات کو دی جاتی ہے وہ اسی لئے دی جاتی ہے کہ عام مسلم عورتیں بیگماتِ نبوی کے اتباع میں ان پر عمل پیرا ہوں۔

عثمانی صاحب جس طرز پر استدلال فرماتے ہیں اسی طرز پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی وغیرہ کا کام اب لازمی نہیں رہ گیا زیادہ سے زیادہ بس مستحسن اور مستحب ہی ہوسکتا ہے، کیونکہ اس کا حکم خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا، عام مسلمان اس حکم کے مخاطب نہ تھے۔

| | |
|---|---|
| خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ (۹ / ۱۰۳) | اے نبی! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انہیں بڑھاؤ اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو کیونکہ تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوگی۔ |

یہ طرفہ تماشا بھی دیدنی ہے کہ مولانا عثمانی صاحب، جہاں جی چاہتا ہے خصوصی مواقع

پر نازل ہونے والی آیات کو یہ کہتے ہوئے عموم و اطلاق پر محمول فرما لیتے ہیں کہ ——— العبرۃ لعموم الالفاظ لا لخصوص المواد د (الفاظ کی عمومیت کا اعتبار ہے کسی خصوصی شانِ نزول کا اعتبار نہیں ہے)۔ اور جہاں جی چاہتا ہے وہاں ان احکام کو بھی جن کے "نہایت اچھی ہدایت" ہونے کا خود انہیں بھی اعتراف ہے، صرف ازواجِ مطہرات تک محدود فرما لیتے ہیں اور عام خواتینِ ملت پر اس "نہایت اچھی ہدایت" کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ ؏

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

مزید برآں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر یہ احکام صرف ازواج مطہرات تک ہی محدود ہیں اور انہیں امہات المؤمنین کی حیات طیبہ تک ہی قابل عمل (VALID) رہنا تھا اور اس کے بعد قیامت تک کے لئے ان احکام کو ناقابل عمل (INVALID) قرار پا جانا تھا تو یہ سب احکام ایسے عارضی اور وقتی احکام قرار پا جاتے ہیں جن کے متعلق محترم عثمانی صاحب ہی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انہیں مستقل وحی کے ذریعے ابدالآباد تک محفوظ رکھنے کی کوئی ضرورت اور وجہ نہیں رہتی ہے۔

"یہ امر قابل غور ہے کہ اگر یہ محض[1] ایک عارضی حکم تھا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہنا تھا تو ایسے حکم کو قرآن میں نازل فرمانے اور ابدالآباد تک اسے محفوظ فرمانے کی ضرورت نہ تھی اس کا فیصلہ عارضی طور پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما سکتے تھے اس کے لئے ایک مستقل وحی کی ضرورت نہیں تھی ایسے اتفاقی حادثات میں بارہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی صوابدید اور اپنے اجتہاد سے بھی متعدد فیصلے فرمائے ہیں۔ اس حکم کا قرآن کریم میں نازل ہونا اور اس طرح قیامت تک کے لئے اس کو محفوظ کرنا خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص نہیں تھا۔" (فقہ القرآن ج ۱ ص ۲۳۵)

---

[1] حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ خوف میں 'صلوٰۃ الخوف' پڑھانے کا حکم۔ (قاسمی)

محترم عثمانی صاحب کے درج بالا اقتباس کی روشنی میں، میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ــــ "آیت حجاب میں مذکورہ احکام کا قرآن کریم میں نازل ہونا اور اسی طرح قیامت تک کے لئے ان احکام کو اس (قرآن) میں محفوظ کرنا خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ احکام ازواج مطہرات کے لئے مخصوص نہیں تھے۔"

ہمارے تجدد پسند حضرات کی مغرب پرستی کا یہ عالم ہے کہ جدید تہذیب کی اقتدا و پیروی کے لئے قرآن کی "مرمت" کرتے ہوئے وہ جہاں کسی اصول کو مفید مطلب پاتے ہیں اسے اختیار کر لیتے ہیں اور جہاں اُسی اصول کو خلاف مقصد پاتے ہیں ٹھکرا دیتے ہیں یہاں یہ ملاحظہ فرمائیے کہ جس اصول کی بناء پر محترم عثمانی صاحب صلوٰۃ الخوف کے حکم کو دائمی حکم مانتے ہیں اسی اصول کی روشنی میں آیت حجاب میں مذکورہ احکام بھی دائمی اور مستقل احکام قرار پاتے ہیں لیکن اول الذکر حکم کو وہ دائمی اور ابدی حکم سمجھتے ہیں اور مؤخر الذکر کو عارضی اور وقتی حکم۔ (جو ازواج مطہرات کی زندگی تک محدود تھا)۔

اس قسم کی متضاد سخن سازیوں کا نام رکھا جاتا ہے۔ "قرآنی دلائل"۔ اور ان تاویلات فاسدہ سے جو احکام، قرآن سے نچوڑے جاتے ہیں، انہیں کہا جاتا ہے "قرآنی فیصلے" اور الفاظِ قرآن سے روحِ قرآن کے خلاف جو مفہوم اس طرح نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے اس کا نام ہے "اسلامی اجتہاد"۔ استشراقی فنکاروں سے داؤ پیچ سیکھ کر، آیاتِ قرآنیہ سے فری سٹائل کشتی لڑ کر جو مواد مرتب کیا جاتا ہے اسے نام دیا جاتا ہے "فقہ القرآن" "معارف القرآن"، "مفہوم القرآن"، مطالب الفرقان"، "تسہیل بیان القرآن"، "قرآن سے قرآن تک"۔ "قرآنی قوانین"۔ فکر مغرب سے مرعوب ذہنوں پر جب "طلوعِ اسلام" ہوتا ہے تو سکہ بند کمیونزم، "اسلامی نظامِ ربوبیت" کے خوش آئند لیبل کے ساتھ یوں مشرف باسلام ہوتا ہے جیسے خانۂ کعبہ میں داخل ہونے پر لات وہبل "خدا" قرار پا گئے تھے۔

کسے خبر تھی کہ لے کے چــــراغِ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھــرے گی بولہبی

## آیتِ جلباب

آئیے اب ہم سورۃ احزاب کی اس آیت کا مطالعہ کریں جس میں ازواجِ مطہرات کے ساتھ عام خواتین امت کا بھی ذکر ہے۔

| | |
|---|---|
| یَاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِکَ وَبَنَاتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ (۳۳/۵۹) | اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر چادروں سے پلو لٹکا لیا کریں یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں اللہ بہت ہی غفور اور رحیم ہے۔ |

اس آیت کریمہ میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں۔

اوّلاً ـــــ اللہ تعالیٰ نے حجاب شرعی کی یہاں جو تعلیم دی ہے عام خواتین سے قبل ازواج مطہرات اور بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے اس کا آغاز کیا ہے اس کی دو وجوہ ہیں۔

(ا) رسول پر منجانب اللہ جو حکم بھی نازل ہوتا ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا سب سے پہلا شخص وہ خود ہوتا ہے۔ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (میں خود سب سے پہلے حکم خدا کے سامنے سر جھکانے والا ہوں) (۶/۱۶۳) ان احکام کی عملی اطاعت و انقیاد سب سے پہلے انہیں کے گھر سے ہوتی ہے کیونکہ آپ کے قریب ترین اعزہ وہی ہوتے ہیں جنہیں اولاً پیغامِ الٰہی پہنچایا جاتا ہے۔ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ ۲۶/۲۱۴) کیونکہ دعوت اسی وقت ثمر بار ہوتی ہے جب اس کا آغاز، داعی کے اپنے گھر سے ہو۔

(ب) ازواج مطہرات اور بنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی معاشرے کی خواتین کے لئے نمونۂ پیروی ہیں، سب سے پہلے انہی ہستیوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ان معاشرتی آداب کو اپنائیں یہی وجہ ہے کہ ازواج النبی اور بنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو دیگر مسلم خواتین پر مقدم رکھا گیا ہے۔

ثانیاً ـــــ حکم حجاب سے قبل سترِ عورت کی تعلیم دی جا چکی تھی بلکہ سترِ عورت کی تعلیم حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت نبی خاتمؐ تک ہر شریعت کا لازمی جز رہی ہے جس کے بغیر عبادات کی ادائیگی نہیں ہو سکتی اور اہلِ ایمان لباس ساتر پہن کر ہی عبادت کیا کرتے تھے خواہ ان آیات کی روشنی میں خواہ فرمان نبوی کی روشنی میں۔

يَا بَنِيٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا (۷/۲۶)

اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہاری جسمانی حفاظت و زینت کا ذریعہ بھی ہو۔

يَا بَنِيٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (۷/۳۱)

اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقعے پر اپنی زینت سے آراستہ رہو۔

تعلیمِ وجوبِ ستر کے بعد اب اگر حکمِ حجاب نازل ہوتا ہے تو لامحالہ یہ سترِ عورت سے زائد تر چیز کے وجوب کا متقاضی ہے اس لئے حکم حجاب کو سترِ عورت پر محمول نہیں کیا جا سکتا، حجاب کا تقاضا یہ ہے کہ جلباب کو اوڑھا جائے جو لباس ساتر کے علاوہ پورے جسم کو ڈھانپ لے۔

ثالثاً ـــــ اس حکم کو ازواجِ رسول، بناتِ نبی اور خواتینِ اسلام تک پہنچانا اس بات کی دلیل ہے کہ احکام حجاب صرف ازواجِ مطہرات تک محدود و مخصوص نہیں ہیں بلکہ بنات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جمیع مسلم خواتین تک وسیع اور متعدی ہیں۔

رابعاً ـــــ بعض علماء کے نزدیک، آزاد خاندانی عورتوں کو یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ کنیزوں اور لونڈیوں سے ممتاز ہو جائیں اور شرپسندوں کی اذیت کا نشانہ نہ بن سکیں چونکہ ان غلام عورتوں کو اپنے مالکوں اور اہل خانہ کی خدمت کی خاطر اور فراہمیٔ ضروریات کے سلسلے میں اکثر و بیشتر بازار جانا پڑتا تھا اس لئے انہیں اس تکلیف حجاب سے بری رکھا گیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ نساء المؤمنین (مومنوں کی عورتوں) کو مطلق رکھا گیا ہے جس میں حرائر و اماء دونوں داخل ہیں مسلمان

آزاد خواتین کے ساتھ مسلمان لونڈیوں کو بھی اس حکم میں شامل کیا گیا ہے البتہ اس حکم سے وہ لونڈیاں خارج ہیں جو غیر مسلم ہو کر اہلِ ایمان کے گھروں میں رہ رہی تھیں چونکہ یہ احکام اسلام کی مکلف نہیں تھیں اور پابندی حجاب کو اختیار نہیں کرتی تھیں اس لئے یہی لونڈیاں، منافقین اور شر پسند عناصر کی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بنتی تھیں۔

خامسًا ــــــ قرآن کے الفاظ۔ ذالك ادنى ان يعرفن فلا يوذين (یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں) میں "پہچان لی جائیں" کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آزاد خاندانی عورتوں کو کنیزوں میں سے الگ پہچان لیا جائے، لیکن ہمارے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کو (خواہ وہ آزاد ہوں یا لونڈیاں) حجاب کی بدولت پہچان لیا جائے کہ وہ باعصمت، پاکدامن اور پارسا خواتین ہیں نہ کہ آبرو باختہ، بے حیا اور بدکردار، جن سے ضمیر کے کھوٹے اور دل کے روگی مرد کوئی غلط امید وابستہ کریں۔ ان کا تستر اور ان کا احتجاب ہی ان کے بدکردار نہ ہونے کا نشان ہے، کیونکہ فاحشہ عورتیں اپنے حسن و جمال کو نقاب و حجاب میں چھپا کر گاہکوں کی تلاش میں نہیں نکلتی ہیں۔ بلکہ وہ اپنے جسم کی ہر زینت کو تمام ناز نخروں سمیت منڈی کا مال بنا کر بازارِ ہوسِ دیدار میں آیا کرتی ہیں۔

سادسًا ــــــ قرآن کے ان الفاظ میں ـــ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ (وہ اپنے اوپر چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں) میں کیفیتِ حجاب مذکور ہے عربی زبان میں جلباب اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو اوپر سے اس لئے اوڑھی جاتی ہے کہ وہ لباس اور پورے جسم کو ڈھانپ لے۔ يُدْنِينَ جس کا مصدر اِدْنَاءٌ ہے کے معنی ہیں "قریب کر لینا" اور "لپیٹ لینا"۔ یہ لفظ جب حرف جار "علیٰ" کے ساتھ استعمال ہو تو اس کا معنیٰ محض "لپیٹ لینا" نہیں ہوتا بلکہ اس میں "اِرْخَاء" (لٹکا لینا) کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، جیسے ہم اپنی زبان میں "پلو لٹکا لینے" کے الفاظ سے یا "گھونگھٹ نکالنے" کے الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں اگر اس کا مفہوم صرف چادر اوپر ڈال لینے، تک محدود ہوتا تو قرآن میں "علیٰ" کی بجائے "اِلیٰ" حرف جار استعمال ہوتا اور

عبارتِ قرآن یوں ہوتی ۔ یُدۡنِیۡنَ اِلَیۡھِنَّ مِنۡ جَلَابِیۡبِھِنَّ (یعنی چادروں کو اپنے قریب کر کے لپیٹ لیں) لیکن اصل قرآنی عبارت میں یُدۡنِیۡنَ عَلَیۡھِنَّ کے الفاظ ہیں جن کا معنیٰ محض چادر کا "لپیٹ لینا" نہیں ہے بلکہ اسے جسم ولباس پر اس طرح لپیٹ لینا ہے کہ اس کے ایک حصے سے چہرے پر پلو لٹکا لیا جائے، "ایک حصہ" کا مفہوم لفظ "من" میں پایا جاتا ہے جو تبعیض کے لئے آیا ہے چنانچہ ان الفاظ کا یہی مفہوم علماء امت اور اکابر ملت سے منقول ہے ۔

تصریحاتِ علماء

۱ـــــ تفسیر طبری میں ہے :۔

عن ابن سیرین انہ قال، سئلت عبیدۃ السلمانی عن ھٰذہ الاٰیۃ (یدنین علیھن من جلابیبھن) فرفع ملحفۃ کانت علیہ فتقنع بھا وغطی رأسہ کلہ حتّٰی بلغ الحاجبین و غطی وجھہ واخرج عینہ الیسری من شق وجہ الایسر.

(تفسیر طبری ۔ خازن ۔ حاشیہ الجمل علی الجلالین)

محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ انہوں نے عبیدہ سلمانی سے اس آیت (یُدۡنِیۡنَ ـــــ) کے متعلق پوچھا انہوں نے اپنی چادر اٹھائی اور پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانپ کر بائیں طرف والی آنکھ کو کھلا رکھا ۔"

۲ـــــ ابن جریر اور ابوحیان نے ابن عباس سے روایت کی کہ انہوں نے کہا کہ

"تلوی الجلباب فوق الجبین وتشدہ ثم تعطفہ علی الانف وان ظھرت عیناھا لکنہ یستر الصدر و معظم الوجہ"

(البحر المحیط ج ۷ صفحہ ۲۵۰)

"عورت جلباب کو ماتھے کے اوپر سے موڑتے ہوئے باندھ دے پھر اسے ناک کے اوپر سے لے جاتے ہوئے یوں بل دے کہ اگر اس کی دونوں آنکھیں کھلی بھی رہیں تو سینے اور چہرے کا بڑا حصہ مستور رہے ۔"

۳ــــ سدی سے بھی ایسی ہی کیفیت حجاب مروی ہے انہوں نے کہا کہ :۔

"تغطی احدی عینیھا وجبھتھا والشق الآخر الا العین"

وقال ابو حیان "ھٰذا عادۃ بلاد اندلس لا یظھر من المرءۃ الا عینھا الواحدۃ" (البحر المحیط ج ۷، ص۲۵۰)

"عورت اپنی ایک آنکھ اور پیشانی کو نیز چہرے کی ایک آنکھ کے علاوہ باقی حصے کو ڈھانپ کر رکھے" ابو حیان نے فرما "تمام اندلس کے شہروں کی یہی عادت ہے کہ عورت کی ایک آنکھ کے سوا تی حصۂ جسم بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا"

۴ــــ علامہ ابن الجوزی فرماتے ہیں کہ

"قولہ تعالیٰ (یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ) ای یغطین رءوسھن ووجوھھن لیعلم انھن حرائر والمراد بالجلابیب الاردیۃ" (تفسیر زاد المسیر ج ۶ ص۴۲۲) اللہ جل شانہ کے اس قول (یُدْنِیْنَ ـــ) کا معنی ہے کہ عورتیں اپنے سروں اور چہروں کو ڈھانپ کر رہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ وہ آزاد خواتین ہیں اور جلابیب سے مراد چادریں ہیں"

۵ــــ علامہ ابو سعود فرماتے ہیں

"الجلباب ثوب اوسع من الخمار ودون الرداء تلویہ المرءۃ علی رأسھا تبقی منہ ماترسلہ علی صدرھا ومعنی الآیۃ: ای یغطین بھا وجوھھن وابدانھن اذا برزن لداعیۃ من الدواعی" (تفسیر ابو سعود علی ھامش الرازی ج ۶ ص۸۰۰) "جلباب، خمار سے بڑا مگر رداء سے چھوٹا کپڑا ہے جسے عورت اپنے سر پر بل دے کر اس طرح اوڑھتی ہے کہ اس کا باقی حصہ لٹک کر اس کے سینہ کو ڈھانپ لے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ خواتین اپنے چہروں اور جسموں کو جلباب سے ڈھانپ کر رکھیں جبکہ انہیں کسی ضرورت کے تحت گھر سے نکلنا ہو"

۶ـــــ علامہ ابوبکر رازی، جو جصّاص کے نام سے مشہور ہیں، رقمطراز ہیں

"فی ھذہ الآیۃ (یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ) دلالۃ علی ان المرءۃ الشابۃ مامورۃ بستر وجھھا عن الاجنبیین واظھار الستر والعفاف عند الخروج لئلا یطمع فیھن اھل الریب" (احکام القرآن ج ۳ ص ۳۷۲)

"اس آیت میں (کہ عورتیں چادروں سے اپنے اوپر پلو لٹکا لیا کریں) یہ دلیل ہے کہ نوجوان عورت اجنبی مردوں سے اپنے چہرے کو مستور رکھے وہ اس بات پر بھی مامور ہے کہ گھر سے باہر نکلتے وقت ستر اور عفت مآبی کا اظہار کرے تاکہ مشکوک افراد ان سے غلط امید وطمع نہ کر پائیں۔

۷ـــــ تفسیر جلالین میں ہے کہ

"الجلابیب جمع جلباب، وھی الملاءۃ التی تشتمل بھا المرءۃ، قال ابن عباس: امر نساء المومنین ان یغطین رءوسھن ووجوھھن بالجلابیب الا عینا واحدۃ لیعلم انھن حرائر" (بحوالہ روائع البیان ج ۲ ص ۳۷۵) "جلابیب، جلباب کی جمع ہے اور یہ ایک ایسی چادر ہے جسے عورت اپنے پورے جسم پر لپیٹ لیتی ہے، ابن عباس فرماتے ہیں کہ اللہ نے اہل ایمان کی عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی چادروں سے اپنے سر اور چہرے ماسوا ایک آنکھ کے، ڈھانپے رکھیں تاکہ معلوم ہو کہ وہ آزاد خواتین ہیں (نہ کہ لونڈیاں ہیں جن سے منافقین چھیڑ چھاڑ کے لئے تعرض کرتے ہیں)۔

## پردہ زمانۂ نزولِ قرآن میں

علماء کی یہ تصریحات اگرچہ چہرے کے پردے کی حیثیت کو واضح کر دیتی ہیں تاہم ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود عہد نبوی میں عورتوں کے ستر وجوہ کو بیان کر دیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ چہرے کا پردہ کسی دوسری قوم کی دیکھا دیکھی اختیار نہیں کیا گیا بلکہ

عین نزولِ قرآن کے زمانے میں اسلامی معاشرے میں اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست نگرانی میں رائج کیا گیا تھا، اور اس کی ابتداء خود آپؐ کے اپنے گھر سے ہوئی تھی۔

۱ ـــــ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان جو واقعۂ افک[1] سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑی معتبر سندوں کے ساتھ کتب احادیث میں موجود ہے وہ فرماتی ہیں:۔

"ـــــ جنگل سے واپس آکر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ وہیں پڑ کر سو گئی، صبح کو صفوان بن معطلؓ وہاں سے گزرے تو دور سے کسی کو پڑے دیکھ کر ادھر آگئے، فَعَرَفَنِیْ حِیْنَ رَاٰنِیْ وَکَانَ قَدْ رَاٰنِیْ قَبْلَ الْحِجَابِ فَاسْتَیْقَظْتُ بِاسْتِرْجَاعِہٖ حِیْنَ عَرَفَنِیْ فَخَمَّرْتُ وَجْھِیْ بِجِلْبَابِیْ (وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے کیونکہ حجاب کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکے تھے جب انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا تو ان کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے اپنا منہ ڈھانک لیا)۔ (بخاری، مسلم، احمد، سیرت ابن ہشام)

۲ ـــــ ابوداؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ

"ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درخواست دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟" اس نے عرض کیا "عورت ہی کا ہے"۔ فرمایا "عورت کا ہاتھ ہے تو کم از کم ناخن ہی مہندی سے رنگ لئے ہوتے"۔ (تاکہ ہاتھ کا دست خاتون ہونا واضح ہو جاتا)۔

۳ ـــــ عہد نبوی کا یہ واقعہ بھی چہرے کے پردے کی واضح دلیل ہے۔

"حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابن ام مکتومؓ آگئے۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ

---

[1] واقعۂ افک کی تردید و تغلیط کے لئے محترم عثمانی صاحب نے "اپنی درایت" کی روشنی میں جو اشکالات و اعتراضات پیش کئے ہیں، ان پر میں کسی دوسرے موقعے پر بحث کرتے ہوئے تفصیلاً اظہار خیال کروں گا انشاء اللہ۔

علیہ وسلم نے دونوں بیویوں سے فرمایا "اِحْتَجِبَا مِنْهُ" (تم دونوں اس سے پردہ کرو) بیویوں نے عرض کیا "یارسول اللہ اَلَیْسَ اَعْمٰی لَا یُبْصِرُنَا وَلَا یَعْرِفُنَا" (اے اللہ کے رسول! کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے اور نہ ہی پہچانیں گے) فرمایا اَفَعَمْیَاوَانِ اَنْتُمَا اَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِہٖ (کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انہیں نہیں دیکھتیں؟) ـــــ اسی واقعے کی حضرت ام سلمہؓ تصریح کرتی ہوئی فرماتی ہیں کہ "ذٰلک بعد ان امر بالحجاب" (یہ واقعہ حکم حجاب کے نازل ہونے کے بعد کا واقعہ ہے)۔ (ابوداؤد، احمد، ترمذی)

۴ ـــ ایک روایت میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ

"حضرت عائشہؓ کے پاس ایک نابینا آیا تو انہوں نے اس سے پردہ کیا کہا گیا کہ آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں یہ تو آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔ جواب میں حضرت ام المؤمنین نے فرمایا "لکنی انظر الیہ" (میں تو اسے دیکھ سکتی ہوں)۔ (مؤطا امام مالک)

۵ ـــ حج کے موقعہ پر حالتِ احرام میں خواتین کو یہ حکم ہے۔

عن ابن عمر عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال المحرمۃ لَا تَنْتَقِبُ وَلَا تَلْبَسُ الْقُفَّازَیْن "حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احرام باندھنے والی عورت نقاب نہ اوڑھے اور دستانے نہ پہنے۔" (سنن ابوداؤد۔ باب مایلبس المحرم)

احرام کی حالت میں عورت کو نقاب سے روکنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ غیر از حالتِ احرام میں نقاب کا استعمال ضروری ہے ورنہ اگر نقاب کا کسی حالت میں وجود ہی نہ ہوتا تو اسے ایک مخصوص حالت میں ممنوع قرار دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ اس طرح حج کے موقعے پر احرام میں پردے سے روکنا بجائے خود عدم احرام کی صورت میں پردے اور نقاب پر دلالت کرتا ہے۔

۶ــــ حج میں اگرچہ نقاب کا استعمال اور تسترِ وجوہ ضروری نہیں ہے تاہم بعض متقی اور پرہیز گار خواتین، حالتِ احرام میں بھی اس کا اہتمام فرماتی تھیں جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ظاہر ہے کہ

"حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالتِ احرام مکہ کو جا رہے تھے جب مسافر ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم عورتیں اپنے سر سے چادریں کھینچ کر منہ پر ڈال لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں۔"

(ابو داؤد ۔ باب فی المحرمۃ تغطی وجھہا)

اب ظاہر ہے کہ جو متقی اور پارسا خواتین، حج کے ازدحام میں بھی احتجاب و انتقاب کا اس قدر اہتمام فرماتی تھیں وہ عام حالات میں تو اس سے بھی زیادہ نقاب و حجاب کا خیال رکھتی ہوں گی۔

عہدِ نبویؐ اور زمانۂ نزولِ قرآن کے یہ واقعات اس بات پر شاہدِ عدل ہیں کہ چہرے کا پردہ، خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآنی تعلیمات کے اتباع میں رائج ہو چکا تھا اور خود آپؐ نے اپنی ازواج مطہرات کو نابینا حضرات تک سے پردہ کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

عہدِ نبویؐ میں سترِ وجوہ کی یہ ترویج ملاحظہ فرمایئے اور علماء امت میں سے سلف و خلف کی تصریحات کو دیکھئے اور داد دیجئے "فکرِ اسلامی" کے ان علمبرداروں کو جو حقائق سے آنکھیں چراتے ہوئے علمی دیانت کو بالائے طاق رکھ کر طنزاً یہ فرماتے ہیں۔

"برصغیر پاک و ہند میں شرعی پردہ کے متعلق جو عام طور پر تصور پایا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ عورتوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ انہیں کسی اہم ضرورت سے بھی سفر وغیرہ میں گھر سے باہر نکلنا پڑے تو برقعہ اوڑھ کر منہ چھپا کر منہ پر نقاب ڈال کر نکلنا چاہیئے تاکہ غیر مردوں کی نگاہ ان کے چہرے پر اور ان کے بدن پر نہ پڑ سکے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۰۵)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ

"شرعی پردہ وہ نہیں ہے جو ہمارے ہاں دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی رائج کر لیا گیا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص۳۲۷)

سوال یہ ہے کہ وہ دوسری قومیں ہیں کونسی جن کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے یہ نقاب و حجاب اختیار کر لیا ہے؟ جناب عثمانی صاحب کے یہ الفاظ مغرب کی عریاں تہذیب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہیں۔ جس طرح آج تہذیب مغرب کی بالاتری میں، مسلمان سیاسی آزادی کے باوجود ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر ان کے طور طریقے اختیار کر رہے ہیں بالکل اسی طرح کل یورپ اسلامی آدابِ معاشرت کو اختیار کر رہا تھا، جب تمدنِ اسلامی کا لوہا ہر لوہے کو کاٹتا چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ یورپ کی عورتیں، خواتین اسلام کی تقلید میں نقاب و حجاب کو بھی اختیار کر رہی تھیں جیسا کہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق صاحب نے "اسلامی تہذیب کا اثر یورپ پر" ــــ کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت لکھا ہے کہ

"اسلامی تہذیب نے حیاتِ مغرب کے ہر پہلو پر اثر ڈالا ان لوگوں کے لباس بدل گئے۔ طور طریقے بدل گئے، تعمیرات میں مشرقیت آگئی، عورتوں کا احترام بڑھ گیا اور انہوں نے حریص نگاہوں سے بچنے کے لئے نقاب اوڑھ لئے۔"

(یورپ پر اسلام کے احسان ص۱۵۰)

حقیقت یہ ہے کہ چہرے کا پردہ سورۂ احزاب کے ان احکام کی تعمیل میں خود عہدِ نبوی میں رائج ہو چکا تھا، عثمانی صاحب کی یہ عادت ہے کہ جو بات ان کے لئے مفید مطلب نہیں ہوتی وہ اگر پہاڑ کی طرح محکم اور وزنی ہو تو اس سے صرفِ نظر فرما لیتے ہیں لیکن جو بات ان کے لئے مفید مطلب ہو وہ اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو اسے پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں بلکہ اس فن میں انہیں ایسا کمال حاصل ہو چکا ہے کہ اب وہ رائی کے بغیر ہی پہاڑ بنا ڈالتے ہیں۔ ؎

ایسا بلند سب کا "ذوقِ نظر" کہاں

---

لہ رِحلۃ ابن جُبیر ص۳۳۳

محترم عثمانی صاحب نے چہرے کے عدم حجاب کو ثابت کرنے کے لئے تین چار واقعات بھی کتب حدیث سے پیش کئے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے متعلق بھی یہ صراحت نہیں ہے کہ وہ نزول حکم حجاب کے بعد کے واقعات ہیں ماسوا اس واقعہ کے جو حج کے موقعہ پر پیش آیا (اور یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ حج کے موقعہ پر حالت احرام میں نقاب ضروری نہیں ہے)۔ اب جہاں نقاب کا استعمال ضروری نہ ہو وہاں اسے حج کے علاوہ پوری معاشرتی زندگی کے لئے دلیل بنانا ایک مطلب جو ذہن کا کام ہے جو علمی تحقیق اور تلاشِ حق کے کام سے کوئی سروکار نہ رکھتا ہو تاہم حج کے موقعے پر بھی بعض متقی خواتین نقاب کا استعمال کرتی تھیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ حالتِ احرام میں ضروری نہیں ہے۔

## عثمانی صاحب اور ستر وجوہ

دورِ رسالت مآب میں چہرے کا پردہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے جس سے اگر کوئی چاہے تو آنکھیں بند کر لے مگر وہ حقیقت واقعہ سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ محترم عثمانی صاحب نے اگرچہ چہرے کے پردے کا انکار کر کے حقیقت قطعیہ سے آنکھیں تو بند کر لی ہیں مگر وہ امرِ واقعی سے انکار نہ کر پائے اور انہیں چہرے کے پردے کا اقرار کرتے ہی بنی۔

وہ خلع، طلاق اور فسخ نکاح کی وجہ جواز پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

"آدمی کا بدصورت ہونا، اس کے جسم کا بے ڈول ہونا بھی خلع یا طلاق یا فسخ نکاح کی وجہ جواز بن سکتا ہے۔ چنانچہ صدرِ اوّل میں ہمیں اس کی نظائر ملتی ہیں عبداللہ بن ابی ابن سلول کی بہن جمیلہ بنت ابی بن سلول کا نکاح حضرت ثابت بن قیس سے ہوا تھا جمیلہ نہایت حسین عورت تھی اور ثابت بن قیس خوبصورت نہیں تھے چنانچہ جمیلہ بنت ابی بن سلول نے بارگاہِ رسالت میں خلع کے لئے مرافعہ کیا ابن جریر طبری نے ان کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ــــــ "اے اللہ کے رسول! میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز ایک جگہ جمع نہیں کر سکتی (یعنی اس کے ساتھ ایک بستر پر لیٹنا گوارا

نہیں کرسکتی) میں نے اپنا گھونگھٹ جو اٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کے ساتھ آرہا تھا میں نے دیکھا کہ وہ ان سب سے زیادہ سیاہ فام سب سے زیادہ کوتاہ قد اور سب سے زیادہ بدصورت تھا۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۰۷)

محترم عثمانی صاحب کا خود یہ اقتباس اس حقیقت کو مبرہن کرتا ہے کہ چہرے کو گھونگھٹ میں چھپانا یا نقاب ڈالنا شرعی پردے کا بنیادی عنصر ہے اور یہ پردہ مسلمانوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں اختیار نہیں کیا تھا بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں، امتثالِ امر الٰہی کے نتیجے میں اختیار کیا تھا۔

### اور ہمارے یہ متجددین

قرآن کی آیات اس پر قطعی دلالت کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے یہ متغربین و متجددین، زمین و آسمان کے اس فرق کو جو "حدود ستر" اور "حدود حجاب" میں پایا جاتا ہے نظر انداز کرتے ہوئے یا اسے خلط مبحث کا شکار بناتے ہوتے یہی رٹ لگائے جارہے ہیں کہ چہرے کا پردہ، اسلامی شریعت میں کوئی ثابت شدہ امر نہیں ہے چنانچہ بعض پڑھے لکھے جاہلوں کا ایک طبقہ یہ گمان کئے بیٹھا ہے کہ "ستر وجوہ کو اسلام نے مسلم خواتین پر فرض و واجب نہیں کیا بلکہ یہ "عجمی سازش" کا نتیجہ ہے جسے مسلمان گلے سے لگائے ہوئے ہیں"۔ یہ ایک تجدد پسندانہ دعوت ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ائمہ مصلحین کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتے ہیں، جو ادعائے علم اور زعمِ اجتہاد کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ عصری تقاضوں کی آڑ میں اجتہاد کی قینچی سے اسلامی احکام کی کتر بیونت کر کے دینِ اسلام کو تہذیب مغرب سے ہم آہنگ کر دیں ورنہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام وفات پا جائے گا، لہٰذا اسلام کو "زندہ" رکھنے کے لئے یہ تجدد پسندانہ سرگرمیاں از حد ضروری ہیں۔

چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری بعض خواتین کشف وجوہ کی اس بدعت کا شکار ہو رہی ہیں، اس لئے نہیں کہ یہ دعوتِ حق ہے بلکہ اس لئے کہ یہ ان کی ہوائے

نفسانی سے ہم آہنگ ہے۔ نفسانی خواہشات نفس کو مرغوب و محبوب ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ بات چنداں قابل تعجب نہیں ہے کہ لوگ اس دعوتِ فسق و فجور کو اپنا رہے ہیں کیونکہ بندگیٔ نفس میں مبتلا ہو کر بھی مسلمان بنے رہنے کا (بلکہ فکرِ اسلامی کا علمبردار بنے رہنے کا) اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ہے کہ مخالفِ قرآن فکر و عمل کو اختیار بھی کرے اور متبع قرآن بھی قرار پائے اس طرزِ عمل کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ ع

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی ؏

ایک طرف یہ غلام فطرت متجددین و مجتہدین ہیں جو عورت کا نقاب اتار پھینکنے میں "فکرِ اسلامی" کا عروج و کمال سمجھتے ہیں اور دوسری طرف عہدِ نبویؐ کی اس مجسمہ عفت و عصمت اور سراپا شرم و حیا خاتون کو ملاحظہ فرمائیے جسے یہ خبر ملتی ہے کہ اس کا فرزندِ ارجمند معرکۂ قتال و جہاد میں جامِ شہادت نوش کر چکا ہے تو وہ نقاب اوڑھے ہوئے مقتل میں اپنے شہید بیٹے کو دیکھنے کے لئے آتی ہے، صحابہ کرامؓ حیرت سے اسے پوچھتے ہیں کہ ــــ تم اس حال میں بھی نقاب اوڑھے ہوئے ہو جبکہ ایسی روح فرسا خبر سن کر ایک ماں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا" ــــ تو وہ جواب دیتی ہیں "اِنْ اَرْزَأُ وَلَدِیْ فَلَنْ اَرْزَأُ حَیَائِیْ" (میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے مگر اپنی حیاء نہیں کھوئی)۔

فیا للعجب! تعجب ہے ان "علم برادرانِ قرآن" پر جو قرآن کے نام پر عورت سے اس کا وہ پردہ اتار پھینکنا چاہتے ہیں جسے عہدِ نبویؐ کی خاتون، ہوش و حواس خطا کر دینے والے ہجوم مصائب میں بھی ترک کرنے پر آمادہ نہیں حالانکہ وہ دور، امن و سکون کا سنہری دور تھا۔ یہ "دانش ور" خواتین کو آج حجاب و نقاب سے بیزار کر کے گھر سے باہر نکالنے پر تلے ہوئے ہیں جبکہ مرد فتنہ و فساد کے اور نوجوان فسق و فجور کے شکار ہو رہے ہیں، بے حیائی، بدکرداری، شہوت پرستی، ہوس رانی، عریانی و فحاشی اور جنسی انارکی جنگل کی آگ کی طرح پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ اب زنا اور بے حیائی کی وبا، سکول کے بچوں تک میں روز افزوں ہو رہی ہے بے حیائی اور بے غیرتی کے ایسے مناظر ننگا ہوں کے سامنے آ رہے ہیں کہ دلِ دردمند کے ہونٹوں پر

بے اختیار یہ الفاظ آجاتے ہیں کہ ؎

دھڑکنا بند کر اے دل نظر کے نور گم ہو جا
وہ بے غیرت ہے جو اس دور کے شام وسحر دیکھے

دورِ حاضر کے یہ حالات بھی حساس اور دلِ دردمند ہی کو گراں گزرتے ہیں ورنہ ہمارے یہ حضراتِ متجددین جب بے پردہ خواتین کو بیرونِ خانہ امور میں مشغول پاتے ہیں اور انہیں عریاں چہروں کے ساتھ شمع انجمن بنتے ہوئے دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ "اللہ کا دین" پھیل رہا ہے۔ "فکر اسلامی" فروغ پا رہا ہے۔ جوں جوں عورت کا لباس قصیر سے قصیر تر ہوتا جا رہا ہے توں توں "شرعی پردہ" کثیر سے کثیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ عہدِ رسالت کے وقت ہی سے خواتین "عجمی سازش" کے تحت، جس "غیر شرعی پردے" کو قبول کیئے ہوئے ہیں، مغرب کی "عریاں تحریک" کی بدولت اب وہ "شرعی پردے" کی طرف رجوع فرما رہی ہیں۔

TRUEMASLAK@INBOX.COM

# باب ۵

# عورت اور مخلوط سوسائٹی

اس باب میں مخلوط سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں پر چھ فصلوں میں بحث گئی ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے:-

پہلی فصل ـــــ مشترک اور مخلوط محافل۔

دوسری فصل ـــــ اجتماعی عبادات اور مشترک مجالس

(۱) مساجد میں اختلاطِ صفین کی حقیقت

(الف) پنج وقتہ نمازیں

(ب) نماز جمعہ

(ج) نماز عیدین

(۲) حج کے موقعہ پر "مخلوط مجالس" کی حقیقت

(۳) زنانہ مساجد اور امامتِ نسواں

تیسری فصل ـــــ اجتماعِ رجال اور خطابِ نسواں

چوتھی فصل ـــــ گھر سے باہر نکلتے وقت عورت کے لئے اجازت کی ضرورت

پانچویں فصل ـــــ عورت اور میدانِ حرب وقتال

چھٹی فصل ـــــ مخلوط تعلیم

# پہلی فصل : مشترک اور مخلوط محافل

گذشتہ صفحات میں، یہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے کہ

۱۔ عورت کے لئے اس کی طبعی کمزوریوں کے باعث جو ماہواری، حمل، زچگی، نفاس اور رضاعت کے باعث اس پہ عارض ہوتی ہیں، یہی بات، قرینِ عقل و عدل ہے کہ اس کا میدانِ عمل گھر کی چار دیواری تک محدود ہو تاکہ وہ اپنی زندگی کی ان ناگزیر تکالیف کو گھر کے پُرسکون گوشۂ عافیت میں باآسائش و سہولت انگیز کر سکے۔

۲۔ امور خانہ داری حقوق شوہر کی ادائیگی، بچوں کی پرورش و پرداخت اور ان کی جسمانی، ذہنی اور فکری و اخلاقی نشوونما جیسے فرائض کی بجا آوری کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ عورت، بیرونِ خانہ کے تمام اندیشہ ہائے فکر سے دستکش ہو کر، کارگاہِ خانہ میں اپنی فطری ذمہ داریوں کو نبھائے۔

۳۔ قرآن نے ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ (اپنے گھروں میں تم (خواتین) وقار سے ٹکی رہو) کہہ کر اس کے دائرۂ عمل کو گھر کی چار دیواری تک سمیٹ دیا ہے اور محرم اعزہ و اقربا کے چھوٹے سے دائرے کو ممیز کر کے خواتین خانہ اور غیر محرم مردوں کے درمیان پردے کو حد فاصل کے طور پر قائم کر دیا ہے۔

یہ تصریحات، عورت کے لزومِ بیت کو واضح کر دیتی ہیں تاہم ضرورتاً ان کا گھر سے نکلنا ممنوع نہیں ہے یہ بات قرآن سے بھی ثابت ہے اور سنت نبویؐ سے بھی۔ گھر سے باپردہ خروج کے بعد وہ کسی ایسی مجلس و محفل میں شریک نہیں ہو سکتی جس میں اختلاطِ صنفین پایا جاتا ہو۔ ہماری سابقہ بحث اس حقیقت پر شاہد ہے جو دین اعضاءِ خاتون پہ نصب ہونے والی آرائش و زیبائش تک کو ظاہر کرنے سے منع کرتا ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ان اعضاء ہی کو بے نقاب کرنے کی اجازت دے گا عقلاً محال ہے اور جو دین عورت کے زیورات تک کی آواز کو اجانب کے کانوں تک

نہیں پہنچنے دیتا اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ مخلوط مجالس میں اپنے فن گلوکاری سے سامعین کو نوازنے کی اجازت دے گا، بدیہی البطلان امر ہے۔ شریعت محمدیہ میں نزولِ حکمِ حجاب و نقاب کے بعد اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ عام معاشرتی زندگی میں خواتین مخلوط مجالس میں شریک ہوا کرتی تھیں اِلّا یہ کہ کوئی مجلس محرم اعزہ واقارب پر مشتمل ہو یا جنگ کے خصوصی حالات میں ایسا ہوا ہو (جس پر ہم بعد میں بحث کریں گے) عہدِ نبویؐ میں خواتین مساجد میں ادائیگی نماز کے لئے حاضر ہوا کرتی تھیں مگر وہاں مردوں کی نشستیں خواتین کی نشستوں سے الگ ہوتی تھیں۔ کسی صف میں مرد اور خواتین مل جل کر شانہ بشانہ کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ نزول حجاب سے قبل کا بھی کوئی واقعہ ایسا منقول نہیں ہے جس میں مردوں کی کسی صف میں خواتین یا خواتین کی کسی صف میں مردوں کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہو محترم عثمانی صاحب حدیث کا ایک واقعہ چہرے کا پردہ نہ ہونے کی دلیل کے طور پر پیش فرماتے ہیں۔ اس روایت میں یہ بات تو قطعًا مذکور نہیں ہے کہ یہ واقعہ نزولِ حکم حجاب کے بعد کا واقعہ ہے البتہ اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مسجد میں خواتین و حضرات علیحدہ علیحدہ جگہوں پر نماز پڑھا کرتے تھے۔ عثمانی صاحب رقمطراز ہیں:۔

> "حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلوٰۃ عید میں عید کے دن حاضر تھا تو آپ نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھائی جس میں نہ اذان تھی نہ اقامت۔ پھر بلال کے سہارے آپ ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے اور تقویٰ الٰہی کا حکم فرمایا اور لوگوں کو اللہ کی فرمانبرداری کی ترغیب دی اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرمائی پھر آپ گئے اور عورتوں کے پاس پہنچ کر انہیں نصیحت فرمائی خدا کو یاد دلایا اور فرمایا کہ صدقہ کرو الخ"۔
>
> (فقہ القرآن ج ۳ ص۳۲)

اس روایت کے ان الفاظ سے کہ ـــــ "آپ گئے اور عورتوں کے پاس پہنچ کر انہیں

نصیحت فرمائی"۔۔۔۔۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مخلوط مجالس کا وجود عہد نبوی میں نہ تھا۔ حتیٰ کہ نماز کے لئے بھی مرد علیحدہ اور عورتیں علیحدہ صفیں بناتے تھے۔ صنفین کا باہمی فاصلہ اس قدر زیادہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود وہاں تشریف لے جا کر عورتوں کو نصیحت فرمانا پڑی۔ وہیں کھڑے کھڑے اپنی آواز کو بلند کر کے نہیں آپ اپنی آواز پہنچا سکتے تو آپ خود ان تک پہنچنے کی زحمت نہ فرماتے اب یہ مقام غور ہے کہ جو دین مسجد و معبد میں بھی خواتین و حضرات کی مخلوط سوسائٹی کا روادار نہیں ہے وہ خانۂ خدا سے باہر ایسی مجالس کا کیونکر روادار ہو سکتا ہے! اور جب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت اور پُر سعادت دور میں بھی مرد و زن کی مشترک معاشرت کو رواج نہیں دیا گیا تو آج کے فسق و فجور کے دور میں اختلاطِ ذکور و اناث کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟

### "اختلاطِ صنفین" کے دلائل

محترم عثمانی صاحب نے مخلوط معاشرت اور مشترک مجالس کے جواز میں دو دلیلیں پیش فرمائی ہیں۔

### پہلی دلیل

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ

"صحیح بخاری میں سہل بن سعد سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو اسید ساعدی نے شادی کی تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی دعوت کی تو ان کی بیوی ام اسید ہی نے کھانا تیار بھی کیا اور اسے سب کے سامنے پیش بھی کیا۔ رات سے انہوں نے کھجوریں پتھر کے پیالوں میں بھگو دی تھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے سے فارغ ہو گئے تو ان کی بیوی نے ان کھجوروں کو ہاتھ سے ملا اور حضور کو اسے پلایا یہ ان کی طرف سے حضور کے لئے خصوصی تحفہ تھا۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۱۲)

(بحوالہ بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب قیام المرءۃ علی الرجال فی العرس)

یہ واقعہ نزول حکم حجاب سے قبل کا ہے اس لئے اس سے دلیل پکڑنا ایسا ہی ہے جیسے حرمت شراب سے قبل صحابہؓ کے واقعات مے خوری سے جوازِ خمر پر دلیل اخذ کی جائے نزول حکم حجاب کے بعد عورتیں اجانب سے گھونگھٹ ڈال کر پردہ کیا کرتی تھیں۔ خود محترم عثمانی صاحب کا اقتباس اس سلسلہ میں پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔

## دوسری دلیل

جناب عثمانی صاحب کی دوسری دلیل "قرآنی دلیل" ہے وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں جب کچھ مہمان آئے اور انہوں نے ان کے سامنے کھانا رکھا تو اس محفل میں حضرت سارہ رضی اللہ عنہا (زوجۂ مطہرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام) بے تکلف آکر شریکِ محفل ہو گئی تھیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۱۲)

محترم عثمانی صاحب کی اس دلیل کے جواب میں:۔

۱۔۔۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس واقعے کا شریعت محمدیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے انبیائے سابقین کی شریعت ہمارے لئے بھی شریعت ہے یا نہیں؟ اس بات میں علماء کا اختلاف ہے تاہم جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ سابقہ شرائع ہمارے لئے واجب العمل ہیں وہ ایک استثناء کو بھی ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ سابقہ شرائع کے کسی حکم کو اگر ہماری شریعت (شریعتِ محمدیہ) نے منسوخ نہیں کیا تو وہ واجب الاتباع ہے ورنہ نہیں پھر شریعتِ ابراہیمی کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں کہ اس میں چہرے کا پردہ تھا یا نہیں؟ اور اگر تھا تو یہ واقعہ حکم حجاب سے پہلے کا ہے یا بعد کا؟ پس ان تفصیلات سے عاری مجمل واقعہ کو نہ تو عدم حجاب ہی کی دلیل بنایا جا سکتا ہے اور نہ مخلوط محفلوں میں شرکت ہی کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک کام شریعت ابراہیمی میں جائز بھی ہو مگر شریعت محمدیہ میں اس کا جواز نہ پایا جاتا ہو تو ایسے معاملے میں صرف اور صرف شریعت محمدیہ ہی

کا اتباع لازم ہو گا۔ اب اگر ایک طرف زوجۂ مطہرۂ حضرت ابراہیم علیہ السلام بے تکلف اجنبی مہمانوں کی محفل میں شریک ہوتی ہیں لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ بالفاظ صریحہ ازواج مطہرات نبیٔ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم جاری کرتا ہے کہ وہ اجنبی لوگوں کے سامنے نہ ہوں بلکہ اگر لوگ کوئی چیز بھی مانگیں تو وہ ان کا سامنا کئے بغیر پردے کی اوٹ میں سے مطلوبہ چیز انہیں دیدیں تو فرمائیے کہ اس سلسلے میں خواتینِ امت محمدیہ کے لیئے واجب الاتباع طرز عمل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا ہو گا یا کسی سابقہ پیغمبر کی زوجۂ[1] مطہرہ کا؟ جس کی جزوی تفصیلات کا ہمیں علم بھی نہیں ہے۔"

۳۔۔۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر اس واقعے کو قابل احتجاج بھی قرار دیا جائے تب بھی اس سے وہ بات نہیں بنتی جو محترم عثمانی صاحب بنانا چاہتے ہیں۔ اسی واقعے میں یہ بھی مذکور ہے کہ فرستادگانِ الٰہی کی آمد کے موقعے پر حضرت سارہ رضی اللہ عنہا عمر رسیدگی کی اس حالت کو پہنچ چکی تھیں جس کو قرآن عَجُوزٌ عَقِيمٌ (بڑھیا بانجھ ۔۔۔ فقہ القرآن ج ۲ ص ۱۱۳) کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے ایسی عورت (جو بڑھاپے اور بانجھ پن کی ایسی حالت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ بشارت پسر کے بعد بھی ولادتِ فرزند سے مایوس و متعجب نظر آتی ہے) اگر اجانب کی محفل میں آن بیٹھتی ہے تو اس سے کوئی فتنہ پیدا نہیں ہوتا بخلاف ایسی نوجوان عورت کے جس کا پُر شباب وجود شیطانی آنکھوں کے لئے لطف و لذت کا سامان بن جاتا ہے اسلامی شریعت کی یہ پابندیاں صنفی انارکی اور شہوانی جذبات ہی کی بنیاد پر لگائی گئی ہیں چنانچہ آج بھی اسلامی شریعت میں اگر کوئی عورت بڑھاپے اور بانجھ پن کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد اجنبی مہمانوں کی محفل میں آ بیٹھتی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں خود قرآن یہ کہتا ہے کہ

---

[1] قربان جائیے اس "قرآنی سمجھ بوجھ" کے کہ ازواج محمدؐ کا طرز عمل اُن ہی کے لئے خاص ہے جس میں امت کے لئے کوئی نمونہ پیروی نہیں مگر زوجۂ ابراہیمؑ کے طرزِ عمل سے دلیل اخذ کی جا رہی ہے اور امت محمدیہ کے لئے انہیں نمونہ پیروی بنایا جا رہا ہے۔ استدلال کا یہ دوغلا پن بھی خوب ہے؟

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ ؕ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ (۲۴/۶۰)

جن عورتوں کی جوانیاں ڈھل چکی ہوں۔ نکاح کی آس ختم کر بیٹھی ہوں وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھدیں توان پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں توان کے حق میں اچھا ہے اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔

بہرحال حضرت سارہ رضی اللہ عنہا (زوجۂ محترمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے واقعے سے اگر اجنبی لوگوں کی محفل میں شریک ہونے کی گنجائش نکلتی بھی ہے تو وہ بڑی بوڑھیوں کے لئے ہے جن کی موجودگی صنفی جذبات میں اشتعال پیدا نہیں کرتی نہ کہ ہر عمر کی عورت کے لئے۔

## قرآن اور مخلوط معاشرت

مخلوط سوسائٹی ایک ایسی معاشرت ہے جس کی نفی پر اسلام اپنا نظامِ حیات مرتب کرتا ہے وہ جو ہدایات بھی دیتا ہے یہ طے کرتے ہوئے دیتا ہے کہ اہل ایمان کے معاشرے میں مخلوط مجالس اور مشترک محافل کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے قرآن کی یہ آیت اس کو واضح کر دیتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ (۴۹/۱۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔

سوال یہ ہے کہ اس آیت میں مردوں کو مردوں سے اور عورتوں کو عورتوں سے مذاق کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن عورتوں کو مردوں کا مذاق اڑانے سے یا مردوں

کو عورتوں کا مذاق اڑانے سے باز رکھنے کا ذکر تک نہیں ہے کیا اس کو ایسا کرنے کی کھلی اجازت پر محمول کر لیا جائے؟ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ اسلام ان ہدایات کو جاری کرنے سے پہلے ہی یہ طے کر چکا ہے کہ اسلامی معاشرے میں مخلوط مجالس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے اس لئے وہ مخلوط معاشرت سے متعلقہ ہدایت و حکم دیتا ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ہدایات و تعلیم کا انداز ہی ایسا ہوتا ہے جو مخلوط معاشرت کی نفی پر دال ہو۔

## دوسری فصل: اجتماعی عبادات اور مخلوط مجالس

وہ عبادات جو ایک خاص شکل و صورت اور طرز و طریقہ پر انجام دی جاتی ہیں ان میں سے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا مقام بہت نمایاں ہے اگرچہ یہ عبادات انفرادی طور پر ہر مسلمان پر فرض کی گئی ہیں مگر ان کی ادائیگی ایک اجتماعی نظام ہی میں ہوگی مثلاً نماز با جماعت کے لئے مساجد کا اہتمام کیا گیا ہے جہاں اجتماعی طور پر اس عبادت کو انجام دیا جاتا ہے۔ روزہ اور زکوٰۃ ایسی اجتماعی عبادات ہیں جن میں مرد و زن کے اختلاط و اجتماع کا کوئی موقع نہیں پایا جاتا ہے ان ہر دو عبادت میں اجتماعیت کا پہلو صرف وقت کے اعتبار سے ہے یا ہیئتِ حاکمہ کے نظم کے لحاظ سے ہے روزہ رکھتے ہوئے صنفین کو کسی مقام پر یکجا نہیں ہونا پڑتا۔ اسی طرح زکوٰۃ میں بھی اختلاط مرد و زن کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے اجتماعی نظام میں ہیئتِ حاکمہ مسلم اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کرتی ہے اور ناداروں کو عطا کرتی ہے، البتہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس کے لئے ایک ہی وقت اور ایک ہی مقامِ اجتماع مقرر کیا گیا ہے اور تمام دنیا سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے ہیں اور مکہ میں واقع بیت العتیق کی زیارت کرتے ہوئے مناسکِ حج ادا کرتے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہے کہ جو عبادات مقام واحد میں اجتماعی طور پر ادا کی جاتی ہیں وہ صرف نماز اور حج ہیں۔

## نماز میں "اختلاطِ صنفین" کی حقیقت

جہاں تک نماز کا تعلق ہے اس کی باجماعت اقامت کا اہتمام، پابندیٔ وقت کے ساتھ مساجد میں کیا گیا ہے۔ عہد نبویؐ میں خواتین بھی اس فریضے کی بجا آوری کے لئے (پانچ اوقات میں سے کسی وقت) مسجد میں حاضر ہوتی تھیں۔ کیا عہد نبوی میں نماز ادا کرنے کے لئے مساجد میں آنے والے حضرات وخواتین "مخلوط مجالس" اور "مشترک محافل" قائم کیا کرتے تھے؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہم تین عنوانات کے تحت بحث کریں گے۔

۱۔ پنج وقتہ نمازوں میں "مخلوط مجالس" کی حقیقت۔ ۲۔ نماز جمعہ میں "اختلاطِ صنفین" کی حقیقت۔ ۳۔ نماز عیدین میں "مخلوط محافل" کی حقیقت۔

### ۱۔ نماز پنجگانہ اور مخلوط مجالس

یقیناً قرآن نے نماز پنجگانہ کی اقامت کا فریضہ ہر مسلم مرد اور مسلمان عورت پر عائد کیا ہے اور مردوں کے لئے اس فریضے کی بجاآوری کے لئے مسجد کا بھی اہتمام کیا ہے عہدِ نبوی میں خواتین بڑے ذوق وشوق سے مسجد نبوی میں اقامت صلوٰۃ کے لئے حاضر ہوا کرتی تھیں۔ مگر "مخلوط مجالس" کا وہاں کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ عورتیں، مردوں میں ان کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر کھڑی نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان سے جدا ہو کر اپنی صفیں بنایا کرتی تھیں۔ مردوں کی جداگانہ صف بندی میں خواتین اور خواتین کی جداگانہ صف بندی میں مرد ہرگز ہرگز شامل نہیں ہوتے تھے۔ صحیح بخاری کی اس روایت کو محترم عثمانی صاحب نے بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔

> "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خواتین کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رہتا تھا چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ
>
> فظن انه لم يسمع النساء فوعظهن وامرهن بالصدقة
>
> (بخاری۔ کتاب العلم۔ باب عظة الامام النساء وتعليمهن)
>
> ترجمہ [حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ شاید آپ عورتوں کو

اپنی بات نہیں سنا سکے تو آپ (عورتوں کے قریب تشریف لے گئے اور)
انہیں نصیحت فرمائی اور انہیں صدقہ و خیرات کرنے کا حکم دیا]

(فقہ القرآن ج ۳ صفحہ ۱۵۸)

ہم نے یہ روایت صحیح بخاری سے پیش کرنے کی بجائے محترم عثمانی صاحب کی کتاب ہی سے پیش کی ہے ترجمہ بھی انہیں کا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ مردوں اور عورتوں کے مابین کم ازکم اتنا فاصلہ ضرور تھا کہ حضورؐ کو اولاً یہ گمان ہوا کہ آپ کی بات عورتوں تک نہیں پہنچ پائی۔ ثانیاً آپ اپنی بات ان تک پہنچانے کے لئے خود تشریف لے گئے وہیں کھڑے کھڑے آپ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اپنی آواز کو بلند کر کے ان تک اپنے فرمودات پہنچا دیئے جائیں۔ محض مسجد میں عورتوں کا مردوں کے ساتھ شریکِ عبادت ہو جانے سے "مشترک مجالس" اور "مخلوط محافل" کی دلیل کشید کرنا بے جا سخن سازی ہے۔ یہ تو تھی عہد نبویؐ میں مسجد نبویؐ میں "مخلوط مجالس" کی حقیقت!

## خواتین کے لئے دخول مسجد کی شرائط

لیکن یہ بات فراموش نہ کیجئے کہ جو خواتین مسجد نبویؐ میں آتی تھیں انہیں چند شرائط کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا جس کے بغیر مسجد میں ان کا داخلہ ممنوع تھا۔

اولاً ــــــ یہ کہ وہ دن کے اوقات میں نہ آئیں رات کی تاریکی میں آئیں۔

عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ائذنوا للنساء باللیل الی المساجد "عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عورتوں کو اوقاتِ شب میں آنے کی اجازت دو۔"

(جامع بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ)

تاریکی کی نمازوں میں عشاء اور فجر کی نمازیں شامل ہیں، عشاء کا تاریکی میں پڑھا جانا تو ظاہر ہی ہے مگر عہدِ نبویؐ میں نماز فجر کا بھی یہی حال تھا وہ علی الصبح اس قدر تاریکی میں پڑھی جاتی تھی کہ جب عورتیں نماز کے بعد گھروں کو لوٹتی تھیں تو اندھیرے کے باعث وہ پہچانی نہیں جاتی تھیں تاریکی میں خواتین کو مسجد میں آنے کی اجازت دینے میں

کیا مصلحت ہے ؟

قال نافع مولیٰ ابن عمر وکان اختصاص اللیل بذالك لکونه استروا خفی " حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شاگرد خاص حضرت نافع کہتے ہیں رات کی تخصیص اس لئے ہے کہ رات کی تاریکی میں خواتین کی اچھی طرح پردہ داری ہوسکتی ہے۔" (فتح الباری ج ۲ ص ۳۴۸)

ثانیاً ——— یہ کہ مسجد میں وہ بن سنور کر اور سج دھج کر نہ آئیں۔

عن ابی ھریرۃ قال انی سمعت حبی ابا القاسم یقول: لاتقبل صلوٰۃ امرءۃ تطیبت للمسجد حتی تغتسل غسلھا من الجنابۃ۔ (سنن ابی داؤد، نسائی، احمد) " ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو عورت مسجد کے لئے خوشبو لگائے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی یہاں تک کہ غسل جنابت کی طرح بدن کو دھو ڈالے۔"

اس سے ملتی جلتی ایک روایت موطا امام مالک اور سنن ابن ماجہ میں بھی ہے۔

ثالثاً ——— یہ کہ عورتوں اور مردوں میں اختلاط نہ ہونے پائے خواتین و حضرات کی جداگانہ صف بندی کے اہتمام کے ساتھ ساتھ حضور اکرمؐ نے ان دونوں اصناف کے باہمی فاصلے کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی ترغیب ان الفاظ میں دی ہے۔

خَيْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ اَوَّلُهَا وَشَرُّهَا اٰخِرُهَا وَخَيْرُ صُفُوْفِ النِّسَآءِ اٰخِرُهَا وَشَرُّهَا اَوَّلُهَا۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ) " مردوں کی صفوں میں سے بہترین صف وہ ہے جو آگے ہو اور بدترین وہ ہے جو سب سے پیچھے ہو عورتوں کی صفوں میں سے بہترین صف وہ ہے جو سب سے پیچھے ہو اور بدترین وہ ہے جو سب سے آگے ہو۔"

مردوں کی صف اول کے بہترین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو پہلی صف بجائے خود فضیلت رکھتی ہے ثانیاً یہ کہ عورتوں کی مخالطت سے وہ شخص محفوظ ہو جاتا ہے جو پہلی

صف میں جگہ پالیتا ہے۔ اور اسی طرح عورتوں کی آخری صف کو بہترین اس لئے قرار دیا کہ وہ مردوں کی صفوں سے بعید ترین فاصلے پر واقع ہوتی ہے۔

صف بندی کے سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قاعدہ بھی جاری فرمایا کہ مرد اور عورت شانہ بشانہ ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھیں خواہ وہ شوہر اور بیوی یا ماں اور بیٹے یا بھائی اور بہن یا باپ اور بیٹی ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ بخاری میں یہ روایت ہے کہ

عن انس بن مالکؓ قال صَلَّیْتُ اَنَا وَ یَتِیْمٌ فِی بَیْتِنَا خَلْفَ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم و امی ـــ ام سلیم ـــ خَلْفَنَا۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الاذان، باب المرءۃ وحدہا تکون صَفًّا) "حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ میں نے اور یتیم نے اپنے گھر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی اور میری ماں ـــ ام سلیم ـــ ہم دونوں کے پیچھے تھی۔"

رابعًا ـــ عورتیں نماز میں آواز بلند نہ کریں حتیٰ کہ اگر وہ امام کی کسی غلطی پر بھی اسے متنبہ کرنا چاہیں تو زبان سے آواز نکالنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ایسا کریں مرد البتہ "سبحان اللہ" کہہ کر اسے لغزش سے آگاہ کر سکتے ہیں۔

(سنن ابی داؤد۔ باب التصفیق فی الصلوٰۃ)

ان شروط اربعہ کے بعد حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ اہتمام بھی فرمایا کرتے کہ آپ مردوں کے ساتھ کچھ عرصے تک مسجد ہی میں تشریف فرما رہتے تاکہ اس اثناء میں خواتین اپنے گھروں کو چلی جائیں۔

عن ام سلمۃ قالت" کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اذا سلم قام النساء حین یقضی تسلیمہ ویمکث ھو فی مقامہ یسیرا قبل ان یقوم۔ قال نری۔ واللہ اعلم۔ ان ذلک کان لکی ینصرف النساء قبل ان یدرکھن احد من الرجال" (صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب صلوٰۃ النساء خلف الرجال) "ام سلمہ سے روایت ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے اور ان کے سلام کے ختم ہوتے ہی عورتیں اٹھ کھڑی ہوتیں مگر آپ تھوڑی دیر کے لئے وہیں تشریف فرما رہتے اور بعد میں اٹھتے۔ راوی کہتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ ایسا اس لئے کرتے تھے کہ عورتیں اس سے قبل کہ مرد ان سے مل پائیں وہاں سے واپس چل پڑیں۔"

علاوہ ازیں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاط مرد و زن کو روکنے کے لئے یہ انتظام بھی فرمایا کہ مسجد میں خواتین کے دخول و خروج کے لئے الگ دروازہ مخصوص فرمایا۔

عن نافع عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو ترکنا ھٰذا الباب للنساء۔ قال نافع فلم یدخل فیہ ابن عمر حتی مات۔ (ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب اعتزال النساء فی المساجد عن الرجال) "نافع عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیوں نہ اس دروازے کو خواتین کے لئے (مخصوص) چھوڑ دیا جائے۔" (پھر آپ نے ایسا ہی کیا)۔ نافع کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن عمر زندگی بھر اس دروازے سے نہیں گزرے۔"

ان تمام امور کو سامنے رکھیئے اور دیکھئے کیا واقعی عہد رسالت مآبؐ میں مساجد میں اختلاطِ مرد و زن پایا جاتا تھا؟ اگر انسان اللہ و رسول کو ہدایت دینے کی بجائے ان سے ہدایت لینے کا خواہاں ہو تو اسے ماننا پڑے گا کہ قرآن اور نبیٔ قرآن نے جب مساجد تک میں "مخلوط سوسائٹی" کو روا نہیں رکھا تو خارج از مساجد وہ کیسے اس کا علمبردار ہو سکتے ہیں؟

## ۲۔ نمازِ جمعہ اور مخلوط مجالس

نمازِ جمعہ کا اجتماع امتِ مسلمہ کے لئے ایک ہفتہ وار اجتماع کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ خطیب اپنے خطبے کے ذریعے اہلِ ایمان کو فکری راہنمائی عطا کرے

تاکہ مسلمانوں میں ہدایتِ خداوندی اور احکامِ ایزدی کا علم تر و تازہ ہوتا رہے ہیں ان کے قلب و دماغ میں خوفِ الٰہی اور آخرت میں باز پرس کا احساس زندہ اور بیدار رہے۔ عہدِ نبویؐ میں خواتین پنجگانہ نمازوں میں سے صرف ان نمازوں کے لئے مسجد میں حاضر ہوتی تھیں جو تاریکی میں پڑھی جاتی ہیں لیکن جمعہ کی نماز کے لئے جو دن میں پڑھی جاتی ہے اس میں بھی شریک ہونے کی شارع نے اجازت دی ہے بشرطیکہ خواتین انہی شرائط کو ملحوظ رکھیں جو عام نمازوں کو مساجد میں ادا کرنے کے سلسلے میں جاری کی گئی ہیں اب ظاہر ہے کہ نماز جمعہ کے لئے ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے "مخلوط مجالس" کا وجود ہی قائم نہیں ہو پاتا جسے ہمارے مستغربین محض "مسجد میں نماز جمعہ میں خواتین کی شرکت" کے الفاظ سے پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

## فرضیت نماز جمعہ کی بحث

نفسِ نماز پنجگانہ تو یقیناً ہر مرد اور ہر عورت پر واجب و لازم ہے مگر ہر مسلمان مرد کی طرح ہر مسلم خاتون پر یہ واجب نہیں کہ وہ لازماً مردانہ مسجد ہی میں جا کر نماز ادا کرے، لیکن نماز جمعہ کی حیثیت قدرے مختلف ہے بعض لوگ نماز جمعہ کے اس حکم کا جو مذکر کے صیغوں میں دیا گیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو مخاطب سمجھتے ہیں اس لئے نماز جمعہ کا وجوب دونوں اصناف پر یکساں سمجھتے ہیں لیکن بعض علماء سورۂ جمعہ کے اس حکم کو صرف مردوں کے لئے خاص سمجھتے ہیں اور دلیل میں اس حدیث کو پیش فرماتے ہیں جس میں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے۔

الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة الا اربعة عبد مملوك او امرأة او صبي او مريض۔ (ابوداؤد۔ باب الجمعہ للملوک و المرأۃ) "نماز جمعہ جماعت کے ساتھ ادا کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے ماسوا چار افراد کے عبد مملوک، عورت، بچہ اور مریض۔"

نماز جمعہ کی فرضیت و وجوب کے متعلق محترم عثمانی صاحب اس نقطۂ نظر کے قائل ہیں جو انہوں نے اسی آیت کے ضمن میں ارشاد فرمایا ہے۔

"اس آیت کریمہ (نمبر ۹) میں تمام مومنین کو خطاب ہے جس کے مرد بھی مخاطب ہیں اور عورتیں بھی۔ لہٰذا قرآن کی اس آیت سے تو واضح طور پر عورتوں پر بھی جمعہ کی فرضیت ثابت ہو رہی ہے ورنہ ماننا پڑے گا کہ جب یَاۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا سے خطاب کیا جائے تو اس کے مخاطب صرف مرد ہی ہوا کرتے ہیں اس طرح تو عورتوں کو قرآن شریف کے بے شمار احکام سے چھٹی مل جائے گی قرآن کریم مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کرتا ہے اور جب مشترک مجمع کو خطاب کیا جاتا ہے تو مذکر کے صیغے ہی استعمال کیئے جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہاں بھی ہے۔ لہٰذا عورتوں پر صلوٰۃ الجمعہ فرض ہے اور انہیں جمعہ پڑھنا چاہیئے خواہ مردوں کے ساتھ ان کی جامع مسجدوں میں خواہ اپنی جداگانہ قائم کردہ مسجدوں میں کسی عورت کی امامت میں" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۰۴)

اس کے جواب میں اگر کہا جائے کہ یہاں واقعی الفاظ مرد و زن دونوں کو شامل ہیں لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اطلاق کو مقید اور عام کو خاص کر کے مردوں تک محدود کر دیا ہے تو محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ـــــ "سنت سے کتاب اللہ کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید نہیں کیا جا سکتا" ـــــ ان کا اصل اقتباس یہ ہے۔

"دلائل شرعیہ کی ترتیب یوں ہے اول کتاب اللہ دوم سنت رسول اللہ سوم اجماع چہارم قیاس۔ تو جب سنت سے کتاب اللہ کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید نہیں کیا جا سکتا تو تیسرے درجے کی دلیل یعنی اجماع سے یہ کیسے ممکن ہو سکے گا" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۳۱)

لیکن محترم عثمانی صاحب خود جہاں چاہیں قرآن کے مطلق کو مقید اور عام کو خاص فرما ڈالتے ہیں۔ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

حج کے موقعہ پر قرآن میں حلق رأس اور تقصیر رأس کا ذکر مذکر ہی کے صیغوں میں

ہے جو ظاہر ہے کہ عثمانی صاحب کی تصریحات کے مطابق مرد و زن دونوں کو شامل ہے
مگر یہاں وہ یہ فرماتے ہیں کہ

"واضح ہے کہ حلق کا حکم صرف، مردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے سر
منڈانا مکروہ ہے سر کے بال عورت کی زینت ہوتے ہیں ان کو ضائع نہیں
کرنا چاہیئے وہ اپنے بالوں کی ذرا ذرا سی پھنگلیں کتر دیں ان کے لئے اتنا
ہی کافی ہے" (فقہ القرآن ج ۱ ص ۴۰۹)

اس مثال میں محترم عثمانی صاحب نے مذکر کے صیغوں میں دیئے جانے والے
حکم کو (جس کے متعلق وہ جگہ جگہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں اصناف بشر کے لئے ہیں)
صرف مرد تک خاص کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہاں قرآن کریم کے مطلق حکم
کو مقید یا عام حکم کو خاص کس دلیل کی بنا پر کیا ہے۔ اس کے چار ہی ممکن جواب ہو سکتے ہیں۔

۱ــــ اگر وہ یہ جواب دیں کہ ان قرآنی احکام کو قرآن ہی سے مقید اور مخصوص کیا گیا
ہے تو از راہِ کرم دلیل اور حوالہ پیش فرمائیے هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ

۲ــــ اگر وہ یہ جواب دیں کہ ــــ "ہم نے سُنّتِ نبویؐ سے قرآن کے حکم کے اطلاق
اور عمومیت کو توڑ کر تقیید اور تخصیص کی ہے" ــــ تو یہ جواب ان کے اپنے اس ارشاد
کے منافی ہے کہ

"سنت سے کتاب اللہ کے عام اور مطلق کو خاص اور مقید نہیں کیا
جا سکتا" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۳۱)

۳ــــ اگر وہ یہ فرمائیں کہ ــــ "اس قرآنی حکم کو اجماع سے مقید اور مخصوص کیا گیا
ہے" ــــ تو ہم انہیں کے الفاظ میں عرض کریں گے کہ

"جب سنت سے کتاب اللہ کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید نہیں
کیا جا سکتا تو تیسرے درجے کی دلیل یعنی اجماع سے یہ کیسے ممکن ہو سکے گا"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۳۱)

۴ــــ اگر ان کا جواب یہ ہو کہ ــــ "اس قرآنی حکم کو قیاس سے مقید اور مخصوص کیا

گیا ہے تو ہم عرض کریں گے کہ جس کے اطلاق اور عمومیت کو سنت نبوی اور اجماع امت جیسی مضبوط دلیلیں نہ توڑ سکیں اسے قیاس جیسی کمزور دلیل کس طرح توڑ سکتی ہے۔

یہ تو تھا الزامی جواب! اس کے بعد اس مسئلے پر تفصیلی بحث ملاحظہ فرمائیے۔

محترم عثمانی صاحب کی دلیل کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ

"قرآن کریم مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کرتا ہے اور جب مشترک مجمع کو خطاب کیا جاتا ہے تو مذکر کے صیغے ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۰۴)

یقیناً جب مجمع مشترک ہو تو مذکر کے خطاب میں مرد و زن دونوں شامل ہوں گے مگر جہاں مجمع صرف صنفِ رجال پر مشتمل ہو وہاں محض مذکر کے صیغوں کے زور پر خواتین کو بھی شامل خطاب کرنا ایک سینہ زوری ہے۔

نماز جمعہ کی فرضیتِ نسواں کی تفصیلی بحث سے قبل مندرجہ ذیل امور توجہ طلب ہیں۔

۱ ــــ عورت کا اصل مستقر اور دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری میں واقع ہے اس کے شرعی فرائض ہوں (مثلاً عبادات وغیرہ) یا طبعی و فطری وظائف (مثلاً ولادت و پرورش اور تربیتِ اطفال وغیرہ) یہ سب کچھ وہ گھر ہی میں سرانجام دیتی ہے اسے اس بات کا حکم نہیں ہے کہ وہ نماز مساجد میں جا کر پڑھے صرف اجازت ہے اور وہ بھی چند شرائط کے ساتھ شوہر کی رضامندی پر موقوف ہے۔ جیسا کہ تفصیلاً گزر چکا ہے۔ علاوہ ازیں عورت کو شارع نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کی نماز جو گھر میں ادا ہو اس نماز سے افضل ہے جو مسجد میں ادا ہو اس کے برعکس مرد کی مسجد میں پڑھی جانے والی نماز گھر میں ادا ہونے والی نماز پر فضیلت و فوقیت رکھتی ہے۔

۲ ــــ مساجد، اصلاً مردوں کے لئے عبادت گاہیں ہیں عورتوں کے لئے نہیں کیونکہ مردوں کو گھروں میں نماز پڑھنے کی بجائے مسجد میں پڑھنے کی ترغیب بلکہ تاکید کی گئی ہے خواتین کو اگر مساجد میں آنے کی اجازت دی بھی گئی ہے تو تمام نمازوں کے لئے نہیں بلکہ

صرف انہی نمازوں کے لئے جو تاریکی میں پڑھی جاتی ہیں اس سے یہ بات واضح ہے کہ مساجد کی تعمیر اصلاً صنف ذکور ہی کے لئے ہے، ان کو خواتین وحضرات کی مشترک عبادت گاہ بنانا مقصود و مطلوب نہیں ہے۔ خود قرآن بھی ان کی یہی حیثیت قرار دیتا ہے۔ وہ مسجد نبوی یا مسجد قباء (جو ہجرت کے بعد تعمیر ہوئی تھیں) کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا [اس میں ایسے مرد (رجال) ہیں جو پاکیزگی کو محبوب رکھتے ہیں] اگر مساجد اصلاً دونوں اصناف بشر کے لئے عبادت گاہیں ہوتیں تو قرآن "رجال" کی بجائے ایسے الفاظ استعمال کرتا جو دونوں اصناف بشر کے لئے مستعمل ہوتے مثلاً "الناس" وغیرہ۔

اب جبکہ یہ واضح ہو گیا کہ مساجد ہیں ہی مردانہ عبادت گاہیں تو ان کی طرف مذکر کے صیغوں سے جن کو بلایا جائے گا ان سے مراد بالیقین مرد حضرات ہی ہوں گے نہ کہ خواتین فلہٰذا جب قرآن یہ کہتا ہے کہ

> "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو" (۶۲/۹)

تو اس خطاب کے مخاطب صرف مرد ہوتے ہیں عورتیں اس میں شامل نہیں ہوتیں۔ اس پر یہ قرینہ بھی دال ہے کہ آیت میں بیع (خرید و فروخت) چھوڑ دینے کا بھی حکم ہے۔ اس کے بعد نماز کے اختتام پر انہیں "روزی کمانے" کا امر بھی ہے اور آخر میں تجارت کا بھی ذکر ہے۔ بیع و تجارت وہ اعمال ہیں جو مردانہ میدانِ کار ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود محترم عثمانی صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ معاشی امور مرد کے میدان عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ رہا قرآن تو وہ بھی بیع و تجارت کو مردوں ہی کا فعل قرار دیتا ہے۔ سورۂ نور میں ہے کہ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ [یہ وہ مرد (رجال) ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت (ان کے دیگر فرائض سے) غافل نہیں کرتی]

ہماری اس بحث سے یہ بات واضح ہے کہ نماز جمعہ کے لئے دیئے جانے والے حکم کے مخاطب صرف مرد ہی ہیں عورتیں اس خطاب میں شامل نہیں ہیں لہٰذا نماز جمعہ کے لئے مساجد میں آنا ان پر فرض و واجب نہیں ہے۔

یہاں یہ امر وضاحت طلب ہے کہ نماز بجائے خود بھی فرض ہے اور اس کا باجماعت ادا کرنا بھی واجب ہے مگر صرف مردوں کے لئے خواتین کے لئے مردانہ مساجد میں نماز ادا کرنا۔ فرض یا واجب نہیں ہے ان پر صرف نماز فرض یا واجب ہے وہ اسے گھر میں ادا کریں یا اپنی کسی زنانہ مسجد میں ـــــ مگر جمعہ کی نفس نماز عورتوں پر آیت ۶۲/۹ کی روشنی میں سرے سے واجب ہے ہی نہیں کہ آیت کے مخاطب صرف مرد ہیں۔

## آمدم برسر مطلب

ہماری یہ بحث طوالت اختیار کر گئی اصل زیر بحث مسئلہ نماز جمعہ میں خواتین کی شرکت سے "مخلوط مجالس" سے متعلق تھا۔

چونکہ نماز جمعہ عورتوں پر مسجد میں باجماعت ادا کرنا فرض نہیں ہے اور اگر عہد نبوی میں خواتین مسجد میں آتی بھی تھیں تو امر واجب کے امتثال کے لئے نہیں آتی تھیں، بلکہ محض اس سعادت کو پانے کے لئے آتی تھیں جو خیر المساجد میں، خیر الائمہؐ کی اقتدا میں نماز پڑھنے سے انہیں حاصل ہوتی تھی اور ان کی یہ آمد بھی انہی شرائط اور انہی اہتمامات نبویؐ کے ساتھ تھی جو پہلے بیان ہو چکے ہیں اس لئے نماز جمعہ کی جگہ میں بھی "مخلوط مجالس" کا کوئی وجود متحقق نہیں ہوتا ہے۔ جو ہمارے تجدد پسند حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

## ۳۔ نماز عیدین اور "مخلوط اجتماعات"

نماز عیدین میں خواتین کی شرکت کے بارے میں احکام میں قدرے فرق ہے۔ نماز پنجگانہ اور نماز جمعہ میں خواتین کو یہ ترغیب دینے کے بعد کہ ان کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد کی نسبت افضل ہے۔ انہیں چند شرائط کے ساتھ شوہروں کی اجازت سے مسجد میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن عیدین کی نماز کے لئے خواتین کو حاضر ہونے کے لئے تاکید سے کام لیا گیا ہے۔

عن ام عطیۃ "امرنا ان نخرج العواتق وذوات الخدور" وعن ایوب عن حفصۃ بنحوہ وزاد فی حدیث حفصۃ "العواتق وذوات الخدور ویعتزلن الحیض المصلی"

(صحیح بخاری۔ کتاب العیدین۔ باب خروج النساء والحیض الی المصلی) "ام عطیہ فرماتی ہیں کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم بالغ اور پردہ نشین خواتین کو (عیدگاہ کے لئے) گھروں سے نکالیں، حفصہؓ کی روایت جو ایوب کے واسطہ سے ہے اس میں بھی ایسا ہی (مضمون) ہے مگر حفصہ کی حدیث میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ "بالغ اور پردہ دار عورتوں کو عیدگاہ کے لئے نکالیں۔ حیض والی خواتین (اجتماع عیدین میں تو) شامل ہوں مگر نماز سے الگ رہیں۔"

محترم عثمانی صاحب نے بھی فقہ القرآن میں یہ روایت ثبت فرمائی ہے کہ "حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں ہم کنواری جوان لڑکیوں اور حیض والی عورتوں سب کو عیدگاہ لے جائیں جن عورتوں کو ایام آرہے ہوں وہ صلوٰۃ عید سے الگ رہیں حضرت ام عطیہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم میں سے بعض عورتوں کے پاس اوڑھنے کی چادر نہیں ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایسی عورتوں کو ان کی بہنیں اپنی چادر اوڑھا دیں۔ (فقہ القرآن ج ۳ ص۱۵۷)

محترم عثمانی صاحب کی اس عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ تمام مضمون ایک ہی روایت کا ہے حالانکہ یہ دو مختلف روایات کا مفہوم ہے جسے غالباً انہوں نے یکجا کر کے مفہوم مشترک کے طور پر بیان کر دیا ہے بہرحال ان دونوں روایتوں میں "ذوات الخدور" کا ترجمہ جملہ مترجمین نے "پردہ دار خواتین" یا "پردہ نشین خواتین" کے الفاظ سے کیا ہے۔ مگر محترم عثمانی صاحب نے اس لفظ کا ترجمہ کرنے سے جس مصلحت

کی بنا پر گریز کیا ہے اسے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

ان روایات حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز جمعہ اور دیگر عام نمازوں کی نسبت نماز عیدین کے لئے خواتین کو نکلنے کی تاکید زیادہ پائی جاتی ہے یہاں تک کہ جو خواتین حیض کے باعث نماز نہ پڑھ سکنے کی پوزیشن میں ہوں وہ بھی عیدگاہ پہنچیں علاوہ ازیں، مسلمان بچوں کو بھی عیدگاہ جانے کے لئے کہا گیا، چنانچہ امام بخاری نے اپنی "جامع صحیح بخاری" میں یہ عنوان قائم کر کے کہ "خروج الصبیان الی المصلیٰ ____ (بچوں کا عیدگاہ کو نکل جانا) حضرت عبداللہ بن عباس کا (جو اس وقت بچے تھے) حضورؐ کی معیت میں نماز عید میں شمولیت کا ذکر کیا ہے۔ کیا اجتماع عید میں حاضری اہل ایمان پر فرض ہے؟ جس کی اس قدر تاکید فرمائی گئی ہے؟ بعض علماء اس کے وجوب کے قائل ہیں لیکن یہ بعید از حقیقت ہے اگر نماز عید کا پڑھنا یا اجتماع عید میں شامل ہونا فرض یا واجب ہوتا تو غیر مکلف لوگوں کو (مثلاً اطفال اور حائضہ خواتین کو) اجتماع عیدین میں شمولیت کا حکم نہ دیا جاتا۔ تب اس کی علت کیا ہے؟ اس کا جواب بخاری کی اس روایت میں ہے۔

قالت ام عطیہ" امرنا ان نخرج فنخرج الحیض والعواتق وذوات الخدور ---- فاما الحیض فیشھدن جماعة المسلمین ودعوتھم یعتزلن مصلاھم (صحیح بخاری، کتاب العیدین باب اعتزال الحیض المصلی) " ام عطیہ نے فرمایا" ہمیں عیدگاہ کو نکلنے کا حکم دیا گیا تو ہم حائضہ عورتوں، جوان مستورات، اور پردہ نشین خواتین کو (عیدگاہ کی طرف) لے جاتیں ---- رہی حائضہ خواتین تو وہ جماعت مسلمین (اجتماعِ اہل اسلام) اور ان کی دعاؤں میں شریک ہوتی تھیں مگر نماز سے الگ رہتی تھیں۔"

ان الفاظ کی شرح میں حافظ ابن حجر ارشاد فرماتے ہیں کہ

"فظھر ان القصد منه اظھار شعار الاسلام بالمبالغة فی

الاجتماع لتعم الجميع البركة " (فتح الباری ج ۲ ص۴۷۰) "پس اس سے یہ ظاہر ہے کہ (عورتوں اور بچوں کا عیدگاہ میں آنا) محض اس مقصد کے تحت تھا کہ اجتماع خوب کثیر ہو اور شعار اسلام کا اظہار ہو اور سب پر برکت عام ہو"

اب رہا یہ امر کہ کیا نماز عیدین میں خواتین و حضرات عہد نبوی میں شانہ بشانہ مل جل کر بیٹھتے تھے یا الگ الگ؟ تو اس موضوع پر ہم محترم عثمانی صاحب کا ہی ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلوٰۃ عید میں، عید کے دن حاضر تھا تو آپ نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھائی جس میں نہ اذان تھی نہ اقامت پھر بلال کے سہارے ٹیک لگا کر آپ کھڑے ہوئے اور تقویٰ الٰہی کا حکم فرمایا اور لوگوں کو اللہ کی فرمانبرداری کی ترغیب دی اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرمائی، پھر آپ گئے اور عورتوں کے پاس پہنچ کر انہیں نصیحت فرمائی خدا کو یاد دلایا اور فرمایا صدقہ کرو" (فقہ القرآن ج ۳ ص۳۲۰)

محترم عثمانی صاحب نے یہ روایت چہرے کے عدم حجاب کی دلیل کے طور پر پیش کی ہے ظاہر ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو یہ ثابت کرے کہ اس میں مذکور واقعہ نزول حکم حجاب کے بعد کا واقعہ ہے نزول حجاب سے قبل کے واقعات کو دلیل بنانا مغالطہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔ یہی حال ان تمام واقعات کا ہے جو عدم ستر وجوہ کے متعلق عثمانی صاحب نے بیان کئے ہیں یعنی یہ سب واقعات حکم حجاب کے نزول سے قبل کے واقعات ہیں۔

بہرحال محترم عثمانی صاحب کا یہ اقتباس اس بات کو واضح کرتا ہے کہ نماز عید میں عورتیں اور مرد حضرات مخلوط ہو کر نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ علیحدہ علیحدہ مقامات پر نماز ادا کرتے تھے۔ محترم عثمانی صاحب کے یہ الفاظ کہ ــــــ "پھر آپ گئے اور عورتوں

کے پاس جاکر انہیں نصیحت فرمائی"۔۔۔۔۔اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتے ہیں کہ "مخلوط مجالس" یا "مشترک محافل" کا وجود، عہدِ نبوی میں نہ تھا۔ بلکہ نماز کے لئے بھی (خواہ عام پنجگانہ نمازیں ہوں یا جمعہ و عید کی نمازیں ہوں) عورتوں اور مردوں کی جداگانہ صفوں میں فاصلہ ضرور حائل ہوتا تھا۔

## حج اور مخلوط مجالس

حج ایک ایسی عبادت ہے جو پوری دنیا میں ایک ہی مقام پر ایک ہی وقت میں انجام دی جاتی ہے۔ اسلام چاہتا تو سال بھر میں وہ دو موسم مقرر کر دیتا ایک مردوں کے لئے اور دوسرا عورتوں کے لئے لیکن ایسا کرنے میں خواتین کو بالخصوص اور مردوں کو بالعموم سخت مشقت اور دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ کیونکہ خواتین کے لئے تن تنہا سفر کرنا آسان نہیں اس لئے ان کے ساتھ مردوں کا شریک سفر ہونا لازم ہے۔ ایک مرتبہ اگر وہ خواتین کو حج کرائیں اور دوسری مرتبہ خود حج کا سفر کریں تو یہ دوہری تکلیفِ سفر ان کے لئے سخت حرج اور تنگی کا باعث ہوتی دو مرتبہ کے سفروں پر معاشی اخراجات کا بار اس پر مستزاد ہوتا اس لئے رفعِ حرج اور ازالۂ تکلیف و مشقت کے لئے دونوں اصناف کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا۔ مگر حجاب و نقاب کی پابندیوں کو جو عورت کی عام زندگی میں واجب ہیں بہت حد تک نرم بلکہ کالعدم کر دیا گیا۔ نیز اس سے عورت کے لئے اپنے کسی محرم عزیز کے ساتھ سفرِ حج پر روانہ ہونے کی سہولت بھی پیدا ہو گئی جو مردوں اور عورتوں کے لئے جداگانہ اوقات میں حج کرنے کی صورت میں مفقود ہوتی۔ بہر حال یہ بات ہر حاجی کو معلوم ہے کہ پوری دنیا سے مسلمان مرد بھی اور عورتیں بھی لاکھوں کی تعداد میں حرم میں جمع ہوتے ہیں ان مواقع پر اگر یہ محال و ناممکن نہیں تو دشوار اور مشکل ضرور ہے کہ نقاب و حجاب اور معاشرتی عدم اختلاط کی پابندیوں کو نبھایا جائے اس لئے حج کے موقعہ پر شارع نے یہ رعایت دی ہے کہ احرام کی حالت میں چہرے کو نہ ڈھانپا جائے۔

کتب بخاری، مسند احمد اور ابوداؤد وغیرہ میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشاد موجود ہے کہ لا تنتقب المرأۃ المحرمۃ (احرام باندھنے والی عورت، نقاب نہ اوڑھے)۔ تاہم بعض انتہائی متقی اور پرہیز گار خواتین اس حالت میں بھی نقاب وحجاب کا اہتمام کیا کرتی تھیں۔ سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ ارشاد گرامی موجود ہے کہ

"کان الرکبان یمرون بنا ونحن مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محرمات فاذا حاذوا بنا سدلت احدانا جلبابھا علی وجھھا فاذا جاوزوا بنا کشفناہ۔" "سوار ہمارے پاس سے گزرتے تھے ہم احرام باندھے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھیں جب سوار ہمارے برابر ہوتے تو ہم میں سے ہر عورت اپنی جلباب (بڑی چادر) کو اپنے چہرے پر ڈال لیتی جب وہ گزر جاتے تو ہم نقاب اٹھا لیتیں۔"

لاکھوں کے اس اجتماع میں اگرچہ اختلاطِ صنفین سے بچنا از حد دشوار ہے تاہم بعض خواتین مردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔ بخاری میں ہے کہ

قال ابن جریج اخبرنی عطاء اذ منع ابن ھشام النساء الطواف مع الرجال قال کیف تمنعھن وقد طاف نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم مع الرجال قلت بعد الحجاب او قبل؟ قال ای لعمری لقد ادرکتہ بعد الحجاب قلت کیف یخالطھن الرجال قال لم یکن یخالطھن کانت عائشۃ تطوف حجرۃً من الرجال لا تخالطھم۔ (صحیح بخاری، کتاب الحج، باب طواف النساء مع الرجال)

ابن جریج نے کہا کہ مجھے عطا نے یہ خبر دی کہ جب ہشام نے خواتین کو مردوں کے ساتھ طواف کرنے سے منع کیا تو میں نے کہا کہ "آپ کس طرح منع کرتے ہیں جبکہ ازواج نبیؐ نے مردوں کے ساتھ طواف کیا ہے؟" میں نے پوچھا

کہ "کیا یہ معاملہ حجاب سے پہلے کا ہے یا بعد کا؟" انہوں نے کہا "میری زندگی کی قسم میں نے اس معاملے کو حجاب کے بعد پایا ہے۔" پھر میں نے پوچھا "یہ کس طرح؟ مرد خلا ملا تو کرتے ہی ہوں گے؟" انہوں نے کہا "مردان سے خلط ملط نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ مردوں سے ہٹ کر (کنارے پر رہ کر) طواف کرتی تھیں۔"

ہماری اس بحث سے یہ بات واضح ہے کہ

۱۔۔۔ حج کے موقع پر اختلاط صنفین کو روکنا اور خواتین کے لئے چہروں کو مستور و محجوب رکھنا چونکہ بہت سی عملی دشواریوں کا موجب ہے اس لئے شارع نے اس خاص موقع پر ان پابندیوں کو کالعدم کر دیا ہے جو عام زندگی میں ضروری اور لابدی ہیں۔

۲۔۔۔ اس کے باوجود قرون اولیٰ کی خواتین اسلام کے قانونی تقاضے کے تحت نہیں بلکہ اپنے تقویٰ و تدین کے باعث اس بات کی بھرپور کوشش کرتی تھیں کہ وہ اجنبی مردوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہوں۔ اور حالت احرام میں بھی بعض مواقع پر وہ اپنے چہروں کو نقاب میں چھپایا کرتی تھیں۔

قرون اولیٰ میں اور بالخصوص عہد نبوی میں حج کے مواقع پر بھی ایسا اختلاف ذکور و اناث ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا جیسا کہ آج کل تہذیبِ مغرب میں پایا جاتا ہے اور جس کی تقلید میں اب اسلام کا نئے رخ سے مطالعہ کیا جا رہا ہے۔

## نتیجۂ بحث

عبادات قصد الی اللہ، توجہ الی اللہ اور رغبت الی اللہ کا ذریعہ ہیں۔ ایک مرد مومن خواہ مسجد میں آئے یا عیدگاہ میں مسجد اقصیٰ کی زیارت کے لئے جائے یا خانہ کعبہ کے لئے وہ پاکیزہ جذبات، نیک خواہشات اور صالح عزائم کے ساتھ ان عبادت گاہوں کا رخ کرتا ہے۔ پاکیزہ بدن کے ساتھ، پاکیزہ لباس زیب تن کرتے ہوئے نیک ارادے اور پُرخلوص نیت کے ساتھ، وہ احکم الحاکمین کے حضور حاضر ہوتا ہے۔ ان مقامات پر بھی (جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے دوسرے حصوں کی نسبت اللہ کے محبوب ترین

مقامات قرار دیا ہے) اگر اسلام یہ گوارا نہیں کرتا کہ عورتیں اور مرد باہم خلط ملط ہو جائیں بلکہ ان میں اختلاطِ مرد و زن کو ناممکن بنانے والا راستہ اختیار کرتا ہے تو پھر مساجد کے باہر، بازاروں میں، کلبوں میں، تفریح گاہوں میں، ہوٹلوں میں، رقص گاہوں میں، دفتروں میں اور آرٹ کونسلوں میں وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ عورتیں اور مرد خلط ملط ہو کر رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن پردے کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ عثمانی صاحب کو قابل قبول نہیں وہ مغربی تہذیب سے چہرے کی عریانی اور بے پردگی کو لیتے ہیں اور "شرم و حیا" کے الفاظ کو اس کے ساتھ نتھی کر کے "شرعی پردہ" بنا ڈالتے ہیں۔ پورے جسم پہ چادر لپیٹ لینا اور چہرے کو ننگا رکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص گھر کی کھڑکیاں بند کر ڈالے اور مین گیٹ چوپٹ کھول دے۔ محترم عثمانی صاحب تہذیب مغرب کی پیروی میں "ماڈرن" بھی بننا چاہتے ہیں مگر قرآن سے ان کا جو نسلی اور آبائی تعلق (نہ کہ فکری اور نظریاتی تعلق) ہے۔ مسلم سوسائٹی میں رہتے ہوئے اسے برملا قطع کر دینے کی ہمت بھی اپنے اندر نہیں پاتے نتیجہ یہ کہ وہ کشمکش کا شکار ہیں۔ ؎

ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

## زنانہ مساجد اور امامتِ نسواں

محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"عورتوں کو اپنی مسجدیں بنانے اپنا امام اور مؤذن مقرر کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ ایسے تمام ادارے جہاں صرف عورتیں کام کرتی ہوں مثلاً زنانہ سکولز، زنانہ کالجز، زنانہ یونیورسٹیاں، زنانہ فیکٹریاں ان میں عورتوں میں سے کسی اہل اور قابل عورت کو اپنا امام مقرر کر کے باقاعدہ جماعت کے ساتھ صلوٰۃ ادا کرنی چاہیئے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۰۲)

یقیناً ایسے مقامات جو خواتین کے لیئے خاص ہوں (مثلاً تعلیمی ادارے) وہاں نماز

باجماعت کے لئے خواتین ایسا اہتمام کرسکتی ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اذان کہنے والا مرد ہو اور وہ اذان کہہ کر خود مردانہ مسجد میں جا کر نماز ادا کرے۔ خواتین کی مسجد میں نماز ادا کرنا اس کے لئے درست نہیں ہے۔ کیونکہ ابوداؤد کی اس روایت میں جسے محترم عثمانی صاحب نے نقل فرمایا ہے صرف یہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ورقہ کی خواہش پر اس کے گھر میں نماز باجماعت کی اجازت دی اور اس کے لئے مؤذن مقرر فرما دیا مگر مؤذن کے بارے میں وسیع ذخیرۂ حدیث میں کہیں یہ صراحت نہیں ہے کہ وہ خود گھر کی جماعت میں شریک ہوتا تھا اور مردانہ جماعت میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ اصل الفاظِ حدیث یہ ہیں۔

"عن ام ورقة بنت عبد الله بن الحارث" كان رسول الله صلے الله عليه وسلم يزورها في بيتها وجعل لها مؤذنا يؤذن لها وامرها ان تؤم اهل دارها" (ابوداؤد' كتاب الصلوٰة' باب امامة النساء) "عبداللہ بن حارث کی بیٹی ام ورقہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہاں گھر میں تشریف لایا کرتے تھے اور ان کے لئے آپ نے ایک موذن مقرر فرما دیا تھا جو اذان دیتا تھا آپ نے ام ورقہ کو حکم دیا کہ وہ اہلِ خانہ کو نماز پڑھایا کریں"

اس حدیث میں چند ایک باتیں واضح ہیں۔

اوّلاً ــــــ یہ کہ مؤذن صرف اذان دیتا تھا۔ ام ورقہ کی اقتداء میں اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا ثبوت کسی لفظِ روایت سے نہیں ملتا۔

مرد کو مؤذن اس لئے مقرر کیا کہ اگر عورت کو موذن بنایا جاتا تو لامحالہ اس کی آواز اجنبی مردوں تک پہنچتی جبکہ قرآن یہ تک گوارا نہیں کرتا کہ اس کے زیورات تک کی آواز اجنبی مردوں کو سنائی دے کجا یہ کہ وہ خود اپنی آواز کو حتی المقدور بلند کر کے مردوں کے کانوں تک پہنچائے قطع نظر اس کے کہ یہ آواز اذان کے الفاظ پر مشتمل ہو یا کسی غزل، گیت یا گانے کے الفاظ پر۔

ثانیاً ــــــ یہ کہ اہلِ خانہ سے مراد یہاں محض خواتین ہیں مرد حضرات اس سے مراد نہیں ہیں کیونکہ گھر میں اگر مرد ہوں بھی تو انہیں یہی حکم ہے کہ وہ مردوں کی جماعت میں شامل ہوں۔ پھر یہ بات عقلاً بھی محال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کو ایمان کے ساتھ پالینے والا خوش قسمت آدمی اس مسجد میں نماز ادا نہ کرے جو خیر المساجد میں شامل ہو اور اس امام کے پیچھے نماز نہ پڑھے جو سید الاولین والآخرین ہو اور امام الائمہ ہو بلکہ گھر میں ایک خاتون کے پیچھے نماز پڑھ لے جس کا تقویٰ و تدین، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تقویٰ و تدین سے وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو قطرے کو سمندر سے اور ذرّہ ریت کو صحرا سے ہے۔

امامتِ نسواں

خواتین کی جماعت میں عورتوں کی امامت ایک طے شدہ مسئلہ ہے عہد نبوی میں اس پر عمل رہا ہے کتب حدیث میں اس قسم کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔

"عن عطاء عن عائشة انها كانت تؤم النساء فتقوم معهن في الصف" (ابن ابی شیبہ۔ مستدرک حاکم) "عطا حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں اور انہی کے ساتھ صف میں کھڑی ہوتی تھیں۔"

"عن عمار الدهني عن امرءة من قومه يقال لها حجيرة عن ام سلمة انها امتهن فقامت وسطاً۔" (ماخوذ من عون المعبود ج ۱ ص۲۳۱) عمار دہنی اپنی قوم کی ایک عورت سے جسے حجیرہ کہا جاتا تھا روایت کرتے ہیں کہ ام سلمہ نے ان کی امامت کی اور وہ عورتوں کے درمیان میں کھڑی ہوئیں۔"

ان روایات سے یہ ثابت ہے کہ عہد نبوی میں عورتیں عورتوں کی امامت کیا کرتی تھیں لیکن اس طرح کہ عورتیں امام بن کر صف میں شامل ہو کر کھڑی ہوتی تھیں مردوں کی طرح وہ صف میں سے آگے نکل کر کھڑی نہیں ہوتی تھیں۔ اب نمعلوم ہمارے متجددین

عورت کو مردوں کی امام بنا کر کہاں کھڑا کرنا چاہتے ہیں؟ عین مردوں کی صف میں؟ یا مردوں سے آگے؟

## کیا عورت، مردوں کی بھی امام بن سکتی ہے؟

جناب عثمانی صاحب مردوں کے لئے عورت کی امامت کے جواز میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

"یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ صدر اول میں کوئی ایسا واقعہ نقل نہیں ہوا کہ کسی عورت نے مردوں کی امامت کی ہو۔ جبکہ ابوداؤد میں حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق وارد ہوا ہے کہ ـــــ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر جایا کرتے تھے اور آپ نے ان کے لئے ایک مؤذن مقرر فرمایا تھا جو ان کے لئے اذان دیا کرتا تھا اور ان کو آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کیا کریں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۰۱)

ہم اس سے قبل بیان کر چکے ہیں کہ اس حدیث کی بنیاد پر یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ مؤذن اذان دے کر خیر الرسل والانبیاء کے پیچھے خیر المساجد میں نماز پڑھنے کی بجائے وہیں ٹک کر ام ورقہ کے پیچھے نماز پڑھتا ہو ـــــ یہ نص حدیث میں ایک خود ساختہ اضافہ ہے جو بنائے دلیل قرار نہیں پا سکتا۔ بلکہ اس حدیث سے تین باتیں بالبداہت ثابت ہوتی ہیں۔

اولاً ـــــ یہ کہ عورتوں کی نماز باجماعت کے لئے اگر اذان کہی بھی جائے تو مؤذن مرد کو ہونا چاہیئے، عورتوں کو اپنی آواز (خواہ وہ الفاظ اذان ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو) مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچانی چاہیئے ورنہ حضورؐ ام ورقہؓ ہی کو اذان کہنے کا حکم بھی دیدیتے۔

ثانیاً ـــــ یہ کہ اسلام اور قرآن مخلوط محافل کا قطعاً قائل نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورت کی امامت کو اس کے گھر تک محدود نہ رکھتے بلکہ مردانہ مسجد میں بھی انہیں امامت کا موقع فراہم کرتے۔

ثالثاً ـــــــ یہ کہ عورت کا دائرہ عمل اس کی گھر کی چار دیواری تک محدود ہے

"دلائلِ" فقہاء

محترم عثمانی صاحب عورت کی امامتِ رجال پر شذوذ کی راہ اختیار فرماتے ہیں مگر اپنے "شذوذ" پر پردہ ڈالتے ہوئے وہ یہ تأثر بھی دیتے ہیں کہ اس مسئلے میں وہ تنہا ہی "دلائل" پیش کرنے والے نہیں ہیں بلکہ متقدمین بھی "دلائل" فراہم کیا کرتے تھے۔

"فقہائے کرام کی ایک خاصی بڑی جماعت نے نابالغ بچہ کی اور فاسق وفاجر آدمی کی امامت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ایک متقی پرہیزگار عورت نابالغ بچہ اور فاسق و فاجر آدمی سے تو بہر حال مقدم ہے اگر ان دونوں کی امامت صحیح ہو سکتی ہے تو محض ایک عورت کی امامت پر اعتراض کرنا ناقابلِ فہم ہے۔ البتہ چونکہ عموماً خاندان کا سربراہ مرد ہی ہوتا ہے۔ عورت نہیں ہوتی لیکن اگر اس قابل کوئی مرد موجود ہی نہ ہو شوہر مر گیا ہو یا وہ دیوانہ یا سفیہ ہو تو گھر کی سربراہ کے ساتھ ساتھ خاندان کی سربراہ بھی عورت بن سکتی ہے اسی طرح عام حالات میں امامت مرد ہی کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی مرد اس قابل نہ ہو تو محض مرد ہونے کی وجہ سے ایک قابل اور اہل عورت پر اس کو ترجیح نہ دی جانی چاہیئے۔ یہ ہے امام ابو ثور اور طبری کے دلائل کا خلاصہ۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۰۲)

کاش محترم عثمانی صاحب امام ابو ثور اور طبری کے ان دلائل کا مأخذ بھی بتلا دیتے تاکہ ہم خود بھی ان دلائل کو ملاحظہ کر لیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ امام ابو ثور اور طبری کے دلائل ہیں ہی نہیں بلکہ یہ ان کے "ذاتی اجتہادات" و "قیاسات ہیں" جنہیں دلائل کا نام دے کر امام ابو ثور اور طبری کے گلے مڑھ رہے ہیں اگر یہ ان دونوں ہی کے دلائل ہوتے جنہیں موصوف محترم، قطعی جزم و یقین اور حتمی وثوق و اعتماد کے ساتھ ان کی طرف منسوب فرما رہے ہیں تو وہ ایک صفحہ قبل یہ نہ لکھتے کہ

"امام ابو ثور اور طبری کی دلیل (دلائل نہیں بلکہ دلیل ـــ قاسمی) غالباً

("غالباً" کے لفظ پہ غور فرمائیے — قاسمی) یہ ہے کہ قرآن وسنت سے اس کی صراحتاً ممانعت ثابت نہیں ہے" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۱۰)

رہی محترم عثمانی صاحب کی یہ دلیل کہ "اگر فاسق وفاجر آدمی اور نابالغ بچے کی امامت جائز ہے تو عورت کی امامت کیونکر ناروا ہو سکتی ہے" تو یہ ایک لغو استدلال ہے فاسق وفاجر امام ہو یا متقی وپرہیزگار، فاحشہ وچھنال عورت ہو یا عفیفہ وپاکدامن خاتون۔ دونوں اصناف بشر کا دائرۂ عمل الگ الگ ہے اسلام دونوں اصناف میں اختلاط کا روادار نہیں ہے۔ پس صدر اول میں عورت کو مردوں کی امامت سے الگ رکھنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ عورتیں تقویٰ کی میزان میں فاسق وفاجر آدمیوں اور نابالغ بچوں سے کمتر اور ہلکی پائی گئی تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے ذکور واناث کا وہ اختلاط لازم آتا ہے جو اسلام کو عام زندگی میں تو درکنار معابد اور مساجد تک میں گوارا نہیں ہے۔

# تیسری فصل ۔ اجتماعِ رجال اور خطابِ نسواں

ستر وجوہِ نسواں کو "غیر شرعی پردہ" قرار دینے کے بعد اور مخلوط مجالس میں اس کی شرکت پر "قرآنی جواز" فراہم کر دینے کے بعد محترم عثمانی صاحب کو مغربی تہذیب کی روایات کے مقابلے میں اسلامی تہذیب میں یہ کسر نظر آئی کہ اس میں عورت کو مردوں کے سامنے جا کر خطاب کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے جبکہ "عصری تقاضے" انہیں مجبور کر رہے ہیں کہ عورت کے لئے یہ "فریضہ" بھی قرآن سے نچوڑ لیا جائے۔ چنانچہ اسلام کو "دقیانوسیت" اور "قدامت پرستی" کے الزام سے بچانے کے لئے جو مبینہ اجتہاد فرمایا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔

موصوف محترم ارشاد فرماتے ہیں۔

"پارلیمنٹ اور اسمبلی میں نیز مردانہ جلسوں میں عورت خطاب بھی کر سکتی

ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے اور بڑی چادر (جلباب) سے اپنے پورے جسم کو سوائے چہرے اور ہاتھوں کے پوری طرح ڈھکے ہو۔ سورہ نمل میں حضرت بلقیس (ملکۂ سبا) کے واقعہ کو قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط انہیں ملا تو انہوں نے اہلِ دربار کے سامنے تقریر فرمائی تھی جس کے چند الفاظ قرآن کریم نے بیان کر دیئے ہیں (اس کے بعد خطاب بلقیس کے قرآنی الفاظ مع ترجمہ پیش کئے گئے ہیں)۔" (فقہ القرآن ج ۳ صـ۲۱۴)

بعدازیں موصوف مکرم اس واقعہ سے یوں استدلال فرماتے ہیں:۔

"قرآن نے بلقیس کے اس خطاب کو جو انہوں نے اپنے اہل دربار کے سامنے کیا تھا بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے بھی ان کی کسی بات کی تغلیط نہیں فرمائی۔ اس اصول کے ماتحت کہ پچھلی امتوں کے حالات کو اگر قرآن کریم بغیر کسی نکیر کے نقل کرے تو وہ ہمارے لئے بھی حجت ہوتے ہیں حضرت بلقیس کی مجلسِ دربار یقیناً اس وقت کی پارلیمنٹ یا اسمبلی کے قائم مقام تھی۔ لہٰذا اس کو مردوں کے مجمع کو خطاب کرنے کے جواز کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ صـ۲۱۵)

محترم عثمانی صاحب کی عمارتِ استدلال دو ستونوں پر قائم ہے۔

اوّلاً ـــــ یہ کہ قرآن نے بلقیس کے اس خطاب پر کوئی نکیر نہیں ہے۔

ثانیاً ـــــ یہ کہ پچھلی امتوں کے حالات اگر قرآن بغیر نکیر کے پیش کرے تو وہ ہمارے لئے بھی حجت ہیں۔

## خطابِ بلقیس پر قرآن کی عدم نکیر

محترم عثمانی صاحب کے استدلال کا پہلا جزو ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ قرآن ہی پر کیا موقوف ہے ہر کتاب کا مصنف اور ہر زبان کا متکلم، جب کسی شخص کو چھوٹی بڑی بہت سی برائیوں سے آلودہ دیکھتا ہے تو بسا اوقات وہ ان

سب برائیوں کا ذکر کرنے کی بجائے صرف اس ایک بڑی برائی کے ذکر پر اکتفا کرتا ہے جو اخلاقی یا اعتقادی لحاظ سے اپنی قباحت اور شناعت میں سب سے بڑھ کر ہوتی ہے ایسی صورت میں کسی شخص کا کسی بدکردار آدمی کے صغائر کو نظر انداز کر کے اس کے کبائر میں سے صرف ایک اشنع اور اقبح کبیرہ پر نکیر کرنا یہ معنیٰ نہیں رکھتا ہے کہ جن صغائر اور کبائر پر اس نے نکیر نہیں کی ان سے وہ راضی ہے۔ لہٰذا ان گناہوں کو اختیار کرنا اس کے نزدیک ایک پسندیدہ عمل ہے قرآن نے ابولہب کی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے اس کا صرف ایک عیب بیان کیا ہے جو اخلاقی اعتبار سے شناعت، کراہت اور قباحت میں بہت بڑھا ہوا ہے اور افراد معاشرہ کو عیاناً نظر آرہا ہے۔ اب کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس میں لگائی بجھائی کرنے (حَمَّالَةَ الْحَطَبِ) کے علاوہ اور کوئی عیب ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں اور بھی عیوب تھے مگر قرآن نے صرف ایک ہی عیب کو بیان کیا ہے جسے موقع و محل کی مناسبت سے قرآن نے سب سے گھناؤنا تصور کیا۔ بالکل اسی طرح قرآن نے بلقیس کے بہت سے عیوب میں سے صرف ایک عیب (یعنی اس کے کفر و شرک) کو نکیر کے ساتھ بیان کیا ہے اور باقی عیوب کو نظر انداز کیا ہے جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس کے وہ اعمال حجت اور سند کا درجہ رکھتے ہیں جن پر قرآن نے نکیر نہیں کی چنانچہ سورۂ نمل (جس میں یہ واقعہ مذکور ہے) کا مرکزی مضمون رد کفر و شرک ہے اس لئے قرآن نے بلقیس کے صرف کفر و شرک ہی پر نکیر کی ہے اور باقی جملہ امور سے صرفِ نظر کیا ہے۔

## حالاتِ اُمم سابقہ سے احتجاج

محترم عثمانی صاحب کی دلیل کا دوسرا جزو خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"پچھلی امتوں کے حالات کو اگر قرآن کریم بغیر کسی نکیر کے نقل کر دے تو وہ ہمارے لئے بھی حجت ہوتے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ صفحہ ۲۱۵)

اس سے دو صفحے قبل موصوف محترم یہ بھی فرما چکے ہیں کہ

"گذشتہ امتوں کے واقعات اگر قرآن بغیر کسی نکیر کے نقل کر دے تو وہ

ہمارے لئے حجت ہوتے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۲۱۳)

ہمیں اپنے قصور علم کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی لہٰذا ہم یہ کہنے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے کہ محترم عثمانی صاحب کا یہ اصول نہ ہمیں کہیں قرآن میں نظر آیا ہے نہ حدیث میں اور نہ علمائے امت فقہائے ملت مفسرین کرام اور مجتہدین عظام کی کسی کتاب میں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس اصول کی وحی کس آسمانِ علم سے اُن پر اتری ہے۔ ہمیں جو اصول علماء سلف وخلف کی کتب میں نظر آیا ہے اس کا تعلق "گذشتہ امتوں کے حالات" سے نہیں بلکہ "گذشتہ انبیاء کی آسمانی شرائع" سے ہے جس کے بعض علماء قائل ہیں چنانچہ علامہ جصاص فرماتے ہیں۔

فی هذا دلالة علی ان شرائع الانبیاء المتقدمین مالم ینسخ منها قبل مبعث النبی فهو ثابت الحکم مامورا به وانه قد صار شریعة لنبینا علیه السلام۔ (احکام القرآن ج ۳ ص۵۰)

"اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ بعثت نبوی سے قبل انبیائے سابقین کی شریعتوں میں سے اگر کچھ منسوخ نہیں ہوا تو وہ ہمارے لئے بھی شریعت ہے اس کا حکم ہمارے لئے ثابت ہے اور ہم اسی پر عمل کے لئے مامور ہیں وہ شریعت ہمارے نبی کی شریعت بن گئی ہے۔"

خود محترم عثمانی صاحب ایک مقام پر اس اصول کو ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:۔

"انبیائے سابقین کی شریعت جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا ہو یا حق تعالیٰ نے بغیر کسی نکیر کے قرآن میں نقل فرما دیا ہو ہمارے لئے بھی شریعت ہوتی ہے اور ہمارے لئے اس کا اتباع اور پیروی ضروری ہوتی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۲۶۳)

چھوڑیئے اس بات کو کہ اس اصول کی قرآنی دلیل کیا ہے؟ اور اس سے بھی صرف نظر کیجئے کہ فقہاء کے اس اصول کی قرآنی میزان میں کیا قدر وقیمت متعین ہوتی ہے؟

فی الحال تو ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس اصول کا تعلق "گذشتہ امتوں کے حالات" کے ساتھ نہیں بلکہ "گذشتہ انبیاء کی شرائع" کے ساتھ ہے۔ لیکن محترم عثمانی صاحب "انبیائے سابقین کی شرائعِ حقہ" کی بجائے "گذشتہ امتوں کے حالات وواقعات" پر اپنے استدلال کی عمارت اٹھاتے ہیں اور پھر یہ بھی نہیں دیکھتے کہ وہ "گذشتہ امتوں" میں سے جس قوم کے عمل کو حجت قرار دے رہے ہیں وہ کسی آسمانی شریعت کی پیروکار ہے یا شرک و بت پرستی کی شکار ہے۔ قوم سبا کی سورج پرستی اور کفر و شرک پر قرآن گواہ ہے مگر محترم عثمانی صاحب "گذشتہ انبیاء کی شریعتوں" کی آڑ میں "گذشتہ کافر و مشرک قوموں" کے اعمال کو حجت اور سند کے طور پر پیش فرما رہے ہیں۔

یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ آدمی تہذیبِ مغرب کی تقلید میں کس طرح قرآن اور اسلام کا حلیہ بگاڑتا چلا جا رہا ہے۔ کہاں انبیائے متقدمین کی شریعتوں کا اتباع اور کہاں جاہل کافر اور مشرک قوموں کے اعمال کو حجت و سند قرار دینا۔ ع

بہ بیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

ہم اس بات کو اللہ تعالیٰ کے علم پر چھوڑتے ہیں کہ محترم عثمانی صاحب سے اس غلطی کا صدور لاشعوری طور پر ہوا ہے یا دیدہ و دانستہ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کا یہ وہ بدترین استدلال ہے جس کی بابت اقبال نے کہا ہے ؎

زِ مَن بر صوفی و مُلّا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

کیا ستم ظریفی ہے کہ جو قرآن

۱۔ عورتوں کو اٹھلا کر اور مٹک کر چلنے کی اس لئے اجازت نہیں دیتا کہ ان کے پاؤں کے زیورات کی آواز مردوں کے کانوں تک نہ پہنچ پائے۔

۲۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کے الفاظ میں انہیں پرسکون اور باوقار طور پر لزوم بیت کی تلقین کرتا ہے۔

۳۔ مردوں کے کسی چیز کے سوال کرنے پر عورتوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ مطلوبہ

چیز کو مردوں کے سامنے آکر دینے کی بجائے پردے کی اوٹ میں سے (مِنْ وَّرَاءِ حِجَاب) دیں۔

اسی قرآن سے یہ حکم نچوڑا جاتا ہے کہ عورتیں کھلے منہ مردوں سے خطاب کریں یہ واقعی "قابل داد" جسارت ہے۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

موصوف محترم ایک کافر و مشرک اور سورج پرست عورت کے "اسوۂ حسنہ" کو دلیل بنانے کی بجائے اگر خالص عقلی بنیادوں پر یہ جواز حجت پیش کرتے کہ آج ہوا کا رخ بدل چکا ہے، موجودہ دور کے "عصری تقاضے" یہی ہیں کہ عورتیں عریاں چہروں کے ساتھ مردوں کو خطاب کرتی پھریں تو کم ازکم شرعاً نہ سہی عقلاً اس دلیل میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہوتا۔ لیکن قرآن میں مذکور کافر و مشرک خاتون کے "اسوۂ حسنہ" سے استدلال کرکے انہوں نے اپنی اجتہادی صلاحیت اور فقیہانہ بصیرت کا بھانڈا عین چوراہے میں پھوڑ دیا ہے۔ ہمارے ہاں کے غلام فطرت متجددین کی یہ عام روش ہے کہ جدید تہذیب کی تقلید میں جو افکار و اعمال انہیں مرغوب و محبوب ہیں وہ چاہتے ہیں کہ الفاظِ قرآن کو چھیل چھال کر انہیں قرآن سے "ثابت" کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ اس قاعدے کلیے کے تحت کیا جاتا ہے کہ ـــــ کتاب اللہ چونکہ ہماری تمام ضرورتوں کی ضامن اور کفیل ہے اس لئے "عصر حاضر" کی ضرورتوں کو بھی اسے پورا کرنا چاہیئے ـــــ لیکن اس ظاہری قاعدے کلیے کے پیچھے جو حقیقی فارمولا چھپا ہوا ہے اور جسے فی الواقعہ یہ "دانشور" عملاً اختیار کئے ہوئے ہیں وہ یہ ہے کہ ـــــ "جب ہم نے خدا کی اس کتاب کو نسل در نسل اپنے ایمان سے مشرف کر رکھا ہے تو ہمارے اس ایمان کے بدلے میں جو کم سے کم فرض اس پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اب یہ ہمارے آگے چلنے کی بجائے ہمارے پیچھے پیچھے چلے۔ اب ہمارا اور اس کا تعلق یہ نہ ہو کہ ہم اس کو نافذ کرنے کی کوشش کریں اور یہ اس راستے کی تمام ضرورتیں پوری کرتا جائے بلکہ نوعیتِ تعلق اب یہ ہو کہ ہم تہذیب غالب کے افکار و اعمال کی ترویج کریں اور یہ ہمارے حضور سند جواز کا نذرانہ پیش کرتا رہے۔"

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

یہی وہ فارمولا ہے جس کی روشنی میں مسئلہ زیرِ عنوان پر موصوف محترم ایک کافر و شمس پرست خاتون کے "اسوۂ حسنہ" سے استشہاد فرما رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ملکۂ سبا، ایک مومن و مسلم خاتون بھی ہوتی تب بھی ہمارے لئے اس کا طرزِ عمل واجب الاتباع نہ ہوتا۔ ہمارے لئے واجب الاطاعت صرف وہ شریعت ہے جو نبیٔ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے اور جس میں خواتینِ امتِ مسلمہ کو ازواجِ مطہرات کے توسط سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی ان سے کسی چیز کا طالب ہو تو وہ پس پردہ (مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ) رہ کر شئے مطلوب فراہم کردیں۔ ازواج مطہرات کے طرزِ عمل کو پیٹھ دکھا کر امم سابقہ میں سے ایک کافر و مشرک خاتون کے "اسوہ حسنہ" سے تمسک کرنا قلبی روگ کا آئینہ دار ہے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔

# چوتھی فصل۔ گھر سے باہر نکلتے وقت عورت کے لئے اجازت کی ضرورت

اس فصل میں، ہماری بحث دو عنوانات کے تحت ہے۔

۱۔ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت۔ ۲۔ سفر میں محرم کی رفاقت و معیت۔

## گھر سے باہر نکلنے کی اجازت

یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ عائلی زندگی میں شوہر کی حیثیت، سربراہِ خانہ کی ہے۔ عورت کا بلا اجازت خروج عائلی معاشرت میں برہمی اور انتشار کا موجب ہوتا ہے۔ گھر کے نظم و نسق کا تقاضا یہ ہے کہ سربراہِ خانہ (جسے قرآن "قوام" کہتا ہے) کی اطاعت کی جائے۔ قرآن کی یہ آیت اس موضوع پر دلیلِ قطعی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ٥ (۴/۳۴)

مرد عورتوں کے نگراں و سربراہ ہیں بسبب اس کے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس لئے بھی کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں پس نیک خواتین اطاعت شعار ہوتی ہیں اور اللہ کی نگرانی کے تحت حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔ جن سے تمہیں نشوز (سرکشی و حکم عدولی) کا خدشہ ہو۔ انہیں سمجھاؤ بجھاؤ ان کی خوابگاہوں میں انہیں تنہا چھوڑ دو اور انہیں مارو پھر اگر وہ تمہاری اطاعت پر اتر آئیں تو ان پر دست درازی کی کی راہ نہ ڈھونڈو اللہ بالا و بزرگ ہے۔

اس آیت پر تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے جس میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اس کے الفاظ میں اطاعتِ شوہر کی چار دلیلیں پائی جاتی ہیں آخری دلیل قرآن کے واضح الفاظ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ (اگر وہ تمہاری اطاعت اختیار کر لیں) کے الفاظ پر مشتمل ہے خاوند کی اطاعت کا لزوم اس بات کو بھی مستلزم ہے کہ بیوی اس کی اجازت ہی سے باہر نکلے نہ کہ اس کی اجازت کے بغیر سرکشی و نشوز اختیار کرتے ہوئے —— اس قرآنی دلیل کے علاوہ بہت سی احادیث میں بھی صراحت سے عورت کو شوہر کی اطاعت کا پابند کیا کیا گیا ہے۔ اور گھر سے باہر نکلنے کے لئے شوہر سے استیذان کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہم ان تمام احادیث کی بجائے صرف وہ احادیث پیش کرنے کا حق رکھتے ہیں جن سے محترم عثمانی صاحب نے خود استدلال و استشہاد فرمایا ہے ظاہر ہے کہ یہ احادیث ان کی میزانِ درایت میں پوری اتری ہیں۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے نقل فرمایا ہے کہ

اِذَا اسْتَاْذَنَتْ اَحَدَكُمْ امْرَاَتُهٗ اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يَمْنَعْهَا۔

اور

لا تمنعوا اماء الله مساجد الله۔

ترجمہ [ جب تم میں سے کسی سے اس کی بیوی مسجد جانے کی اجازت طلب کرے تو وہ اسے منع نہ کرے ]

اور

[ اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے منع نہ کرو ]

( فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۵۶ )

ان دونوں روایات میں یہ بات واضح ہے کہ مسجد میں جانے کے لئے شوہر سے اجازت طلب کرنا عورت پر لازم ہے وہ شوہر کی اجازت کے بغیر کہیں اور جانا تو درکنا مسجد تک میں نہیں جا سکتی بعض اوقات ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ شوہر گھر پر موجود نہ ہو اس بناء پر اس سے طلب اجازت ممکن نہ ہو لیکن ایک شدید حاجت خاتونِ خانہ کو گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تو یہ ایک ہنگامی اور استثنائی کیفیت ہے جس میں اسے ضرورتاً باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ خود محترم عثمانی صاحب نے بخاری کی یہ روایت پیش کی ہے۔

"انہ اذن لکن ان تخرجن لحاجتکن" "بیشک حق تعالیٰ نے تمہیں اپنی ضروریات کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت دی ہے" ( فقہ القرآن ج ۳ ص ۴۲۴ )

دوسری بات جو استیذان کی مندرجہ بالا احادیث سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ خواتین کو منع کرنے کا امر ایک قطعی امر ہے جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے ہاتھ میں رکھا ہے۔ شارع نے محل جواز کے لئے، اس حکم کو صرف مسجد کے ساتھ معلق رکھا ہے رہے باقی امور تو اس میں شوہر کا ( منع کرنے یا اجازت دینے کا ) پورا اختیار برقرار رہتا ہے۔ صرف اسی ایک مسجد ہی کے معاملے میں مردوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ عورتوں کو وہاں جانے سے منع نہ کریں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

"ان منع الرجال نساء ھم امر مقرر وانما علق الحکم بالمساجد

لمحل الجواز فیبقی ما عداہ علی المنع ۔" (فتح الباری ج ۲ ص ۳۴۸) "بلاشک مردوں کا عورتوں کو (کہیں جانے سے) منع کرنا ایک طے شدہ امر ہے آپؐ نے محل جواز کی خاطر اس حکم کو مسجد کے ساتھ معلق کر دیا ہے اس کے علاوہ باقی امور میں مردوں کا عورتوں کو (کہیں جانے سے) منع کر دینے کا اختیار باقی رہتا ہے۔"

"شوہر کی اطاعت" اور "خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا" دونوں متضاد عمل ہیں۔ اطاعت شوہر کا یہ تقاضا ہے کہ بیوی اس کی اجازت سے کہیں نہ جائے، بیوی کا بلا اجازت شوہر کے گھر سے نکلنا اس کی اطاعت کے منافی ہے اِلّا یہ کہ شوہر سے طلب اجازت بوجوہ ممکن نہ ہو یہ بہرحال استثنائی معاملہ ہے جس میں مجبوری حالات کو دخل ہوتا ہے۔

## سفر میں محرم کی معیّت

محترم عثمانی صاحب نے اس مسئلہ پر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ تمام تر کتب احادیث یا آراء فقہاء پر مبنی ہے۔ قرآنی دلائل پیش نہیں کئے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس مسئلہ میں "محرم کی قید" کا قرآن میں نفیاً یا اثباتاً ذکر ہی مفقود ہے اس لئے بنائے استدلال یقیناً سنت نبوی ہی ہو سکتی ہے۔

حدیث کی تقریباً سبھی کتب میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشادِ گرامی موجود ہے جس کا مفہوم کم و بیش یہ ہے کہ ___ "کسی عورت کے لئے جو اللہ اور آخرت پر یقین رکھتی ہو جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر محرم کے سفر کرے" ___ اسی بناء پر بعض فقہاء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر عورت کے پاس زاد راہ اور سواری (یعنی آمدورفت کا خرچ) ہو مگر محرم رشتہ دار کی معیت اسے نصیب نہ ہو تو اس پر حج فرض نہیں ہے کیونکہ فرضیتِ حج استطاعت پر موقوف ہے جو مرد کے معاملے میں تو زاد راہ اور سواری کے وجود سے متحقق ہو جاتی ہے مگر عورت کی استطاعت میں "محرم کی معیت" کی اضافی شرط بھی ضروری ہے اس لئے جب وہ محرم کی معیت نہ پا سکی تو غیر مستطیع قرار پائی۔ لہٰذا اس پر حج فرض نہیں ہوا۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا یہی مسلک ہے اس کے برعکس امام

مالک اور امام شافعی عورت کے تنہا نکلنے کو ناجائز کہتے ہیں مگر عورت پر حج کے فرض ہونے کے قائل ہیں یہ "محرم کی معیت" کو شرطِ واجب قرار نہیں دیتے جبکہ احناف اور حنابلہ کے نزدیک یہ شرط عورت کی "استطاعت" میں داخل ہے۔ محترم عثمانی صاحب اس سلسلے میں فرماتے ہیں۔

"عورت کے لئے سفر میں محرم کی ہمراہی کی پابندی ضروری نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ اطمینان ہونا چاہیئے کہ سفر میں عورت کو کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے تو وہ سفر کرسکتی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۲۲۰)

بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ

"لوگوں کو خود ہی حالات کے ماتحت اس کا فیصلہ کرنا چاہیئے اور عورتوں کے ضعف اور کمزوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے نیز ملک میں امن وامان کی صورت حالات کو سامنے دیکھتے ہوئے فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ کتنا سفر تنہا کرسکتی ہے اور کتنا سفر بغیر معتبر اور مامون رفقار کے اسے نہیں کرنا چاہیئے۔"

(فقہ القرآن ج ۲ ص ۲۲۰)

موصوف محترم کے نزدیک عورت کے تنہا سفر کرنے پر کوئی "شرعی پابندی" نہیں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں جو کچھ فرمایا تھا وہ گویا اس وقت کی صورتِ احوال کا نتیجہ تھا۔

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں راستے مامون نہیں تھے کفار ومشرکین سے برابر جنگیں ہو رہی تھیں اس لئے مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا کہ عورتیں بغیر محرم کے سفر نہ کریں اس لئے آپؐ نے اس سے منع فرمادیا تھا۔"

(فقہ القرآن ج ۲ ص ۲۱۹)

لیکن اگر یہی بات ہوتی جو مولانا عثمانی صاحب بیان فرما رہے ہیں تو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم "محرم کی معیت" کی شرط کی بجائے محض "قابل اعتماد رفقاءِ سفر" کی معیت کی شرط عائد فرماتے۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا "قابل اعتماد

رفقاء سفر" کی شرط نہ لگانا اور صرف "محرم رشتہ دار" کی معیت کی شرط لگانا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ حالتِ امن و امان کی ابتری کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ عورت کے لئے یہ ایک دائمی اور مستقل حکم ہے۔ پھر حدیث کے یہ الفاظ کہ ـــــ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والی عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر محرم کے سفر کرے اس امر کی دلیل ہیں کہ محرم کی معیت میں سفر کرنا عورت کے ایمان کا تقاضا ہے نہ کہ ملک کی بگڑی ہوئی صورتِ حال کا۔

برسبیل تنزل! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم محض راستوں کے غیر محفوظ ہونے ملکی صورت حال کے ابتر ہونے اور بدامنی و لوٹ مار کے حالات سے متعلق ہو تب بھی یہ لازم نہیں آتا کہ جس بات کو "تقاضائے ایمان" قرار دیا گیا ہو اسے مخصوص موارد کے لئے خاص کر دیا جائے جبکہ محترم عثمانی صاحب یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ـــــ العبرة لعموم الالفاظ لا لخصوص الموارد ـــــ (اعتبار کے قابل الفاظ کی عمومیت ہوتی ہے نہ کہ وہ خاص مواقع جن میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہوں)۔ (فقہ القرآن ج ۱ ص۵۱۱)

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر حالات نہایت پر امن ہو جائیں راستے مامون و محفوظ ہو جائیں بدامنی، رہزنی، ڈکیتی اور دیگر جرائم ختم ہو جائیں لوٹ مار کا نام و نشان تک نہ رہے تو کیا ان پُرامن حالات میں یہ مناسب ہو گا کہ لوگ گھروں سے نکلتے وقت تالے نہ لگائیں؟ دن بھر کے کاروبار کے بعد جب وہ رات کو گھروں کو لوٹیں تو دوکانیں اور کاروباری مراکز کھلے چھوڑ آئیں؟ عدالتوں اور تھانوں کا وجود ختم کر دیا جائے کیونکہ جرائم کا انسداد ہو چکا ہے؟ بینکوں کی رقم کے لئے حفاظتی کمرے (STRONG ROOMS) تعمیر نہ کئے جائیں کیونکہ لوگ ایماندار ہو چکے ہیں؟ ظاہر ہے کہ حالات کے پُرامن ہونے کے باوجود گھروں کو دوکانوں کو اور دیگر کاروباری مراکز کو کھلا اور غیر مقفل نہیں چھوڑا جا سکتا تو آخر ایک عورت ہی کے معاملے میں یہ ضد کیوں؟ کہ وہ بغیر محرم کے سفر کرے جبکہ شارع نے محرم کی معیت میں سفر کرنے کو ایمان کا تقاضا قرار دیا ہے؟ کہیں دل میں چور تو نہیں جو تہذیبِ فرنگ کے اتباع پر اکسا رہا ہے؟

# پانچویں فصل۔ عورت اور میدان حرب و قتال

محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"ہمارے فقہاء نے عورتوں کو جہاد سے بھی مستثنیٰ کر رکھا ہے ان کا ارشاد ہے کہ جنگ میں عورتوں کو شریک نہیں ہونا چاہیئے لیکن قرآن شریف میں جہاد کے متعلق جس قدر آیات ہیں سب میں خطاب تمام مسلمانوں کو فرمایا گیا ہے مسلمان مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی ہوتی ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جنگوں میں عورتیں برابر شریک ہوتی رہی ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۲۰۵)

محترم عثمانی صاحب آیات وہ پیش کرتے ہیں جن میں "جہاد" کا ذکر ہے اور نتیجہ نکالتے ہیں "جنگ اور قتال" میں شرکتِ خواتین کا۔ حالانکہ "جہاد" ایک وسیع المفہوم لفظ ہے جو عمومیت کے ساتھ ہر اس جدوجہد پر بولا جاتا ہے جو غلبۂ دین اور شکستِ کفر کے لئے کی جائے جبکہ "جنگ اور قتال" خصوصیت کے ساتھ اس سعی و کاوش کو کہا جاتا ہے جو مسلح ہو کر کی جائے۔ "جہاد" تو واقعی' ہر مرد و زن پر فرض ہے خواہ وہ جہاں کہیں اور جس حیثیت و پوزیشن میں ہو لیکن "قتال" (جو جہاد کی واحد اور انتہائی شکل ہے) صرف اس مرد پر فرض ہے جو میدانِ جنگ میں لڑنے کی صلاحیت و استعداد سے بہرہ ور ہے ایک آدمی میدان جنگ گرم ہونے سے قبل فوج کی تیاری میں مدد دے رہا ہے تو وہ بھی مصروف جہاد ہے۔ دوسرا آدمی اسلحہ کی فراہمی کا بندوبست کر رہا ہے تو وہ بھی مشغولِ جہاد ہے۔ تیسرا آدمی لشکر کے لئے سامان خورد و نوش مہیا کر رہا ہے تو وہ بھی برسر جہاد ہے عورتیں اگر گھر میں امن و سکون کی فضاء کو برقرار رکھ کر اطفالِ مجاہدین اور ذریتِ مقاتلین کی پرورش و تربیت کر رہی ہیں تو وہ بھی شریکِ جہاد ہیں۔ لیکن "حرب و قتال" میں صرف وہی مصروف ہوں گے جو مسلح جدوجہد کر رہے ہیں بس جب قرآن

جاھدوا ۔۔۔ (جہاد کرو ۔۔۔) کا حکم دیتا ہے تو ضروری نہیں کہ اس سے مراد مسلح جدوجہد ہی ہو۔ دین کو بالاتری عطا کرنے والی ہر جدوجہد اس سے مراد ہو سکتی ہے۔ خواہ یہ دوڑ دھوپ ایک مسلح مجاہد کی طرف سے شمشیر بکف ہو کر کی جائے یا اسلامی تہذیب کے گھریلو قلعوں میں، تربیتِ اطفال کی صورت میں خواتین کی طرف سے عمل میں آئے "جہاد" اور "قتال" کا یہ ایسا باہمی فرق ہے جو قاریٔ قرآن کی نگاہ سے مخفی نہیں۔ اسی فرق کے پیشِ نظر قرآن "جہاد" کا حکم تو مکی آیات میں بھی دیتا ہے۔ لیکن قتال کا حکم اس نے صرف مدنی آیات ہی میں دیا جو بعد از ہجرت نازل ہوئی تھیں۔

## ضُعفِ نسواں اور قوتِ مرداں

"جہاد" کے لئے ضروری نہیں ہے کہ جہاد کرنے والا فرد مخصوص جسمانی قویٰ۔ حربی فنون اور عسکری صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو وہ جہاد کے لئے اپنی ہر استعداد سے کام لے سکتا ہے مثلاً مقرر اور خطیب ہے تو اپنی تقریر و خطابت سے جہاد کر سکتا ہے مصنف اور مؤلف ہے تو تصنیفی اور تالیفی میدان میں مصروفِ جہاد ہو سکتا ہے۔ شاعر ہے تو اپنی شاعرانہ صلاحیت کو وقفِ جہاد کر سکتا ہے صاحبِ مال ہے تو اپنے مال سے شریکِ جہاد ہو سکتا ہے۔ خاتونِ خانہ ہے تو مجاہد اور مقاتل شوہر کے گھر کو پرسکون رکھ کر اور اس کے لئے طمانیتِ قلبی اور سکونِ خاطری پیدا کر کے وہ جہاد کر سکتی ہے۔ لیکن ایک مقاتل اور جنگجو شخص کے لئے مخصوص جسمانی قویٰ، حربی فنون اور عسکری صلاحیتیں ضروری ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ عورتیں مردوں کی نسبت فطرتاً کمزور واقع ہوئی ہیں انہیں وہ صلاحیتیں میسر ہیں جو عائلی زندگی میں ولادتِ اطفال، پرورشِ صبیان اور تربیتِ ذریت اور امورِ خانہ داری میں کام آتی ہیں مثلاً نرمی و نزاکت، ایثار و قربانی، صبر و تحمل، رحمدلی و شفقت وغیرہ۔ لیکن مردوں کو وہ صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جو بیرونِ خانہ امور (مثلاً جنگ و جدل اور اکتسابِ رزق) کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً زور، قوت، صلابت، طاقت، اِقدامیت وغیرہ۔ خود مُصنّف "فقہ القرآن" کے مطابق:۔

"مردوں کو قوت و صلابت کی ضرورت ہے کیونکہ انہیں جانگسل، جگر پاش محنت اور مشقت سے سابقہ پڑتا ہے اور عورتوں کو نرمی، نزاکت، لچک، رحم دلی اور شفقت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش و نگہداشت اور ان کی تیمارداری کرنی پڑتی ہے اس لئے دونوں کے دائرۂ کار کے مطابق صلاحیتوں میں بھی قدرت نے فرق رکھا ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۵۲)

سوال یہ ہے کہ وہ کیا "جگر پاش محنت و مشقت" طلب امور ہیں جن کی انجام دہی کے لئے مردوں کو "قوت و صلابت" عطا کی گئی ہے۔ اس کی وضاحت جناب عثمانی صاحب نے خود ہی فرمادی ہے۔

"مردوں کو اکتساب رزق کے لئے جدوجہد کرنا گھر اور خاندان کی حفاظت کرنا۔ ضرورت پڑے تو ملک اور قوم کی حفاظت کرنا اور مسلح جدوجہد میں حصہ لینا ہوتا ہے چونکہ مردوں اور عورتوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے اس لئے دونوں کی صلاحیتوں میں بھی فرق ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۵۲)

ایک اور مقام پر موصوف مکرم فرماتے ہیں:۔

"عورت عموماً کمزور ہوتی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۱۹)

ان اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ حرب و قتال کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے عورت فطرتاً ان سے محروم ہے اور جو صلاحیتیں اسے عطا کی گئی ہیں ان کا مقصد اور تقاضا یہ ہے کہ وہ لزوم بیت اختیار کرکے تربیت صبیان اور امور خانہ داری کو سرانجام دے۔

## خواتین عہد نبویؐ

اب اگر عہد نبویؐ کے اِکّا دُکّا واقعات سے یہ معلوم ہو کہ خواتین شریکِ قتال و جنگ تھیں تو یہ ایک وقتی مصلحت اور ہنگامی صورتحال کا نتیجہ تھا یہ اس بات کی دلیل ہرگز نہیں ہے کہ آج اس صنفِ لطیف کو گھر کی پرسکون فضا سے نکال کر گولہ و بارود کی

بمباری میں دھکیل دیا جائے، عہد نبویؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں اگر کوئی طرزِ عمل حجت قرار پا سکتا ہے تو خواتین کا مجموعی طرزِ عمل ہے نہ کہ اکا دکا چند خواتین کا انفرادی طرزِ عمل۔ اس دور کی خواتین کے مجموعی طرزِ عمل کے خلاف ایسی دو چار مثالوں سے دلیل اخذ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے امریکہ جیسے دولتمند ملک میں پندرہ بیس آدمیوں کے بھوک سے مرجانے سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ امریکہ پر افلاس، غربت، فاقہ مستی اور ناداری کا تسلط ہے۔

ان واقعات میں سے ایسے بھی ہیں جن سے عورت کی شرکتِ قتال کو چشمِ نبوت نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ مثلاً یہ واقعہ جو مصنف "فقہ القرآن" نے سیرت النبی (از مولانا شبلی نعمانی) سے لے کر اپنی کتاب میں ثبت کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

"اس غزوہ (یعنی غزوۂ خیبر) میں چند خواتین بھی خود اپنی خوشی سے ساتھ آئی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے ان کو بلا بھیجا اور ان کے بلا اجازت آنے پر غضب کے لہجہ میں فرمایا "تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں؟" بولیں "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس لئے آئی ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گی اور اس کام میں مدد دیں گی ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوائیں بھی ہیں ہم تیر اٹھا اٹھا کر لائیں گی۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فتح کے بعد مال غنیمت تقسیم کیا تو ان کا بھی حصہ لگایا۔ لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر و جواہر نہیں تھے۔ مال و اسباب نہ تھا۔ درہم و دینار نہ تھے بلکہ صرف کھجوریں تھیں تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۶۶)

محترم عثمانی صاحب کے اس اقتباس سے دو باتیں ظاہر ہیں:

اولاً ـــــ یہ کہ خواتین کو اگرچہ شریکِ قتال ہونے کی اجازت دی گئی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد کو پسند نہیں فرمایا۔

ثانیاً ــــــ اس جنگ سے قبل پردے کے احکام نازل ہو چکے تھے اور یہ خواتین پردے میں رہ کر ہی اپنی خدمات انجام دیتی رہی ہیں اقتباس کا آخری جملہ اسی پر دلالت کرتا ہے۔

پہلی بات کے متعلق محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:-

"اس واقعہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ناراضگی کے ساتھ خواتین سے دریافت فرمانا کہ "تم کس کے ساتھ آئیں؟ کس کے حکم سے آئیں؟" اس لئے نہیں تھا کہ ان کے لیۓ جنگ میں حصہ لینا ممنوع تھا بلکہ اس لئے تھا کہ وہ بغیر اطلاع اور بغیر اجازت کے آگئی تھیں جو فوجی نظم وضبط اور ڈسپلن کے خلاف تھا کہ کمانڈر کو معلوم بھی نہ ہوں کہ عورتیں بھی ساتھ ہیں اور عورتیں فوج کے ساتھ لگ لیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۶۷)

موصوفِ محترم کی یہ توجیہ خود ساختہ ہے جو بلا دلیل پیش کر دی گئی ہے اگر یہی بات ہوتی تو آپ صرف اتنا ہی پوچھتے کہ "تم کس کے حکم سے آئیں؟" یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ "تم کس کے ساتھ آئیں؟" سوال کا لب ولہجہ اس ناراضگی کا غماز ہے جو گھر چھوڑ کر شریک قتال بن جانے کی صورت میں آپ نے فرمائی۔ کیونکہ قرآن کے نزدیک میدان جنگ میں بغرض قتال جانا مرد کا کام ہے اور گھر میں اپنے مفوضہ فرائض انجام دینا نسوانی فریضہ ہے۔

ممکن ہے کہ ہمارے یہ مہربان یہ فرمائیں کہ قرآن میں کہاں عورت کا مقام لزوم بیت قرار دیا گیا ہے (نہ کہ میدان حرب وقتال) ـــــ؟ کیونکہ قرآن میں جہاد وقتال کا جہاں بھی ذکر آیا ہے وہ مذکر کے صیغوں میں ہے جس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی شریک کیا جاسکتا ہے جیسا کہ محترم عثمانی صاحب اکثر فرمایا کرتے ہیں ـــــ لیکن میں عرض کروں گا کہ قرآن میں دو مقامات ایسے ہیں جن میں بغیر کسی اشتباہ کے عورت کا اصل مقام ومستقر گھر کو قرار دے کر (اور مرد کا اصل مقام میدانِ جنگ کو قرار دے کر) ان لوگوں کو فضیحت کی گئی ہے جو عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھے رہتے ہیں ملاحظہ فرمائیے سورۃ توبہ کی آیات ۸۶، ۸۷ اور ۹۳ جناب پرویز صاحب ان آیات کا مفہوم ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں۔

"(۸۶) ان کی حالت یہ ہے کہ جب کہیں ایسا حکم نازل ہوتا ہے کہ قوانینِ خداوندی پہ دل سے یقین رکھتے ہوئے رسول کی معیت میں جہاد کے لئے نکلیں تو ان میں سے جو لوگ صاحبِ استطاعت ہیں وہ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں کہ انہیں پیچھے رہنے والوں میں چھوڑ دو۔

(۸۷) یعنی وہ اپنے لئے یہ پسند کرتے ہیں کہ (مردوں کے ساتھ جنگ میں جانے کی بجائے) چوڑیاں پہن کر عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھے رہیں یہ اس لئے کہ ضد اور منافقت کی وجہ سے ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ (ورنہ بات ایسی صاف ہے کہ اس کے لئے لمبے چوڑے دلائل کی بھی ضرورت نہیں ہے)۔

(۹۳) الزام ان کے اوپر ہے جو سب کچھ رکھتے ہوئے (اور جہاد میں جانے کے قابل ہونے کے باوجود) تم سے اجازت مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عورتوں میں بیٹھے رہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس لئے نہیں سمجھتے کہ سہل انگاری اور مفاد پرستی کے جذبات نے ان کے دلوں پہ مہر لگا رکھی ہے اور اس طرح سمجھ سوچ کی تمام راہیں ان پہ مسدود ہو چکی ہیں" (مفہوم القرآن در آیت ۸۶ تا ۸۷، ۹۳)

مولانا ابو الکلام آزاد ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:۔

"اور (اے پیغمبر) جب کوئی (قرآن کی) سورت اس بارے میں اترتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو جو لوگ ان میں مقدور والے ہیں وہی تجھ سے رخصت مانگنے لگتے ہیں کہ "ہمیں چھوڑ دیجئے، گھر میں بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہیں" (۸۶)

"انہوں نے پسند کیا کہ پیچھے رہ جانے والیوں کے ساتھ رہیں (یعنی مرد ہو کر جنگ کے وقت عورتوں کے ساتھ گھروں میں بیٹھے رہیں) اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی پس یہ کچھ سمجھتے نہیں" (۸۷)

"الزام تو دراصل ان پر ہے جو تجھ سے (بیٹھے رہنے کی) اجازت مانگتے ہیں حالانکہ مالدار ہیں انہوں نے پسند کیا کہ (جب سب لوگ راہِ حق میں کوچ کر رہے ہوں تو یہ) گھروں میں رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہیں! (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ پس جانتے بوجھتے نہیں۔" (۹۳) (ترجمان القرآن ص ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲)

ان آیات کا مفہوم جناب پرویز صاحب کے قلم سے محض اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ عام طور پر محترم عثمانی صاحب اور ان کو چند جزئی اختلافات کے باوجود ہم فکر اور ہم نظر تصور کیا جاتا ہے اور مولانا آزاد کا ترجمہ اس بناء پر کہ موصوف محترم ان کے ترجمے پر صاد فرمایا کرتے ہیں نامناسب ہوگا اگر ہم مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک اقتباس کے بغیر اس بحث کو ختم کر دیں۔

"رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ۔ شریعت اسلام نے جو مشاغلِ حیات مرد کے ساتھ مخصوص کر رکھے ہیں اور عورت کو ان سے الگ کر رکھا ہے ان میں ایک شغل جہاد (بمعنی قتال قاسمی) کا بھی ہے آیت میں جہاد سے جی چرانے والوں پر طنز ہے کہ مرد ہو کر اچھے خاصے عورت بنے جا رہے ہیں[1]۔ فیہ تھجین لھم و مبالغۃ فی الذمّ والخوالف النساء قالہ الجمھور --- وذالک ابلغ فی الذم لانھم نزلوا انفسھم منزلۃ النساء --- (بحر)

(تفسیر ماجدی سورہ توبہ حاشیہ ۱۶۰)

زیر بحث آیات میں دو باتیں قطعی طور پر واضح ہیں:۔

۱۔ ان دونوں آیات میں "الخوالف" کے لفظ سے خواتین کے بارے میں یہ خاص طور پر واضح کیا گیا ہے کہ میدان حرب و قتال ان کے دائرۂ تگ و تاز سے خارج ہے اور

---

[1] اس میں ان کی تحقیر اور تعییب ہے نیز ان کی مذمت میں مبالغہ ہے۔ الخوالف سے مراد عورتیں ہیں یہ انداز بیان ان کی مذمت میں بڑا بلیغ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خانہ نشین خواتین کے مقام پر رکھا ہے۔

سورۂ توبہ (جس میں زیرِ بحث آیات شامل ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری دورِ حیات میں نازل ہوئی تھی۔ ان آیات کے نزول کے بعد کسی آیت میں عورتوں کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں کہا گیا کہ میدان جنگ و جدل بھی ان کے دائرۂ عمل میں شامل ہے۔

۲۔ ان آیات میں یہ نہیں کہا گیا کہ ــــــ "آج سے عورتوں کے دائرۂ عمل سے حرب و قتال کا فعل خارج کیا جاتا ہے" ــــــ بلکہ اسے ان آیات کے نزول سے قبل کے اسلامی معاشرے کی ایک ایسی طے شدہ پالیسی کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس پر عمومیت کے ساتھ (چند استثنائی اور خصوصی مثالوں کو چھوڑ کر) عمل ہوتا چلا آیا ہے اسلام کی یہ پالیسی کیسے طے ہوئی؟ اس کے تین ہی ممکن جواب ہو سکتے ہیں:۔

اوّلاً ــــــ یہ کہ یہ پالیسی قرآنی الفاظ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ پر مبنی ہو اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ الفاظ، ازواجِ مطہرات سے خاص نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات محترم عثمانی صاحب کو ناقابلِ قبول ہے۔

ثانیاً ــــــ یہ کہ خارج از قرآن اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم دیا ہو اور وہ اس پالیسی کی بنیاد بنا ہو۔ اگر یہی صورت ہو تو پھر علماء کرام کی اس بات کی تصدیق کے بغیر چارۂ کار نہیں کہ پیغمبرِ خدا کو قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعے سے کچھ احکام دیئے جاتے تھے جو کتاب اللہ ہی کی طرح واجب الاتباع تھے۔

ثالثاً ــــــ یہ کہ اہلِ عرب کی معاشرت کا یہ عام اصول ہو کہ خواتین شریکِ قتال و حرب نہ ہوں اور سورۂ توبہ کی آیات نے اس اصول کو لفظ "الخوالف" کی بناء پر برقرار رکھا ہو تو اس صورت میں جاہلیت کا وہ طرزِ عمل قرآن سے سندِ جواز پا جاتا ہے جسے قرآن نے تردید و تغلیط کی بجائے علیٰ حالہٖ رکھ کر اس کی تائید و تصویب کی ہو اس طرح شخصی ملکیت کا اصول بھی قرآن کا طے شدہ اصول قرار پاتا ہے۔

ان میں سے محترم عثمانی صاحب جو پہلو بھی اختیار فرمائیں گے اپنے محبوب مسلّمات میں سے کسی ایک کی قربانی دے کر ہی ایسا کریں گے۔

ہماری اس بحث سے یہ واضح ہے کہ قرآن حکیم کے نزدیک عورت کا اصل مقام و مستقر گھر ہے نہ کہ میدان حرب و ضرب ۔ تاہم اس حقیقت سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں کہ دور قدیم اور دور جدید کی جنگ میں ایک بنیادی فرق واقع ہو چکا ہے ۔ دور جدید کی جنگ صرف دو متحارب فوجوں کی جنگ نہیں رہی بلکہ دو متحارب قوموں کی جنگ بن چکی ہے اس لئے ضروری ہے کہ دوران جنگ خواتین کو ایسی خدمات سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت دی جائے جو ان کی نسوانی فطرت سے ہم آہنگ ہوں مثلاً مجروحین کی مرہم پٹی اور تیمارداری عساکر کے لئے اہتمام خورد و نوش، ابتدائی طبی امداد کی فراہمی وغیرہ وغیرہ ۔

# چھٹی فصل ۔ مخلوط تعلیم

**مخلوط تعلیم اور عثمانی صاحب**

مخلوط معاشرت کے حق میں "قرآنی دلائل" فراہم کرنے والے مخلوط تعلیم کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں؟ جناب عثمانی صاحب نے "مخلوط تعلیم" کے حق میں مندرجہ ذیل دلائل و براہین پیش کئے ہیں ۔

"ہمارے دور کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلام کی رو سے کیا مخلوط تعلیم کی اجازت دی جا سکتی ہے یا لڑکیوں کے لئے الگ زنانہ کالج یا زنانہ یونیورسٹیاں قائم کرنی چاہئیں گذشتہ تصریحات دورِ نبوی میں مساجد میں مردوں کے ساتھ باجماعت نمازمیں عورتوں کی شرکت اور حج کے موقع پر مخلوط اجتماعات وغیرہ سے ہم سمجھتے ہیں کہ لڑکیاں اگر اسلامی ہدایاتِ حجاب کی پابندی کے ساتھ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مرد طلبہ کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے" (فقہ القرآن ج ۳ ص۲۱۶)

---

[1] ہمارے ملک میں مخلوط تعلیم کا مسئلہ صرف یونیورسٹی کی حد تک محدود ہے کیونکہ سکولوں اور کالجوں میں پہلے ہی جداگانہ معاشرت کے تحت سلسلۂ تعلیم جاری ہے ۔

جہاں تک محترم عثمانی صاحب کے حج اور مساجد میں "مخلوط اجتماعات" کا تعلق ہے ہم تفصیل سے اس پر گفتگو کر چکے ہیں، ہر سلیم الفطرت شخص اسے پڑھ کر بخوبی جان سکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ امور مخلوط سوسائٹی یا مخلوط تعلیم کے حق میں دلائل قرار پاتے ہیں یا اس کے خلاف بہرحال تہذیب مغرب کی پیروی میں اختلاطِ صنفین اور مخلوط تعلیم کے حق میں یہ "قرآنی" دلائل پیش کرتے ہوئے انہیں ــــــــ تنکا نظر آجاتا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ

"میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں قرآنی قوانین بیان کر رہا ہوں۔ مغرب کی وکالت نہیں کر رہا ہوں۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۲۱۷)

**عثمانی صاحب کی اصل الجھن**

موصوف محترم کی اصل الجھن یہ ہے کہ مغربیت کے دامِ سحر میں گرفتار ہیں، مغربیت ان پر ایسی گرفت پا چکی ہے کہ وہ زندگی کا جو نقشہ بھی از روئے اسلام بناتے ہیں وہ سراسر مغربی طرز ہی کا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے ان کا تعلق فکری اور نظری اعتبار سے تو کٹ چکا ہے مگر وہ کتاب اللہ کے ساتھ اپنا موروثی اور نسلی تعلق، برملا کاٹ دینے کی اخلاقی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے اس لئے بیچارے دوہری الجھن کا شکار ہیں قرآن سے وہ اپنا موروثی رشتہ توڑ نہیں پاتے جبکہ وہ نظری اور فکری طور پر اُن کی ہمنوائی نہیں کرتا ہے مغربی افکار و نظریات پر ان کا ایمان ہے مگر وہ کھلے بندوں مغربیت کا نام لے کر اسے اختیار نہیں کرنا چاہتے۔

؎ دو گونہ رنج و عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلےٰ و فرقتِ لیلےٰ!

**مخلوط تعلیم اور "عقلی دلائل"**

محترم عثمانی صاحب تو دینی مدارس کے فارغ التحصیل ایک "مولوی صاحب" ہیں جن کا کام صرف یہ تھا کہ وہ حج اور مساجد کے "مخلوط اجتماعات" سے "شرعی دلائل" پیش فرما دیں سو یہ کام وہ کر چکے اس کے بعد اگلا کام ہمارے "دانشوروں" کا ہے کہ وہ کچھ "عقلی دلائل" پیش فرمائیں۔

ان عقلی دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔۔۔ پاکستان ایک قلیل الوسائل ملک ہے ہم تعلیم پر اب بھی اس قدر خرچ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، جس قدر کہ ہمیں خرچ کرنا چاہئے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم پہلے سے جو یونیورسٹیاں قائم کر چکے ہیں ان کی بہتری اور استحکام کی کوشش کریں نہ یہ کہ ہم نئی خواتین یونیورسٹی کا بوجھ اس غریب ملک و قوم پر لاد دیں بالخصوص جبکہ اس خواتین یونیورسٹی کے بغیر بھی کام چل ہی رہا ہے۔

۲۔۔۔ ملکی ترقی کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ ہمارے خواتین و حضرات مل جل کر مصروفِ عمل ہوں۔ اس شانہ بشانہ جدوجہد اور قدم بقدم تگ و تاز کی بہترین تربیت مخلوط تعلیمی اداروں ہی میں ممکن ہے نہ کہ جداگانہ تعلیمی اداروں میں۔

۳۔۔۔ جداگانہ نظام تعلیم کا اجراء (اور بالخصوص خواتین یونیورسٹی کا قیام) زمانے کی رو کے خلاف ایک قدم ہو گا، ایسے نظام تعلیم کو اختیار کر کے ہم دنیا کے ناپیدا کنار سمندر میں ایک منقطع جزیرہ بن کر رہ جائیں گے۔

یہ ہے کل کائنات ان دلائل کی جو اس موضوع پر اکثر و بیشتر اخبارات و جرائد میں پیش کئے جاتے ہیں ہم ان دلائل کا بڑے اختصار و اجمال سے جائزہ لے رہے ہیں۔

وسائل کی کمی کا رونا محض ایک بہانہ ہے جو تقلید مغرب کی خاطر گھڑا جاتا ہے اگر

**۱۔ قلتِ وسائل کا بہانہ** کوئی قوم اپنے مقصدِ حیات اور نظریۂ زندگی کو اہمیت دیتی ہے تو وسائل کی کمی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی وہ وسائل کو بہر صورت اور بہر حال فراہم کر لیتی ہے۔ وسائل و ذرائع مقاصد کے پیشِ نظر اختیار کئے جاتے ہیں۔ مقاصد کو وسائل کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا اگر جداگانہ نظام تعلیم (اور بالخصوص خواتین یونیورسٹی کے قیام) کی اہمیت از روئے عقل اور از روئے دین و اخلاق مسلم ہے تو پھر وسائل کی قلت کی شکایت بے جا ہے انہیں ہر ممکن طریقہ سے فراہم کرنا ہی ہو گا۔ اور اپنے مقصد

کی راہ میں انہیں صرف کرنا ہی ہوگا کیونکہ کسی چیز کی اہمیت کا اندازہ تو اسی بات سے لگایا جاتا ہے کہ اس کے لیے کس قدر وسائل مختص کئے گئے ہیں۔ اور یہ بات یاد رکھیئے کہ دنیا میں ایسی مثالی صورت حال (IDEAL SITUATION) کہیں بھی موجود نہیں ہوتی ہے کہ جملہ وسائل چاندی کی طشتری میں از خود پیش ہو جائیں۔ بلکہ جس نے بھی کسی مقصد حیات کو پیش نظر رکھ کر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا ہے اس نے ذرائع کی پیدائش اور وسائل کی فراہمی کی رسم کو خود سر انجام دی ہے۔ اس لئے اگر جداگانہ نظام تعلیم کے لئے ہمارے پاس وسائل کی قلت بھی ہو تو اس کمی کو پورا کرنا خود ہمارے دین اور اخلاق کا بنیادی اور براہِ راست تقاضا ہے۔

(الف) افرادی وسائل کی قلت کا مسئلہ کہا جاتا ہے کہ خواتین یونیورسٹی کے لئے مطلوبہ سٹاف دستیاب نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ایک گریزاں ذہنیت کا تراشا ہوا بہانہ ہے اس وقت بھی ہماری موجودہ یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں (محتاط سے محتاط اندازے کے مطابق بھی) اتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ معلمات موجود ہیں جو ایک خواتین یونیورسٹی کی ضروریات کی کفایت کر سکیں۔ ان معلمات میں بہت سی خواتین ایسی ہیں جو مختلف مضامین میں مثلاً تعلیم عربی، فارسی، فلسفہ، جغرافیہ، عملی نفسیات، تاریخ، سیاسیات، زوالوجی، سالڈ سٹیٹ فزکس، کیمسٹری، علم توالد و تناسل (یعنی ) اور مائیکرو بیالوجی وغیرہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھتی ہیں۔ ان خواتین میں ایسی معلمات بھی ہیں جو اکثر تعلیمی اداروں میں نظم و نسق کا تجربہ بھی رکھتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ خواتین یونیورسٹی اگر قائم کی جائے تو افرادی وسائل ناپید ہوں گے۔

تاہم اگر ابتداء میں ایسی مشکل پیدا بھی ہو جائے تو اس کو یوں حل کیا جا سکتا ہے کہ ہماری قوم کے وہ عمر رسیدہ اساتذہ جن کی سیرت و کردار قابلِ اعتماد ہو انہیں اس وقت تک کے لئے خواتین یونیورسٹی میں تعینات رکھا جائے جب تک کہ مطلوبہ معلمات فراہم نہیں ہوتیں بلکہ اس صورت میں یہ عمر رسیدہ اور تجربہ کار اساتذہ خود ایسی معلمات کی تیاری میں بھرپور مثبت کردار ادا کریں گے۔

ب۔ مالی وسائل کی قلت کا مسئلہ| ہمارے ملک میں یونیورسٹی طلبہ کی بڑھتی تعداد کے پیش نظر ہر پانچ چھ سال کے بعد ایک نئی یونیورسٹی کھولی جا رہی ہے گذشتہ پندرہ سالوں میں یونیورسٹیوں کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہوا ہے اس کی مثال اس سے قبل ہمارے ملک میں نہیں ملتی۔ اب جبکہ مردانہ یونیورسٹیوں میں طلبہ وطالبات کے روز افزوں اضافے کے باعث نئی یونیورسٹیاں کھولنا ناگزیر ہی ہیں تو پھر کیوں نہ خواتین یونیورسٹیاں ہی کھولی جائیں اس صورت میں تو ملکی مالیات پر کوئی خاطر خواہ بوجھ نہیں پڑے گا۔

اگر پھر بھی وسائل میں کمی رہ جائے تو بین الاقوامی مسلم اداروں سے امداد حاصل کی جاسکتی ہے اگر اسی قسم کے باہمی تعاون کی بنیاد پر اسلام آباد کی اسلامی یونیورسٹی کو قائم کیا اور چلایا جاسکتا ہے تو آخر خواتین یونیورسٹی کے لئے اس قسم کی کوشش کیوں نہیں کی جاسکتی۔

جواب دلیل ثانی| رہی یہ دلیل کہ ملک کی ترقی وخوش حالی کے لئے خواتین وحضرات کو شانہ بشانہ گامزن کرنے کے لئے مخلوط ادارے ضروری ہیں۔ تو یہ اصل مقصد سے فرار کے لئے ایک مغالطہ انگیز بہانہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ " شانہ بشانہ جدوجہد" اور" قدم بقدم تگ وتاز" سے کیا مراد ہے ؟ ــــــ اگر اس کا معنیٰ یہ ہے کہ مرد وزن کے فطری دوائر عمل کی حدود کو ختم کر کے دونوں کو ایک ہی دائرہ عمل میں کھپا دیا جائے اس طرح کہ معاشی میدان میں عورت بھی مرد کے ساتھ ہتھوڑوں سے پتھر توڑ کر تعمیراتی خدمات انجام دے رہی ہو یا وہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، تھیٹر یا فلم سکرین پر یوں خدمتِ ثقافت میں مصروف ہو کہ کسی مخرب اخلاق اور فحش گیت کا ایک مصرعہ مرد گا رہا ہو اور دوسرا مصرعہ عورت پیش کر رہی ہو یا اپنے گھر میں اپنے بچوں کی ماں بن کر اپنے فطری فرائض کی بجا آوری کی بجائے وہ مرد وزن کے مخلوط اجتماعات میں خطاب فرما کر " مادر امت" کا اعزاز پا رہی ہو ــــ تو ظاہر ہے کہ اسلام ایسی" شانہ بشانہ کارکردگی" کی اجازت نہیں دے سکتا ــــ لیکن اگر اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ہر صنفِ بشر اپنے فطری دائرۂ کار میں رہتے ہوئے اپنی فطری صلاحیت

کے مطابق تمدن کی خدمت کرتے ہوئے ملکی ترقی میں "شانہ بشانہ" حصہ لے تو یہ عین اسلام کا تقاضا ہے کیونکہ اس طرح خاتون خانہ کا اپنے دائرۂ عمل میں رہ کر اپنے واجبات ادا کرنا اسی طرح شانہ بشانہ خدمتِ ملک و ملت ہے جس طرح مزدور کارخانے میں اور کاشتکار کھیت میں جدا گانہ مقامات پر عمل کرتے ہوئے قدم بقدم تگ و دو اور شانہ بشانہ جدوجہد میں مصروف قرار پاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی جدوجہد کے لئے مخلوط تعلیمی اداروں کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

باقی رہا یہ امر کہ مخلوط تعلیم مرد و زن کے سماجی روابط کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے تو یہ بات صحیح ہے بشرطیکہ "استحکام" کا معنیٰ مقلوب و معکوس کر دیا جائے مخلوط تعلیم سے

**مخلوط تعلیم کے اثرات و نتائج** جو اثرات و نتائج مغرب میں ظاہر ہوئے ہیں ان کو نومسلم خاتون محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ نے اپنی کتاب "تہذیب مغرب' اپنی ملامت آپ" (بزبان انگریزی) میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے وہ ایک مقام پر رقم طراز ہیں کہ

> "مسٹر وانس پیکارڈ (VANCE PACKARD) نے جو امریکہ کے مشہور سماجی نقاد ہیں بڑی مشقت اٹھا کر حال ہی میں "جنسی بے راہروی" (THE SEXUAL WILDERNESS) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو تعلیمی اداروں کی نوجوان نسل میں پھیلے ہوئے جنسی اعمال کی تحقیق (SURVEY) پر مشتمل ہے اس کتاب میں مسٹر وانس پیکارڈ نے بڑے واضح اعداد و شمار پیش کئے ہیں اپنے سروے کے دوران مصنف نے امریکہ کینیڈا، انگلینڈ، ناروے، جرمنی اور اٹلی کے کلیات و جامعات کے دو ہزار طلبہ سے رابطہ پیدا کیا اس کی تحقیقات کے مطابق امریکی کالجوں کی اکیس سال تک کی طالبات میں جنسی عمل کے تجربات میں گزشتہ بیس سالوں میں ساٹھ فی صد (۶۰ ٪) اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء کی مشہورِ عالم کنزے رپورٹ (KINSEY REPORT) میں اسی عمر کی کالج کی طالبات میں قبل از نکاح ازالۂ عصمت کی شرح ۲۷ فیصد درج کی گئی تھی مسٹر پیکارڈ

نے اب ۴۳ ٪ اضافی شرح بیان کی ہے امریکی طالبات کے یہ اعداد و شمار تصویر کا ایک اور رخ ظاہر کرتے ہیں جو کالجوں میں طالبات کے داخلے میں اضافے کی شرح کی روشنی میں ایک المیہ ہے ۱۹۴۰ء کے مقابلے میں ۱۹۶۳ء میں امریکی کالجوں میں در آنے والی طالبات میں ۱۹ فیصد کا اضافہ ہوا ہے لیکن قبل از نکاح جنسی اعمال میں ملوث لڑکیوں کی شرح اب ۲۷٪ سے ۴۳٪ ہو گئی ہے۔ اعداد و شمار کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کالج میں داخل ہونے والی ہر انیس لڑکیوں میں سولہ سے زائد طالبات پیش از نکاح جنسی عمل میں ملوث ہیں۔ یہ اسی فیصد (۸۰٪) شرح بنتی ہے۔

لیکن یہ تحقیقاتی رپورٹ اصل المیے کی صرف ایک جھلک ہے اس کی مکمل رپورٹ نہیں ہے۔

جب تک کسی سماج میں اپنے خسارہ و نقصان کا احساس زندہ رہتا ہے تو اس کا زیاں چنداں زیادہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے احساس کی بدولت تلافیٔ مافات کی توقع کر سکتا ہے لیکن کوئی سوسائٹی جب اپنے احساسِ زیاں سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کی صورتحال یکسر مایوس کن اور قنوط پذیر ہو جاتی ہے۔"

WESTERN CIVILIZATION, CONDEMNED BY ITSELF: P:723

یہ ہے وہ "مثبت کردار" اور صنفین کے باہمی روابط میں پیدا ہونے والا وہ "استحکام" جو مخلوط تعلیم کا ثمرہ ہے، مخلوط تعلیم کے بہت سے مفاسد میں سے تین تو ایسے واضح مضرات ہیں کہ جس کے دیدوں میں ذرا سی بھی روشنی ہو وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

۱۔ **آرائش و زیبائش پر مسرفانہ اخراجات** مخلوط تعلیم اور مخلوط سوسائٹی کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں ہر فرد صنف مخالف کی نگاہ میں جاذب نظر اور پُرکشش بننے کی کوشش کرتا ہے جس کے لئے انہیں جدید اور اعلیٰ ترین اسباب زینت درکار ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے تحسین و تزئین میں بڑھ جانے کے لئے ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے جس میں کوئی شخص پیچھے رہ جانا نہیں چاہتا اور ظاہر ہے کہ ان کاموں کے لئے دولت زر کا مسرفانہ استعمال

ہوتا ہے۔ جائز ذرائع سے (بشرطیکہ جائز اور ناجائز ذرائع میں امتیاز کا احساس باقی رہ گیا ہو) حاصل شدہ دولت اگر کفایت نہیں کرتی تو ناجائز رقم کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں مارے جاتے ہیں اس طرح یہ مخلوط تعلیم ایسی مخلوط سوسائٹی کا ہراول دستہ ثابت ہوتی ہے جس کا ہر فرد اسراف و تبذیر کی راہ اختیار کرنے پر از خود مجبور ہوتا ہے۔

۲۔ جنسی امراض کا پھیلاؤ: کالجوں اور یونیورسٹیوں کی مخلوط تعلیم میں ناجائز تعلقات کے فروغ کے ساتھ ساتھ جنسی امراض کی وبا ر پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ وطالبات آج مغربی معاشرے میں ان جنسی امراض کا بری طرح شکار ہیں جو وہاں وبا کی طرح پھیل رہے ہیں اور اب تو وہاں حالت یہ ہے کہ بعض منچلے، کھلنڈرے اور شوخ مزاج افراد ان امراض سے اس "فلسفہ" کے پیش نظر نہیں گھبراتے کہ — یہ امراض تو لطفِ زندگی کی قیمت ہیں۔

۳۔ تعلیمی ماحول پر شہوانیت کا غلبہ: تعلیمی ادارے اصلاً تو تعلیم و تعلم کے ادارے ہیں مگر مغربی ممالک کا تجربہ اس پر شاہد ہے کہ مخلوط تعلیم نے ان مقدس اداروں کو فاحشہ گری کے اڈوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ جہاں "حریت فرد" اور سرکاری سطح پر جنسی تعلیم کے داخلِ نصاب ہونے کے باعث شرم وحیا، نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

اب ذرا سوچیئے کہ ایسے ماحول میں جہاں بالغ طلبہ اور بالغ طالبات کو صنفی عمل کی بھی آزادی ہو۔ مانع حمل ادویات کے طفیل حمل سے پیچھا چھڑانے کے اسباب بھی میسر ہوں، سوسائٹی کی اخلاقی حس بھی معطل ہو چکی ہو۔ جنسی عمل اگر روز افزوں ہو تو تعلیمی اداروں کا تقدس کیسے برقرار رہ سکتا ہے؟ ایسے اداروں میں صِنفَین کا چند گھنٹوں کے لئے خوشگوار وقت گزار کر جدا ہونا اگلے دن کی باہمی ملاقات کے لئے انہیں سراپا اشتیاق و انتظار بنا دیتا ہے تعلیمی اداروں میں چند گھنٹوں کا قیام ہر صنف بشر کے قلب و دماغ پر شہوانیت کا ایسا غلبہ قائم کر دیتا ہے کہ گھر آ کر بھی وہ کوئی تعلیمی کام نہیں کر سکتے۔ کاپی کا ہر صفحہ حسینوں کے خطوط اور کتاب کی ہر تصویر انہیں "تصویر یار" دکھائی دیتی ہے ایسے ماحول میں تعلیم و تعلم کا کام ٹھپ ہو جاتا ہے اور طلبہ وطالبات

شہوانیت کے دباؤ کے تحت اعصابی تناؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

**ایک خوش فہمی** ہمارے ہاں کے بعض بظاہر سادہ مگر بباطن پُرکار دانشور یہ فرماتے ہیں کہ

"وہ مغرب ہے، یہ مشرق ہے وہ غیر مسلم ہیں ہم مسلمان ہیں اس لئے مخلوط تعلیم نے جو نتائج اہل مغرب کے ہاں پیدا کئے ہیں وہ ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوں گے ۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

حیرت ہے کہ یہ لوگ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ کسی راستے کو اختیار کرنے والا آدمی نہ تو اس راستے کے مراحل و منازل ہی سے چھٹکارا پا سکتا ہے اور نہ ہی اس آخری مقام پہ پہنچے بغیر رہ سکتا ہے جس کی طرف یہ راستہ منتہی ہوتا ہے (بشرطیکہ وہ اس راستے پر اپنا سفر برقرار رکھے)۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ راستہ تو اختیار کریں ترکستان کو جانے والا، لیکن اس پہ چلتے ہوئے آپ کو مراحل و منازل وہ پیش آئیں جو کعبہ کے راستے میں واقع ہیں مخلوط تعلیم کا راستہ اپنانے کے بعد یہ توقع رکھنا کہ ہم اُن مفاسد اور مضرات سے محفوظ رہیں گے جو مغرب میں پیدا ہوئے ہیں بلکہ الٹا اُن فوائد و ثمرات کے حصول کا یقین رکھنا جو باحیا، عفت مآب، عصمت پرور اور پردہ دارانہ غیر مخلوط نظام تعلیم میں حاصل ہوتے ہیں ایک خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور اس کی مثال ایسے ہی ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

**خواتین یونیورسٹی ۔ ناگزیر ضرورت** اس بحث کی روشنی میں جامعہ خواتین کا قیام صرف ہمارے دین و اخلاق کا تقاضا ہی نہیں ہے بلکہ مغرب میں ظاہر ہونے والے مفاسد سے حفاظت و صیانت کا بھی تقاضا ہے۔ اس کی مخالفت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کی عقل اس کی جنسی خواہشات سے مغلوب ہو چکی ہو۔ خواتین یونیورسٹی کے قیام کو اگر دین و اخلاق کی روشنی میں دیکھا جائے تو جلب منفعت کا ذریعہ ہے اور اگر مغرب کے تجربات کی روشنی میں دیکھا جائے تو دفع مضرت کا وسیلہ ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ خواتین یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت میں وہ تجدد پسند طبقہ پیش پیش ہے جو مرد و زن کی کامل مساوات کا نقیب اور علمبردار بنا ہوا ہے اور اس کی گفتگو کی آخری حجت یہ ہوتی ہے کہ خواتین ہمارے ملک کا نصف حصہ ہیں انہیں نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے؟ لیکن جب خواتین یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے تو انہیں سارا ملک شاید مردوں پر ہی مشتمل دکھائی دیتا ہے۔ مردوں کیلئے ہر جگہ یونیورسٹیاں موجود ہوں مگر ملک کی نصف آبادی پر مشتمل اس طبقہ اناث کیلئے ایک بھی یونیورسٹی نہ ہو؟ سیاسی اور معاشرتی طور پر انہیں مردوں کے مساوی مقام دینے پر پورا زور صرف ہوتا ہے لیکن تعلیمی میدان میں ان کے لئے ایک بھی یونیورسٹی قائم کرنے کی آواز اٹھے تو اس کی مخالفت ان "ہمدردانِ نسواں" پر لازم ہو جاتی ہے۔

**جامعۂ خواتین۔ خلافِ زمانہ قدم؟** رہا یہ نعرہ کہ جامعۂ خواتین کا قیام زمانے کی رَو کے خلاف ایک قدم ہوگا۔ تو یہ کسی خدا پرست شخص کا نعرہ نہیں بلکہ زمانہ پرست فرد کا نعرہ ہو سکتا ہے جس کی پوری زندگی کے رُخ کا تعین زمانے کی گردشوں کے رحم و کرم پر ہو ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ ـــــ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" ـــــ کو اپنا مسلکِ حیات بنالے بلکہ یہ ہے کہ وہ پوری زندگی کے دریا کو اس رُخ پر بہنے پر مجبور کر دے جو اس کے دین و ایمان کی روشنی میں صحیح ہے۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ خواتین یونیورسٹی کا قیام اب زمانے کے خلاف کوئی نیا اور انوکھا قدم نہیں ہوگا۔ اب تو وہ ممالک بھی اپنے ہاں ایسی جامعات قائم کر رہے ہیں جو قطعی غیر مسلم ہیں مگر حقائق کے دباؤ نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ خواتین کو مردوں کی شخصیت کا ضمیمہ بنا کر انہیں کے ساتھ مردانہ یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رکھنے کی بجائے ان کی مستقل شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے لئے الگ مخصوص جامعات قائم کریں۔ چنانچہ بھارت میں خواتین کی چند یونیورسٹیاں قائم ہیں جبکہ ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اسی طرح دیگر ممالک میں خواتین کے لئے الگ جامعات کا قیام تیزی سے عمل میں آرہا ہے۔

"بعض دوسرے ممالک نے کسی نظریاتی بنیاد پر نہیں بلکہ محض اپنی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر خواتین کی الگ یونیورسٹیاں قائم کر رکھی ہیں۔ نمایاں مثال بھارت کی ہے۔ جہاں پونا دمن یونیورسٹی اور بمبئی میں ٹاکرے یونیورسٹی موجود ہیں، یہ یونیورسٹیاں بھارتی خواتین کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے نصاب میں وہ مضامین شامل ہیں جن سے نسوانی ذہن کے نشوو ارتقاء میں مدد مل رہی ہے مغربی ممالک میں بھی تمام بڑی یونیورسٹیاں، مردوں اور عورتوں کے لئے الگ تعلیم کا بندوبست کرتی ہیں چنانچہ امریکہ میں سات اعلیٰ تعلیم کے ادارے صرف خواتین کے لئے قائم ہیں یہاں کی ہارورڈ اور برطانیہ کی مشہور آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی میں طلبہ اور طالبات کی تعلیم کا الگ الگ انتظام ہے، فلپائن اور روس میں بھی خواتین کی الگ یونیورسٹیاں قائم ہیں۔"
(مجلہ تنظیم (تنظیم اساتذہ پاکستان) خواتین یونیورسٹی نمبر ص ۹۳)

# باب ٦

# شہادتِ نسواں
## (قرآن کریم کی روشنی میں)

یہ وہ مقالہ[1] ہے جو آج سے تقریباً تین سال قبل روز نامہ جسارت کراچی میں گیارہ قسطوں میں شائع ہوا اس مقالہ کی اشاعت پر مجھے داد و تحسین کے جو خطوط وصول ہوتے اللہ سے میری ہمت افزائی ہوئی اسی تشجیع و ہمت افزائی کے نتیجہ میں میں نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ تہذیب جدید نے صنف نازک سے متعلق جو مسائل بھی اسلامیت کے ساتھ کشمکش کے نتیجہ میں پیدا کئے ہیں۔ مجھے ان سب پر قرآن کریم کی روشنی میں قلم اٹھانا چاہیئے میری یہ پوری کتاب اسی کوشش ناتمام کا نتیجہ ہے۔

میرے اس مقالہ کی اشاعت پر روز نامہ جسارت کراچی نے یہ ادارتی نوٹ ثبت کیا تھا۔

"پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب کا زیر نظر مقالہ وقت کے ایک اہم مسئلہ پر زبردست علمی کاوش ہے اصل مقالہ میں عربی اور انگریزی کے حوالجات شامل ہیں مگر ہم یہاں طوالت کے خوف سے حذف کر کے صرف اس کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں اس فکر انگیز مقالہ کا باقی حصہ آپ کل سے روز نامہ جسارت کے ادارتی صفحہ پر ملاحظہ فرما سکیں گے۔

---

[1] اب اسے معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ شامل کتاب کیا جا رہا ہے ــــــ قاسمی۔

عورتوں کی عدالتی شہادت کا مسئلہ آج کل اخبارات و رسائل میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اخبار بین حضرات جانتے ہیں کہ اس بحث میں دو گروہ خم ٹھونک کر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے ہیں۔ ایک گروہ ان علماء امت پر مشتمل ہے جن کی نمائندگی اس بحث میں مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی اور مولانا محمد عبد السلام صاحب فرما رہے ہیں ان کا موقف یہ ہے کہ

"کتب تفسیر اور کتب فقہ و فتاویٰ کے حوالوں سے (جو مضمونِ زیرِ حوالہ میں موجود ہیں) یہ ثابت ہوا کہ چار درجوں میں سے دو درجوں میں عورت کی شہادت مقبول ہی نہیں ہے (۱) حد زنا (۲) حدود و قصاص (۳) اموال و حقوق۔ ان میں عورتوں کی شہادت مقبول اس وقت ہے جب کہ اس کے ساتھ ایک مرد گواہ بھی موجود ہو اور اس میں دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے گویا عورت کی شہادت اس میں بھی مکمل معتبر نہیں۔ بعض صورتوں میں مقبول ہے اور بعض میں مقبول نہیں، نیز جہاں عورت کی شہادت مردوں کے ساتھ مقبول ہے وہاں پر عورت کی شہادت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ (۴) عورت کی شہادت مکمل طور پر چوتھے درجے میں مقبول ہے جبکہ معاملہ ایسا ہے جس کا تعلق عورت کی مخفی چیزوں سے ہو۔"

(مضمون مولانا عبد السلام صاحب جسارت ۱۷ مارچ ۱۹۸۳ء)

مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی بھی شہادت کے چار درجے قائم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ کہ

"**پہلا درجہ**: زنا اور بدکاری، اس میں چار مردوں کی شہادت معتبر ہوگی عورتوں کی شہادت غیر معتبر ہے اس سلسلے میں مردوں ہی کی شہادت ضروری ہے۔

**دوسرا درجہ**: بدکاری کے علاوہ دوسرے حدود و قصاص:

ان میں بھی عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی۔

**تیسرا درجہ:** نکاح وطلاق کے مقدمات اور دیگر مالی مقدمات:
ان میں عورتوں کی شہادت اس طرح قبول کی جاتی ہے کہ ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں ہوں۔

**چوتھا درجہ:** عورتوں کے مخصوص معاملات کے متعلق کوئی امر ہو تو اس میں تنہا[1] عورتوں کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔"

(جسارت ۲۵ر مارچ ۱۹۸۳ء)

دوسرا گروہ ان حضرات پر مشتمل ہے جن کی نمائندگی جناب غلام احمد پرویز صاحب اور مولانا عمر احمد عثمانی صاحب (جو مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں) کر رہے ہیں۔ یہ اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے جدید طبقے سے وابستہ ہیں ان کا موقف یہ ہے کہ

"کسی مقام پر بھی (قرآن میں) شہادت کے ضمن میں عورتوں یا مردوں میں تخصیص یا تفریق نہیں کی گئی قرآن نے صرف گواہ (شاہد) کہا ہے خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورتیں۔ اس (قرآن) کی رو سے شہادت کے لئے نہ جنس (      ) کی کوئی تخصیص ہے اور نہ شرط۔ ایک مقام ایسا ہے جہاں "ایک مرد اور دو عورتوں" کا ذکر ہے اسے سمجھ لینے سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔" (اس کے بعد آیت ۲/۲۸۲ کی وضاحت کی گئی ہے قاسمی)"۔

(طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۸۳ء)

مولانا عمر احمد عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"صرف ایک آیت جو قرض کے لین دین سے متعلق ہے صرف اسی میں مردوں اور عورتوں کی شہادت کے نصاب میں قرآن کریم نے فرق کیا ہے کہ

---

[1] تنہا عورتوں کی شہادت اس وقت بھی قابل قبول ہے جبکہ جائے وقوعہ پہ اتفاق سے کوئی مرد موجود نہ ہو اور محض عورتیں ہی واقعہ کی تنہا گواہ ہوں۔ اس پر امت کا اجماع ہے۔

دو مرد گواہی دیں اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں باقی تمام آیات میں جو شہادت ہی سے متعلق ہیں، اس (قرآن) نے کوئی نہیں کیا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۸)

فریق اول کا موقف یہ ہے کہ عورت کی عدالتی شہادت کا یہی مقام و مرتبہ اور یہی حیثیت اور پوزیشن قرآن و سنت تعامل صحابہ فقہائے ملت اور علماء امت کے نزدیک مسلّم ہے عورت پر ہر معاملے میں نہیں بلکہ بعض معاملات میں ادائیگی وشہادت کا بار ڈالا گیا ہے اپنے اس موقف پر وہ فقہاء و علماء کے فتاویٰ کو تائید و حمایت میں پیش کرتے ہیں۔

فریق ثانی کا یہ دعویٰ ہے کہ عورت کو از روئے قرآن ہر معاملے میں شہادت کا حق حاصل ہے اسے بعض معاملات میں حقِ شہادت سے محروم کرنا عورت کی حق تلفی اور اس کی تذلیل و تحقیر ہے۔ رہے امت مسلمہ کے جید علماء و فقہاء کی آراء و فتاویٰ تو ان کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ

"یہ قوانین ہمارے دور ملوکیت میں اس زمانے میں وضع ہوئے تھے جب عورتیں مویشیوں کی طرح منڈی میں نیلام ہوا کرتی تھیں۔"

(طلوع اسلام مارچ ۱۹۸۳ء)

ایک اور مقام پر جناب پرویز صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"ہمارے قوانینِ شریعت "مردوں" کے بنائے ہوئے ہیں اس لئے ان میں مردوں کو ہر حال میں بالادست رکھا گیا ہے اور عورت بیچاری کو کچل دیا گیا ہے۔" (طاہرہ کے نام ص ۲۱)

"چونکہ یہ قوانین اس ماحول میں بنے تھے جس میں عدل کی بجائے استبداد کا دور دورہ تھا اور عورت کو بنگاہِ نفرت دیکھا جاتا تھا اس لئے ان قوانین و تصورات کی رو سے عورت کی حیثیت مغلوب و محکوم اور حقیر و ذلیل سی قرار پاگئی، یہ قوانین ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار ہیں۔" (طاہرہ کے نام ص ۲۲)

"ان قوانین میں احترامِ آدمیت کے آثار ونقوش ڈھونڈنا اور عورت کے صحیح مقام کی تلاش کرنا اپنے آپ کو فریب دینا ہے ان قوانین کی تائید وجواز میں اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ عورت ناقص العقل[1] ہوتی ہے یہ آدم کی پسلی[2] سے پیدا ہوئی ہے اس لئے پسلی کی ہڈی کی طرح ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی، جس قوم کے امور زندگی میں عورت کی رائے کو دخل ہوگا وہ قوم تباہ ہو جائے گی[3]" (طاہرہ کے نام ص۲۵)

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ فریق ثانی کے نزدیک یہ جملہ قوانین ـــــ جن میں شہادت نسواں کا یہ زیر بحث قانون بھی شامل ہے ـــــ دورِ ظلم واستبداد میں، مردوں کے ہاتھوں وضع ہوئے تھے احادیث تو پرویز صاحب کے نزدیک ناقابل استدلال ہیں کیونکہ بقول اُن کے "وضعی روایات" کی بہت بڑی تعداد ان میں شامل ہے اس لئے صرف قرآن ہی ایک قابل حجت ماخذ قانون رہ جاتا ہے اس لئے مسائل کی چھان پھٹک میں ان کے نزدیک وہی معیار قرار پا سکتا ہے لیکن اول الذکر گروہ کے نزدیک قابلِ حجت صرف قرآن ہی نہیں، بلکہ سُنتِ نبویؐ بھی قابلِ احتجاج ہے ماخذ قانون کے بارے میں دونوں گروہوں کے اس اختلاف نے یہ فرق پیدا کر دیا ہے کہ ہر مسئلے کو طے کرنے کے لئے ہر گروہ کا متغائر نقطۂ آغاز علیحدہ زاویۂ نگاہ اور جداگانہ رخِ عمل مقرر ہو گئے

---

[1] بخاری، کتاب الحائض، باب ترک الحائض الصوم ـــــ حدیث باعتبار روایت صحیح ہے باعتبار درایت وحقائق اس کی کیا پوزیشن ہے؟ اس کے لئے قدرے انتظار فرمائیے۔

[2] "آدم کی پسلی سے عورت کی پیدائش" کی کوئی حدیث سرے سے موجود ہی نہیں ہے پرویز صاحب نے بہر حال حوالہ نہیں دیا البتہ "مطلق پسلی" سے تخلیق عورت کا ذکر احادیث میں موجود ہے اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ اس کی طبیعت میں کجی یا خامی یا کوئی نقص ہے۔ وہ کیا ہے؟ تفصیلی بحث آگے آ رہی ہے۔

[3] یہ بھی بخاری کی حدیث ہے۔ پرویز صاحب کا ترجمہ یا ترجمانی قطعی طور پر غلط ہے" امور زندگی میں رائے کا دخل تو ایک ایسا حق ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں ہر مرد وزن کو حاصل ہے بشرطیکہ یہ رائے خود اسلام کے منافی نہ ہو حدیث کا صحیح مفہوم بلکہ ترجمہ یہ ہے کہ ـــــ " وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جو اپنے امر سلطنت کو عورت کے سپرد کر ڈالے یعنی اسے سربراہِ مملکت بنا دے۔ تفصیلی بحث آگے آ رہی ہے۔

ہیں لیکن یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ نقطۂ آغاز، زاویۂ نگاہ اور رخِ عمل کے اس اختلاف کے باوجود ایک مسئلہ ایسا بھی ہے جس پر دونوں گروہ قطعی متفق اور متحد ہیں اور وہ ہے معاشرتی اور تمدنی زندگی میں عورت کے دائرۂ کار کا مسئلہ ـــــ دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کا دائرۂ کار بہرحال، گھر کی چار دیواری ہے۔ اسلام نے درونِ خانہ کی جملہ ذمہ داریاں مثلاً افزائشِ نسل، پرورشِ اولاد، تربیتِ ذریت ان کی نگرانی و پرداخت، امورِ خانہ داری اور گھریلو واجبات کی ادائیگی وغیرہ عورت کے فرائض میں شامل کی ہیں اور بیرونِ خانہ کی ذمہ داریاں مثلاً روزی کمانے کی دوڑ دھوپ اہلِ خانہ کے لئے نان ونفقہ کی ادائیگی اور رہائش کے لئے سکنی کا بندوبست وغیرہ سب کچھ مرد کے ذمے ہے، دونوں گروہوں کے زعماء و علماء، تمدنی زندگی میں مرد و زن کی اس تقسیم کار پر متفق ہیں۔ جیسا کہ ان کی درج ذیل آراء سے ظاہر ہے۔

> "تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں، کیونکہ انہیں (یعنی عورتوں کو) بچوں کی نگہداشت، پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور وہ اکتسابِ رزق کے جھمیلوں کے لئے وقت نہیں نکال سکتیں۔ لہٰذا قرآن کریم نے عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کا بار مردوں کے کاندھوں پر ڈالا ہے۔"
>
> (فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۸)

> "بعض خصوصیات کے لحاظ سے مردوں میں عورتوں سے زیادہ فضیلت ہوتی ہے جیسا کہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے عورتوں میں مردوں سے زیادہ فضیلت ہوتی ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ فطری طور پر مردوں اور عورتوں کے دائرہ ہائے کار الگ الگ ہیں، عورتوں کا کام گھریلو زندگی کی دیکھ بھال، خانگی انتظام و انصرام، اولاد کی پرورش اور تربیت وغیرہ ہے اور مردوں کا کام باہر کی دنیا میں اکتسابِ رزق کے لئے جدوجہد اور پر مشقت کاموں کی انجام دہی ہے اور ہر صنف اپنے دائرۂ کار میں

دوسری صنف سے برتر ہے" (فقہ القرآن ج ۳ ص۶۹)

"بعض بنیادی خصوصیات کے اشتراک کے باوصف مردوں اور عورتوں کے فطری وظائفِ زندگی میں ایسا فرق ہے جس کا ملحوظ رکھا جانا نہایت ضروری ہے فطری تقسیم کار کی رُو سے عورت کے ذمہ اولاد کی پیدائش (حمل) پرورش اور ابتدائی تربیت ہے ان فرائض کی انجام دہی میں اس کا اتنا وقت اور توانائی صرف ہو جاتی ہے کہ وہ حصولِ معاش کے قابل نہیں رہ سکتی اس کے برعکس مردوں کے راستے میں کوئی ایسے موانعات نہیں اس لئے قرآن نے اس فطری تعلیم کی رو سے کہہ دیا کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (۳۴) ان خصوصیات کی بناء پر جن کی وجہ سے ایک جنس ( ) کو دوسری جنس پر فوقیت حاصل ہے یعنی مردوں کو عورتوں پر اور عورتوں کو مردوں پر) مردوں کے ذمے اکتسابِ رزق ہے، عورتوں کے ذمے نہیں ۔عورتوں کی یہ ضروریات مرد پوری کریں گے اس دولت کے ذریعے جسے وہ کما کر لائیں گے، اس دولت کو گھر کی تمام ضروریات کے لیئے کھلا رکھا جائے گا۔ یہ نہیں کہ چونکہ مرد اسے کما کر لایا ہے اس لئے وہی اس کا مالک ہے وہ بیوی کو اس سے بطور خیرات کچھ دے گا۔ یہاں تقسیم عمل ہے کچھ کام مرد کر رہا ہے کچھ عورت کر رہی ہے جب عورت کی یہ ضروریات اس طرح پوری ہوں گی تو اس کی فطری صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکے گی ۔ اور وہ ان صلاحیتوں کو قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کر سکے گی" (طاہرہ کے نام ص۲۷۸)

اب ظاہر ہے کہ جب اسلام کا عمومی مزاج یہ ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں دونوں کے علیحدہ علیحدہ دائرہ ہائے کار کا تعین کر دیتا ہے، امورِ بیرونِ خانہ کی سرانجام دہی مرد کے ذمہ قرار دیتا ہے اور گھریلو معاملات کی سرانجام دہی عورت کا فریضہ قرار پاتا ہے

تو تمدن کا مفاد اسی میں ہے کہ ہر صنفِ بشر اپنے اپنے میدانِ عمل میں اپنی ذمے داریوں کو پورا کرے یہ ایک فطری تقسیم کار ہے جس کی خلاف ورزی، خود فطرت کے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور فطرت کبھی اپنے مدمقابل سے شکست نہیں کھایا کرتی، اس نظامِ کائنات میں خلافِ فطرت کسی عمل کے پنپ جانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مرد و زن میں فطری تقسیم کار کا یہ تقاضا ہے کہ ہم قرآنی آیات کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے ایسی تعبیر اختیار کریں جو اول تو کسی ایک صنف کو دوسری صنف کے دائرۂ عمل میں دخیل نہ بننے دے۔ ثانیاً اگر کسی ایک کا دوسرے کے دائرۂ کار میں در آنا ناگزیر ہو تو اس مداخلت کو کم از کم اور ناگزیر حد تک محدود رکھا جائے۔

آیت ۲/۲۸۲ کی وضاحت

آیئے اب اسی اصول کی روشنی میں، شہادت نسواں سے متعلقہ آیت ۲/۲۸۲ کا مطالعہ کریں۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (۲/۲۸۲)

(معاشی لین دین میں) اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لو اگر دو آدمی نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو اپنے پسندیدہ گواہوں میں سے لو تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

اس آیت میں چند باتیں بالکل واضح ہیں۔

اولاً ـــــ یہ کہ قرآن نے مردوں میں سے دو گواہوں کا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ عدالتوں میں گواہی کا فریضہ ادا کرنا امورِ حیات کی فطری تقسیم کے مطابق مرد ہی کے ذمے ہے اور ویسے بھی لین دین کا یہ مالی مسئلہ مردوں ہی کے شعبۂ تصرف کا معاملہ ہے اس لئے مردوں کا اس شعبے میں گواہ قرار پانا ایک فطری امر ہے۔

ثانیاً ـــــ یہ کہ قرآن کے الفاظ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ (اگر دو مرد

نہ ہوں تو ......) یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کتاب اللہ کے نزدیک اول و آخر مطلوب گواہ صرف مرد ہی ہیں، لیکن اگر وہ میسر نہ آسکیں فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ ...... (تو ایک مرد اور دو عورتیں ......) آخری چارہ کار کے طور پر گواہ بنا لئے جائیں۔ قرآن کا یہ انداز صاف طور پر واضح کرتا ہے کہ "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت "دو مردوں" کی عدم موجودگی ہی میں اختیار کی جا سکتی ہے، شہادت کا پہلا نصاب (یعنی دو مرد) اور دوسرا نصاب (یعنی ایک مرد اور دو عورتیں) ایک دوسرے کا دو طرفہ قائم مقام نہیں بن سکتے کہ جب چاہا کسی ایک نصاب کی جگہ دوسرے کو اختیار کر لیا یہ تو قطعاً ممکن نہیں کہ پہلے نصاب کو دوسرے نصاب کا قائم مقام قرار دیا جائے البتہ یہ ممکن ہے کہ پہلے نصاب کی عدم موجودگی میں دوسرا نصاب اس کا متبادل قرار پائے پہلا نصاب دوسرے نصاب کا بدل نہیں ہوسکتا لیکن دوسرا نصاب پہلے نصاب کا بدل ہوسکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح وضو، تیمم کا متبادل نہیں ہوسکتا البتہ تیمم بصورت عدم موجودگی آب (فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً) وضو کا متبادل اور قائم مقام بن سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مجبوری حالات کا نتیجہ ہے۔

ثالثاً ـــــــ یہ کہ پہلے نصاب کی جگہ دوسرا نصابِ شہادت بیان کرتے ہوئے قرآن یہ نہیں کہتا ہے کہ فان لم یکونا رجلین فامرأتان (اگر دو مرد نہ ہوں تو دو عورتیں گواہ بنالی جائیں) اگر قرآن ایسا کہہ دیتا تو مرد و زن کی یکساں شہادت بالکل واضح ہوجاتی کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہتا مرد اور عورت کی شہادت کا مساوی مقام و مرتبہ قرار پاجاتا مگر اس احکم الحاکمین اور خالقِ عقل و حکمت نے فرمایا تو یہ فرمایا کہ ــــــ "اگر دو مرد نہ ہوں تو اپنے پسندیدہ افراد میں سے ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ قرار دے لو" ـــــ اب ظاہر ہے کہ زبان سے بے شک یہ نہ کہا جائے کہ ــــــ "دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے" ــــــ لیکن قرآنی اندازِ بیان یہی حقیقت پیش کرتا ہے۔

رابعاً ـــــــ یہ کہ اس معاشی مسئلے میں جو سراسر مرد کے دائرۂ عمل سے متعلق ہے قرآن نے یہ قطعاً گوارا نہیں کیا کہ پہلے یا دوسرے نصاب کے طور پر تنہا عورتوں کو گواہ

بنا لیا جائے۔ اللہ چاہتا تو یوں بھی فرما سکتا تھا واستشھدوا شاھدتین من نساء کم (یعنی اپنے لین دین کے معاملے میں اپنے میں سے دو عورتوں کو گواہ بنا لو) اور نہ ہی قرآن نے دوسرے نصاب کے طور پہ مردوں کی جگہ نری عورتوں ہی کو بطور گواہ پسند کیا۔ بلکہ یہ حکم دیا کہ ـــــ "ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لو" ـــــ یہ طرز بیان واضح کرتا ہے کہ مردوں کے دائرۂ کار میں تنہا عورتوں کی گواہی کو مقرر کرنا اسلامی معاشرت میں قطعی ناپسندیدہ امر ہے اگر یہ جائز اور پسندیدہ ہوتا تو قرآن کا انداز بیان یہ نہ ہوتا۔

خاصتاً ـــــ یہ کہ عورتوں کی شہادت کے ضمن میں قرآن کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں ـــــ "اگر دو مرد نہ ہوں تو اپنے پسندیدہ گواہوں میں سے ایک مرد اور دو عورتوں کو لے لیا جائے تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے" ـــــ ان الفاظ سے یہ واضح ہے کہ قرآن ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو گواہ قرار دیتا ہے۔ جناب پرویز صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

> "قرآن کریم نے دو عورتوں کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا کہ ان دونوں کی شہادت یکے بعد دیگرے لی جائے تاکہ وہ دو شہادات مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ کہا یہ ہے کہ ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاُخریٰ (۲۸۲/۲) ـــ "اگر ایسا ہو کہ ان میں سے گواہی دینے والی کو گھبراہٹ کی وجہ سے کہیں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی اس کی دوسری بہن اسے یاد دلا دے" ـــــ اس سے ظاہر ہے کہ اگر شہادت دینے والی عورت کو گھبراہٹ لاحق نہ ہو تو دوسری عورت کو دخل اندازی کا موقع ہی نہیں آئے گا۔ اور اس اکیلی کی شہادت کافی قرار پائے گی۔" (طاہرہ کے نام صـ۶۷)

یہ ایک بیجا قسم کی سخن سازی ہے قرآن کو آخر یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ دونوں عورتوں کی شہادت کو یکے بعد دیگرے لیا جائے تاکہ یہ دونوں شہادتیں مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں جبکہ وہ واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ایک مرد

کی جگہ دو عورتوں کو گواہ قرار دیتا ہے ہم نہیں سمجھتے کہ دو مردوں کی جگہ "فرجل وامرأتان" کو طے کر دینے کے بعد قرآن کو ایسی فرضی جزئیات کو بیان کرنے کی کوئی حاجت باقی رہ جاتی ہے یہ بڑی عجیب بات ہے کہ محترم پرویز صاحب "اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو اپنے پسندیدہ افراد میں سے گواہ بنا لو" کے واضح دو ٹوک اور قطعی الفاظ کے مفہوم و منطوق کو تو تسلیم نہیں کرتے اور محض اس مفروضے پر کہ ـــ "دو عورتوں کی شہادت کو یکے بعد دیگرے لینے کا ذکر نہیں ہے" ـــ قرآن سے مفہوم معکوس برآمد کر رہے ہیں۔ ان ھٰذا الشیٔ عجاب۔

اگر بالفرض پہلی عورت کو گھبراہٹ نہ بھی لاحق ہو اور دوسری عورت کو مداخلت کا موقع نہ بھی ملے تو بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک مرد کے مساوی ایک عورت کی گواہی طے ہو چکی ہے دو عورتوں کو ایک مرد کی جگہ بطور گواہ طے کر دینے کے بعد اگر دو عورتیں عدالت میں حاضر ہو جاتی ہیں اور ایک عورت بیان دیتی ہے اور دوسری سکوت اختیار کئے رہتی ہے تو دوسری کا یہ سکوت، پہلی عورت کے بیان کے ساتھ رضامندی کی دلیل ہوگا ایک کے شہادتی بیان اور دوسری عورت کے سکوت کے نتیجہ میں جو شہادت ادا ہوگی وہ دونوں کی طرف سے ہی ہوگی اسے صرف ایک عورت کی طرف سے شہادت قرار دینا ایک سعی لاحاصل ہے۔

دراصل محترم پرویز صاحب نے پہلے سے یہ طے کر رکھا ہے کہ قرآن سے بہرحال مرد و زن کی شہادت میں مساوات کو ثابت کر کے رہنا ہے اس کوشش میں اگر ان کے سامنے پہاڑ کی سی وزنی دلیل بھی آجائے تو وہ اسے تاویل و تحریف کے ڈائنا مائیٹ سے اڑا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں لیکن اپنے خود ساختہ مفروضوں کی بنیاد پر رائی کے برابر بھی کوئی "دلیل" گھڑی جا سکے تو اسے پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کیا محترم پرویز صاحب اور مولانا عثمانی صاحب آیت زیر بحث کے ان دو پہلوؤں پر غور فرمائیں گے؟

(الف) "اگر ایک عورت الجھ جائے (یا بھول جائے) تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے" اس آیت میں "تذکیر" کا فریضہ دوسری عورت ہی پر کیوں عائد کیا گیا ہے جبکہ

وہ خود بھی مقدمے کی جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتی ؟ ان دونوں عورتوں کے ساتھ ایک مرد بھی تو موجود ہے "تذکیر" کا فرض اسے کیوں نہیں سونپا گیا؟ اگر شہادت میں مرد اور عورت میں مساوات ہوتی تو قرآن دو مرد گواہوں کی عدم موجودگی میں ایک مرد اور ایک عورت کو بھی متبادل نصاب شہادت کی صورت میں پیش کر سکتا تھا اس طرح ایک عورت کے ساتھ آنے والا مرد "تذکیر" کا یہ فریضہ بھی سرانجام دے سکتا تھا لیکن قرآن نے ایک مرد گواہ کے ساتھ ایک کی بجائے دو عورتوں کو گواہ قرار دیا اور پھر "تذکیر" کا فریضہ بھی انہی دو عورتوں میں سے ایک پر عائد کیا اور وہ بھی ایک مرد گواہ کی موجودگی میں! آخر یہ کیوں؟

اگر قلب و دماغ میں پہلے سے کوئی نظریہ انسان راسخ نہ کر بیٹھا ہو تو تنہا یہی چیز اس بات کے لئے کافی دلیل ہے کہ دو عورتوں کی شہادت کو (خواہ وہ ان میں سے ایک عورت کی شہادت اور دوسری کے سکوت پر مبنی ہو یا ایک کی طرف سے شہادت میں الجھن یا نسیان اور دوسری کی طرف سے "تذکیر" پر مبنی ہو) ایک مرد کی شہادت کے برابر تسلیم کر لیا جائے۔

(ب) "ان تضل احداھما فتذکر احداھما الاخریٰ" محترم پرویز صاحب ان الفاظ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں ــــ "اگر ایسا ہو کہ ان میں سے گواہی دینے والی کو گھبراہٹ کی وجہ سے کہیں الجھاؤ پیدا ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی اس کی دوسری بہن اسے یاد دلا دے" ــــ یہ بامحاورہ ترجمہ ہے جس میں آیت کا مفہوم کما حقہٗ ادا نہیں ہو پایا۔ اگر محض یہ کہنا مقصود ہوتا کہ ــــ "اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے" ــــ تو آیت کے الفاظ یوں ہوتے "ان تضل احداھما فتذکر الاخریٰ" اس صورت میں لفظ "احداھما" کے تکرار کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ "احداھما" کا یہ تکرار و اعادہ کیوں ہے؟ ترجمہ میں اس تکرار کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔ ہم یہ خوب سمجھتے ہیں کہ سلیس اور بامحاورہ ترجمہ میں ایسی لفظی پابندیوں کا خیال نہیں رکھا جاتا لیکن الفاظِ قرآن پر غور کرتے ہوئے

ایسی تکرارِ الفاظ سے سرسری طور پر گذرا بھی نہیں جا سکتا۔ بہرحال قرآن میں الفاظ کی یہ تکرار بے معنیٰ نہیں ہے ترجمہ کرتے ہوئے اس تکرار کو پیش نظر رکھا جائے تو الفاظ کی ترتیب کچھ اس طرح ہوگی ـــــ "اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دونوں میں سے کوئی ایک اسے یاد دلا دے" ـــــ اگر دورانِ شہادت ایک عورت الجھ سکتی ہے تو دورانِ تذکیر دوسری عورت بھی تو الجھ سکتی ہے کیونکہ بقولِ قرآن عورت جب تک عورت ہے وہ باہمی خصومات میں دلائل کی فراہمی میں (اور بقول جناب پرویز صاحب اور ڈاکٹر ہارڈنگ جزئیات کو صحت کے ساتھ ادا کرنے میں) غیر واضح اور مبہم رہ جاتی ہے (یہ بحث آگے آرہی ہے) اس لئے اگر پہلی عورت کی شہادت کے دوران پیدا ہونے والی الجھن کو دوسری عورت "تذکیر" کے ذریعہ صاف کرتی ہے تو دوسری عورت کو "تذکیر" کے دوران کوئی اور الجھن لاحق ہو جاتی ہے تو اسے ظاہر ہے کہ پہلی عورت ہی زائل کرے گی اس طرح تذکیر و تبیین کی چھلنی سے چھن کر دونوں کی شہادت واضح سے واضح تر اور بین سے بین تر بنتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح ان "دونوں میں سے ہر ایک" ادائے شہادت کا فریضہ سرانجام دے گی اور نسیان یا الجھن کی صورت میں "دونوں میں سے ہر ایک" تذکیر کا فریضہ ادا کرے گی کیا یہ صورتحال دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر قرار نہیں دیتی؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر قلب و ذہن پر خارجی نظریات مستولی نہ ہوں تو سیدھی بات تیر کی طرح ذہن میں بیٹھ جاتی ہے اور کوئی الجھن باقی نہیں رہتی لیکن کیا کیا جائے ؎

تیری ہر ادا میں بل ہے تیری ہر نگاہ میں الجھن
میری آرزو میں لیکن کوئی پیچ ہے نہ خم ہے!

سادساً ـــــ یہ کہ قرآن نے پہلے نصاب شہادت کی جگہ متبادل نصابِ شہادت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو بطور گواہ شامل کرنے کا حکم دیا اور فرمایا "ان تضل احداھما فتذکر احداھما الاخریٰ" "اگر کوئی عورت بھول جائے تو دوسری عورت یاد دلا دے"۔ اس قطعۂ آیت کا ترجمہ مولانا عمر احمد عثمانی صاحب نے

یہ لکھا ہے کہ ـــــ "اگر ایک الجھن میں پڑ جائے تو دوسری اسے یاد دلا دیئے"۔ (فقہ القرآن ج ۲ ص ۹۳)
جناب پرویز صاحب اسی قطعہ آیت کے ترجمہ میں ایک تشریحی نوٹ میں رقمطراز ہیں۔

"عام طور پر اس آیت کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے لیکن قرآن نے "تضل" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی نسیان (بھول جانے) سے مختلف ہیں اس کے بنیادی معنی ہیں "بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا ذہن میں الجھاؤ سا پیدا ہو جانا"۔ (طاہرہ کے نام ص ۱۱۶)

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ "تضل" کا معنی "الجھن میں پڑ جانا" ہے یا "بھول جانا" آپ جو بھی ترجمہ کریں اس آیت سے بہر حال دو باتیں بالکل واضح ہیں۔

۱ ـــــ عورت کے ذہن، دماغ یا عقل میں کوئی ایسی کمزوری (نقص) ضرور ہے جس کی بنا پر اس کے ذہن میں الجھاؤ پیدا ہو جانا **عورت کی ذہنی منقصت** ہے گفتگو کرتے ہوئے بات غیر واضح اور مبہم سی رہ جاتی ہے یا اسے نسیان لاحق ہو جاتا ہے یہاں تک کہ عدالت کے کٹہرے میں اس کی تلافی کے لئے "تذکیر" یا یاد دہانی کے پیشِ نظر ایک اور عورت کو اس کے ساتھ گواہ بنایا جا رہا ہے تاکہ "ان تضل احدٰھما فتذکر احدٰھما الاخریٰ" (اگر ایک بھول یا الجھ جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے)۔

۲ ـــــ عورت کے ذہن کی یہ منقصت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک خاص ماحول کی پیدا کردہ ہو کہ اگر اسے بدل کر کوئی دوسرا ماحول طاری کر دیا جائے تو یہ خامی یا نقص معدوم ہو جائے، بلکہ یہ عورت کی فطرت، ساخت اور نفسیات میں داخل ہے اگر یہ محض ایک عارضی خامی ہوتی تو قرآن، جو قیامت تک کے لئے صحیفۂ قانون اور کتاب آئین کی حیثیت رکھتا ہے اسے یہ اہمیت نہ دیتا کہ رہتی دنیا تک اسے اپنے دامن میں محفوظ کر لیتا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کمزوری اور منقصت کیا ہے؟ موجودہ ترقی یافتہ دور میں جہاں عورتیں مغربی تہذیب میں ترقی کی راہ پر مردوں کے شانہ بشانہ چل رہی ہیں

آیا کسی محقق نے ٹھوس علم کی بناء پر عورت کی کسی ایسی کمزوری کا ذکر کیا ہے؟ جواب یہ ہے!

"جی ہاں! ایک نہیں بلکہ مغرب کے کئی علماء نے تحقیق و تفتیش کے بعد کھلے لفظوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔"

اس موضوع پر موجودہ سائنس کی تحقیقات ملاحظہ فرمائیے۔ ایک مغربی محقق

**علمائے مغرب کی تحقیقی شہادات** (BAUER) کی یہ تحقیق ہے۔

"WE ARE AGAIN AND AGAIN FORCED TO ADMIT THAT A WOMAN IS NOT IN A POSITION TO JUDGE OBJECTIVELY, WITHOUT BEING INFLUENCED BY HER EMOTIONS."

"ہم اپنے آپ کو بار بار مجبور پاتے ہیں کہ اس حقیقت کا اعتراف کریں کہ عورت کبھی اس پوزیشن میں نہیں ہوتی کہ وہ جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر کسی معاملے میں واقعیت پسندانہ فیصلہ کر سکے۔"

مغرب کی یہ تحقیق عورت کی منصفانہ صلاحیتوں کو واضح کر دیتی ہے فیصلہ کرتے ہوئے اس کا جذبات سے متأثر (بلکہ مغلوب) ہو جانا اور واقعیت پسندانہ فیصلہ نہ کر پانا اس کی ایک ایسی فطری کمزوری ہے جس کی بناء پر اسے عدالت کا جج بنانا دورِ حاضر کی علمی تحقیقات کے بھی خلاف ہے علاوہ ازیں عورت کی اس کمزوری کو اگر ان دوسری کمزوریوں کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے، جو ماہواری، حمل اور رضاعت کے سلسلے میں اُس پر عارض ہوتی ہیں تو اس کی فطری کمزوری کی شدّت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ماہواری، حمل اور رضاعت کے دوران، عورت صحت اور تندرستی کی نسبت، بیماری اور علالت سے قریب تر ہوتی ہے اس عرصے میں اس کے ذہن، مزاج عادات، قوتِ کارکردگی اور طبیعت پر جو منفی اثرات پڑتے ہیں وہ علم طب کی کسی بھی کتاب کے مطالعے سے بآسانی معلوم ہو سکتے ہیں یہ اس مسئلے کا علمی اور تحقیقی پہلو ہے۔

دوسری طرف، ہم دیکھتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی روشنی میں جو معاشرہ تعمیر فرمایا تھا اس میں پورے جزیرۂ عرب میں پھیلی ہوئی وسیع سلطنت میں کسی مقام پر بھی عورت کو عہدۂ قضاء عطا نہیں کیا گیا، خلفائے راشدین کے عہدِ مبارک میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اب کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ خدا، رسول اور خلفائے راشدین سب غاصب تھے (معاذ اللہ) جنہوں نے عورت کے اس حق کو سلب کئے رکھا—؟ ایک مسلمان کے لئے نمونے کے اعتبار سے مثالی ریاست (IDEAL STATE) وہ تھی جسے حضورؐ نے قائم فرمایا تھا یا وہ مغربی ریاستیں، جن کی عملی روایات ان کی اپنی علمی تحقیقات کے خلاف ہیں—؟ ہر شخص خود سوچ لے۔

مغرب کا ایک ممتاز سکالر (SCHOPENHAUER) "شوپنہار" کہتا ہے۔

IN A COURT OF JUSTICE, WOMAN ARE MORE OFTEN FOUND GUILTY OF PERJURY THAN MEN. IT IS INDEED TO BE GENERALLY QUESTIONED WHETHER THEY SHOULD BE ALLOWED TO TAKE AN OATH AT ALL

"انصاف کی عدالتوں میں عورتیں، مردوں کی نسبت اکثر اوقات جھوٹی قسمیں کھانے کی مجرم پائی گئی ہیں یہاں تک کہ اب (ان کے متعلق کچھ اور سوال کرنے کی نسبت) یہ استفسار کرنا چاہیئے کہ عدالتوں میں آیا ان سے حلف لینا بھی چاہیئے؟

ایک اور جدید محقق ہیولاک ایلس (HAVELOCK ELLIS)۔ اپنی کتاب (MAN & WOMAN) میں لکھتا ہے کہ

IN WOMAN, DECEPTION IS ALMOST PHYSIOLOGICAL .... THE SAME FACT IS MORE COARSELY AND UNGRACIOUSLY STATED IN THE PROVERBS OF MANY NATIONS, AND IN SOME COUNTRIES, IT HAS LED TO THE LEGAL TESTIMONY OF WOMEN BEING PLACED ON A LOWER FOOTING THAN THAT OF MEN.

P: 196

"عورت میں چکمہ دینے کی عادت، ایک طبیعیاتی حقیقت ہے جسے ناملائم الفاظ اور بے رحمانہ انداز میں تقریباً ہر قوم کی ضرب المثل میں بیان کیا جاتا ہے اور بعض ممالک میں تو عورت کی شہادت کو قانونی طور پر، مرد کی شہادت سے کمتر درجے پر رکھا جاتا ہے۔"

دورِ حاضر کے دو محقق علماء لمبروسو (LOMBROOSO) اور فیرورو (FERRERO) کی رائے، ایک تیسرے عالم لیوڈووِسی (LUDOVICI) نے اپنی کتاب (WOMAN) میں اس طرح پیش کی ہے۔

LOMBROOSO AND FERRERO ACTUALLY REGARD DECEPTION AS BEING "PHYSIOLOGICAL" IN WOMAN ... THE EVIDENCE OF PROFOUND PSYCHOLOGISTS, THE SUBSTANCE OF MYTHS, THE CONTENTS OF NATIONAL PROVERBS, THE PERSONAL EXPERIENCE, IN SHORT, OF ALL THOSE, WHO HAVE LEARNT TO KNOW WOMAN GENERATION AFTER GENERATION, ALL POINT TO THIS CONCLUSION, THAT THERE IS A CERTAIN DUPLICITY AND UNSCRUPULOUSNESS IN THEIR NATURE.
WOMAN: P: 281

"لمبروسو اور فیرورو، حیلہ گری کو عورت کی ایک طبیعاتی (حقیقت) قرار دیتے ہیں ----- علم نفسیات کے معتبر علماء کی شہادتیں، کہاوتی مواد، قومی ضرب المثلوں کے مندرجات، ذاتی تجربات ــــ قصہ مختصر ــــ اور ہر وہ گروہِ افراد جو عورت کو نسل در نسل سمجھنے اور پرکھنے میں مصروف رہے ان میں سے ہر شخص اور ہر چیز نے یہ اشارہ کیا ہے کہ عورت کی فطرت میں دورُخا پن اور بے احتیاطی پائی جاتی ہیں۔"

اسی کتاب کے ایک اور مقام پر یہ اقتباس بھی موجود ہے۔

THE FACT, THAT WOMEN ARE DIFFICULT TO DEAL WITH UNDER CROSS-EXAMINATION, IS WELL KNOWN AMONG LAWYERS AND THEIR SKILL IN DRAWING RED-HERRING ACROSS THE PATH OF ANY ENQUIRY, DIRECTED AGAINST THEMSELVES, MAKE THEM STUBBORN AND EVASIVE WITNESSES AT ALL TIMES, WHEN THEY HAVE ANYTHING TO CONCEAL.

"وکلاء اس حقیقت سے واقف ہیں ــــ کہ خواتین سے عدالتی جرح کے مرحلے میں عہدہ برآ ہونا مشکل کام ہے۔ اپنے خلاف ہونے والی

عدالتی تحقیقات میں خلط مبحث میں الجھا دینے میں ان کی پرکاری انہیں ہمیشہ ضدی اور پرپیچ گواہ بنا دیتی ہے بالخصوص جبکہ وہ کچھ چھپانا چاہتی ہوں۔" WOMAN P: 320

اس سلسلے میں ایک مغربی مفکر کی کتاب (PSYCHOLOGY OF SUGGESTION) کے صفحہ ۲۶۳ کا مطالعہ کچھ نئی تحقیقات کے اور نتائج ظاہر کرتا ہے۔

یہ آراء مشرق کے کسی "جاہل" شخص کی نہیں ہیں بلکہ مغرب کے جدید علماء و محققین کی آراء ہیں۔ ماضی کے "تاریک دور" کے نہیں بلکہ حال کے "روشن دور" کے انکشافات ہیں یہ کسی گزرے ہوئے "دور ظلم و استبداد" کے نظریات نہیں ہیں جن میں مرد، عورت پر بالاتر تھا بلکہ اس "دور عدل و انصاف" کی تحقیقات ہیں جس میں عورت اور مرد مساوی المرتبہ ہیں۔

یہ اُن علماء و محققین کی تازہ ترین تحقیقات ہیں جن کی ذہنی غلامی سے ہمارے پیروئ اسلاف یا تقلید مغرب قلوب و اذہان سیاسی آزادی پا لینے کے باوجود بھی آزاد نہیں ہوئے ؎

وطن تو آزاد ہو چکا ہے دماغ و دل ہے غلام اب بھی !
پئے ہوئے ہیں شراب غفلت یہاں خواص و عوام اب بھی

اگر علم قدیم سے وابستہ افراد، اسلاف صالحین کی پیروی کرتے ہیں تو ہمارا مغرب زدہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ انہیں "اندھے مقلد" اور "لکیر کا فقیر" گردانتا ہے حالانکہ ان حضرات کا اپنا حال یہ ہے کہ مغرب کے اصول اور قوانین کی اندھی پیروی اور کورانہ تقلید میں یہ لوگ ان سے بھی چار قدم آگے ہیں مغرب سے آواز آتی ہے "قربانی ایک وحشی رسم ہے" یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ـــــ "ہمارے دین میں تو "قربانی" ہے ہی نہیں۔ یہ تو "ملاں" کی ایجاد ہے" ـــــ وہاں سے پردے کی مخالفت میں آواز اٹھتی ہے تو یہ برخورداران سعادتمند ارشاد فرماتے ہیں ـــــ "اجی ! یہ پردہ کہاں کا ؟ یہ تو "مولویوں" کی ایجاد ہے ہمارے ہاں تو صرف شرم و حیا کی تعلیم ہے" ـــــ ادھر سے "قید خانہ" سے رہائی حاصل کرنے کے لئے اشارہ ہوتا ہے تو یہاں کی کچھ "لیڈیاں" خواتین پر ترس کھاتی ہوئی "آزادی

نسواں" تحریک چلانے پر "مجبور" ہو جاتی ہیں۔ ادھر سے ڈارونینی ارتقاء کی آواز سنائی دیتی ہے تو یہاں کے متجددین اسے "قرآنی دریافت" ثابت کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ وہاں سے لینن اور کارل مارکس، سوشلزم اور کمیونزم کی ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھتے ہیں تو یہاں کے "مفکرین" اس لادینی نظام معیشت کو قرآن سے کشید کرنے کی "سعادت حاصل کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ تاکہ اسے "مشرف باسلام" کیا جاسکے۔ وہاں عورت جب حیاسوز شبینہ محفلوں کی زینت بنتی ہے تو یہاں پہنچ کر یہ بے حیائی "آرٹ" اور "ثقافت" کا خوش نما لباس پہن لیتی ہے، اس طرح یہ مغربیت زدہ طبقہ وہاں سے آنے والی ہر روایت اور قدر کو ذہنی مرعوبیت کے ساتھ، ہاتھوں ہاتھ قبول کرتا ہے اور یہاں اسے اپنی دینی اور ملی اقدار دریابرد کر دینے کے قابل نظر آتی ہیں۔ ذہنی غلامی اور فکری محکومیت کا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ آج عالم اسلام کا بڑے سے بڑا مسلم اسکالر خواہ کتنی ہی معقول بات کہے تو وہ ان لوگوں کی نگاہ میں چنداں لائقِ التفات نہیں ٹھہرتی اور مغرب کی طرف سے خواہ کتنی ہی لچر بات کہی جائے اسے سائنٹیفک حقیقت کے نام سے ایمان و اعتقاد کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ اسلامی فکر کے مقابلے میں مغربی نظریات کو شرفِ تقدم بخشنے کی اس روش کا اب یہ نتیجہ نکل رہا ہے کہ اگر ایک بات نبیؐ نے بھی فرما دی تو اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا لیکن اگر وہی بات کسی مغربی مفکر نے کہہ ڈالی تو اسے ایک بلند پایہ علمی دریافت کا نام دے ڈالا ؎

دل نہ چاہے تو رسالتؐ کا بھی ارشاد غلط
من کو بھا جائے تو بھانڈوں کی خرافات بجا

۱ ــــــ "عورت کی "عقل" میں ایک "کمی" (نقص) ہے۔"

۲ ــــــ "عورت کسی مسئلہ کی جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ (ACCURATELY) بیان (DEFINE) نہیں کر سکتی۔"

ان دونوں جملوں کو پڑھ کر ایک طفلِ مکتب بھی یہ جان لیتا ہے کہ دونوں جملوں[۱۵] میں ایک ہی بات کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے جملے میں اگر عقل کی کسی "کمی" (نقص) کا ذکر ہے تو

دوسرے جملے میں اس "کمی" (نقص) کی وضاحت اور نشاندہی ہے۔ پہلے جملے میں جس حقیقت کی طرف اجمالی اشارہ ہے دوسرے جملے میں اسی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ پہلا جملہ اگر "اجمال" ہے تو دوسرا جملہ اسی کی "تفصیل" ہے۔ جو شخص اس "تفصیل" (دوسرے جملے) کو مانتا ہے وہ اس تفصیل کے "اجمال" (پہلے جملے) کا انکار کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن ہمارے ہاں کے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے علمبردار پہلے جملے کی جس شدت سے تردید و تکذیب کرتے ہیں دوسرے جملے کی اسی شدت سے تائید و تصدیق فرماتے ہیں۔

ع شعور و فکر کی یہ کافری ! معاذ اللہ

پہلا جملہ زبانِ وحیٔ ترجمان سے نکلا ہے اور روایت و درایت کی شدید ترین کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد امام بخاری کی "جامع صحیح" میں ثبت ہو گیا ہے اس جملے کا انکار کر ڈالا لیکن دوسرے جملے کو (جو ایک مغربی مفکر ڈاکٹر ہارڈنگ کی قلمِ تحقیق سے برآمد ہوا ہے) بلند پایہ تحقیق جدید کا نام دے کر قبول کر لیا۔ ان ھذا الشیٔ عجاب ؂

کسی کی شام بھی رشک سحر ہے سنتے ہیں
ہماری صبح بھی صورت طرازِ شام ہوئی

ملاحظہ فرمائیے! جناب پرویز صاحب کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔

"مردوں اور عورتوں کی اس طبعی ساخت اور نفسیاتی اختلاف کے اثرات و نتائج کیا ہوتے ہیں؟ اس کے متعلق مغرب کے علمائے نفسیات بہت کچھ تحقیق کر رہے ہیں اس ضمن میں ڈاکٹر ہارڈنگ (M. ESTHER HARDING) نے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE WAY OF ALL WOMEN) جہاں تک اس نکتے کا تعلق ہے جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے وہ اس میں لکھتا ہے کہ

"اگر مردوں کو انسان کے باہمی تعلقات (HUMAN RELATIONSHIP) کے مسائل سے متعلق کام پر لگایا جائے تو یہ کام ان کے لئے کبھی خوش آئند نہیں ہوتا لیکن عورتیں ایسے کام بہت پسند کرتی ہیں

عورتوں کے لئے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جہاں ان سے کہا جائے کہ کسی مسئلہ کے جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ (ACCURATELY) بیان (DEFINE) کریں۔

یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق تو شاید ابھی حتمی طور پر کچھ نہ کہا جا سکے لیکن ڈاکٹر ہارڈنگ کا بیان ہے کہ یہ وہ خصوصیت ہے جسے اس نے متعدد عملی مثالوں کے بعد عام طور پر عورتوں میں مشترک پایا ہے۔

اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو آپ دیکھئے کہ قرآن نے اس کی کس قدر رعایت رکھی ہے۔ مقدمات میں ہمیشہ جزئیات پر بحث و تنقید اور جرح و تنقیح ہوتی ہے مقدمہ کی جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ (ACCURATELY) بیان (DEFINE) نہ کر سکنے کی وجہ ہی سے شہادت خراب ہوتی ہے اور شہادت کی توثیق کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے باریک اختلافات کی صحت ہو جائے عورتوں میں ایک تو وہ نفسیاتی کمی ہو گی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان فرائض کی سرانجام دہی میں مصروفیت کے باعث جو عورتوں سے مخصوص ہیں ان کے لئے مردوں کے مقابلے میں معاملات میں حصہ لینے کے مواقع بھی کم ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ متنازعہ فیہ معاملات (مقدمات وغیرہ) میں جہاں بال کی کھال نکالی جائے گی عورت بالعموم جزئیات کی صراحت میں غیر واضح رہ جائے گی۔" (طاہرہ کے نام ص ۶۵)

ملاحظہ فرمائیے! پرویز صاحب نے عورت کی اس کمزوری کو کہ "وہ مقدمات کی جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ (ACCURATELY) بیان (DEFINE) نہیں کر سکتی اور ایسا نہ کر پا سکنے کے باعث ہی شہادت خراب ہوتی ہے" کس خوبصورتی سے مان لیا ہے اور وہ بھی محض اس لئے کہ ڈاکٹر ہارڈنگ نے جو تہذیبِ غالب کا فرزند ہے اسے پیش کیا ہے یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ عورت کی یہ وہ کمزوری ہے جسے اس ماہر نفسیات نے متعدد عملی مثالوں کے بعد عام طور پر عورتوں میں مشترک پایا ہے۔

بہرحال مقدمات کی جزئیات میں عورت کا الجھ جانا اظہار مدعا میں غیر واضح سا رہ جانا، بھول جانا، ذہن کا ماؤف ہوجانا اور فروعات کی صراحت نہ کر پا سکنا یہ سب کچھ عورت کی طبعی ساخت میں داخل ہے اگر اسے عدالت میں شہادت کے لئے طلب کیا جائے تو وہ بحث و تنقید اور جرح و تنقیح کا سامنا نہ کر پائے گی مقدمہ خراب ہو جائے گا اور فیصلہ صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ پائے گا عورت کی ان ذہنی کمزوریوں کا خود پرویز صاحب کو بھی اعتراف ہے جیساکہ ان کے پیش کردہ اقتباس سے ظاہر ہے۔

**ایک قرآنی شہادت** دورِ حاضر کے ان علمی انکشافات کے بعد اب خالقِ ارض و سماوات کا بیان بھی ملاحظہ فرمایئے، سورہ زخرف میں قرآن مشرکینِ عرب کو جو خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کیا کرتے تھے خطاب کرتے ہوئے یوں کہتا ہے کہ تم اس کی مخلوق کو خدا کی وہ "بیٹی" قرار دیتے ہو۔

| | |
|---|---|
| اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ○ (۴۳/۱۸) | جس کی پرورش زیورات میں ہوتی ہے اور جو نزاعی امور میں اپنے اظہار مدعا میں بھی غیر واضح رہتی ہے۔ |

اس آیت میں قرآن نے عورت کے متعلق دو حقیقتوں کو بیان فرمایا ہے۔ اولاً یہ کہ وہ زیورات میں پرورش پاتی ہے یہ اس کے ذوقِ آرائش کی طرف اشارہ ہے۔

ثانیاً یہ کہ وہ نزاعی امور میں (فی الخصام) اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں غیر واضح اور مبہم رہ جاتی ہے۔

یہ دونوں باتیں عورت کی طبعی ساخت اور نفسیات میں داخل ہیں ان میں سے کسی ایک بات کو ماننا اور دوسری کو تسلیم نہ کرنا ایک غلط طرزِ عمل ہے یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ عورت کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ عام روزمرہ کی گفتگو میں "غیر مبین" رہ جاتی ہے بلکہ اس کی یہ خصوصیت نزاعی معاملات اور مخاصمانہ حالات تک ہی محدود ہے۔ رہیں اس کی تعلیمی اور علمی صلاحیتیں تو اس سے کسی کو انکار نہیں خود اسلام نے عورتوں کی ان صلاحیتوں کے پیشِ نظر انہیں حصولِ علم کی ترغیب دی ہے اسلامی تاریخ

عورتوں کے علم و فضل کے کارناموں سے بھری پڑی ہے کتنی ہی عورتیں ایسی گزری ہیں جو اپنے اپنے وقت میں آسمانِ علم و ادب کے درخشاں ستارے بن کر نمودار ہوئیں عورت کی علمی صلاحیتوں کا بیان اس وقت ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے اس وقت جو چیز ہمارے زیرِ سخن ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام علمی استعدادات کے باوجود عورت کی ساخت اور نفسیات میں ایک ایسی کمزوری پائی جاتی ہے جس کی بناء پر وہ متنازعہ فیہ امور (مقدمات وغیرہ) میں جزئیات کی صراحت نہ کر سکنے کے باعث اپنے بیان اور اظہارِ مدّعا میں غیر واضح رہ جاتی ہے اور یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس سے کسی دَور کی عورت بھی خالی نہیں ہے ڈاکٹر ہارڈنگ نے یہ تحقیق صدیوں پہلے کسی تاریک دَور کی جاہل عورتوں پر نہیں کی تھی بلکہ آج کی تعلیم یافتہ عورتوں ہی پر کی تھی اور موصوف نے اس کمزوری کو کہ ـــــــ

"عورت جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ (ACCURATELY) بیان (DEFINE) نہیں کر سکتی" ـــــــ عام طور پر خواتین میں مشترک پایا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کمزوری اور خصوصیت کسی خاص ماحول اور معاشرے کی پیداوار ہے جسے اگر بدل دیا جائے تو اس کمزوری کا استیصال ہو جائے یہ چیز بہر حال عورت کی طبیعیات اور نفسیات میں داخل ہے جسے خارجی تدابیر سے منحرف (PERVERT) تو کیا جا سکتا ہے مگر فنا (EXTINCT) نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال عورت کی یہ کمزوری ایک ایسی حقیقت ہے جسے خود قرآن بھی بیان کرتا ہے اس کمزوری کا ذکر، عورت کی کوئی توہین یا تذلیل نہیں ہے بلکہ ایک امرِ واقعی کا اظہار ہے عورت کی کمزوری اسی دنیا تک محدود ہے آخرت کی زندگی میں جبکہ زمین و آسمان کا نظام ہی اور قسم کا ہو گا اور وہاں یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ کے تحت نظامِ کائنات ہی بدل جائے گا۔ عورتوں کو نَشْاَۃِ جدیدہ (اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً) کے تحت جو نئی خوبیاں میسر آئیں گی ان میں سے ایک خوبی عُرُبًا کے لفظ میں واضح کی گئی ہے، اگرچہ عُرُبًا کا معنیٰ و مفہوم "شوہروں کی دلدادہ اور ان کی محبوب نظر بیویاں" بھی ہیں لیکن اپنے مادے کے اعتبار سے اس میں

"فصیح الکلام اور صاف اور واضح کلام کرنے والی خواتین" کا مفہوم بھی شامل ہے جو دنیا میں پائے جانے والے اس نقص کی عدم موجودگی پر دلالت کرتا ہے جسے "غیر مبین" کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

سورۂ زخرف کی اس آیت کے تحت مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم محققینِ جدید تحقیق | مغرب کی جدید تحقیقاتی کاوشوں کے نتائج و ثمرات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"WOMAN IS ADMITTEDLY WEAKER IN LOGIC THAN THE MALE, AND BECAUSE HER "OPINION" IS PARTLY INSTINCTIVE FEELINGS AND PARTLY IMMEDIATE REACTIONS TO THE MOMENTARY SITUATION, SHE CAN NOT EQUAL MAN IN ENUMERATING ARGUMENTS AND PROOFS IN SUPPORT OF HER VIEWS. HER WAY OF THINKING IS WHAT WE DESCRIBE AS INTUITIVE."

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عورت، استدلال و استنباط میں مرد سے کمزور تر واقع ہوئی ہے اور چونکہ اس کی "رائے" کسی حد تک جبلی احساسات کے تحت اور کسی حد تک آناً فاناً پیدا ہونے والی صورتحال کے ردِ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اور حمایت کے لئے دلائل اور ثبوت کی فراہمی میں مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس کا طرزِ عمل وہی ہے جسے ہم "وجدانی" طرزِ عمل قرار دیتے ہیں۔" (یعنی وہ دلیل و برہان پر نہیں بلکہ دل میں آنے والے خیالات پر سوچ و بچار کی بنیاد رکھتی ہے قاسمی) (ماخوذ از انگریزی تفسیر قرآن، مولانا عبدالماجد دریا بادی)

دورِ جدید کی یہ تحقیق جس کے مطابق عورت قوتِ استدلال اور ملکۂ استنباط میں مرد سے کمزور تر واقع ہوئی ہے اس بات کو واضح کر دیتی ہے کہ عورت کا کرسئ عدالت پر براجمان ہونا درست نہیں ہے، پھر اگر اس کمزوریٔ استدلال کے ساتھ علالت کے وہ آثار بھی جمع ہو جائیں جو عورت کے فطری وظائف حیات، حمل، رضاعت اور ماہواری کا لازمی نتیجہ ہیں تو عدالت و انصاف کی دنیا درہم برہم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن جناب پرویز صاحب اور مولانا عثمانی صاحب عورت کو نہ صرف یہ کہ کرسئ عدالت پر بٹھانے کی کوشش میں مصروف ہیں بلکہ وہ اسے سربراہ مملکت بنانے کے لئے بھی قرآن سے دن رات "دلائل" ڈھونڈھتے نہیں تھکتے اور ساتھ ہی عورت کی کمزوریوں کا اعتراف بھی کرتے جاتے ہیں اور یہ بھی شور مچاتے جاتے ہیں کہ فطری تقسیم کار کے مطابق عورت کا دائرۂ عمل اس کا گھر ہے اور یہ سب کچھ "تعلیماتِ قرآن" کے مطابق کیا جا رہا ہے۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کی اِن فطری کمزوریوں کے ساتھ اسے گواہ کی حیثیت سے یا قاضئ عدالت کی حیثیت سے، کٹہرۂ انصاف میں لانا نہ صرف یہ کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ دورِ جدید کی علمی تحقیقات کے بھی خلاف ہے۔

دورِ حاضر کی جدید تحقیقات عورت کی عدالتی شہادت کو آج وہی مقام و مرتبہ دے رہی ہیں جو خود اسلام نے آج سے چودہ سو سال قبل عطا کیا تھا

## اندھی تقلید کے کرشمے

لیکن ہمارے یہاں کے جدید طبقے کے ذہنوں پر مغرب کی اندھی پیروی کے باعث ایسا جمود و تعطل طاری ہو گیا ہے کہ اگر وہاں سے کوئی غلط بات بھی صادر ہو جائے تو اسے "وحی" قرار دے کر ہاتھوں ہاتھ لے لیا جاتا ہے اور مسائلِ حیات کے حل کے لئے، پوری مقلدانہ سعادت مندی کے ساتھ انہی نسخوں کو یہاں آزما ڈالا جاتا ہے جو دراصل یہاں کے لئے بنائے ہی نہیں گئے تھے، اہلِ مغرب دورِ حاضر کی غالب تہذیب کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے اپنے مجوزہ نسخوں کو مجتہدانہ بصیرت سے برتتے ہیں حسبِ ضرورت ان میں ترمیم بھی کر لیتے ہیں لیکن یہاں کے مقلد تو ایسے کور چشم واقع ہوئے ہیں کہ اپنے وطن، ماحول، حالات الغرض ہر چیز سے آنکھیں بند کرتے ہوئے مریض کی آخری ہچکی تک وہی نسخہ استعمال کرتے رہیں گے

الا یہ کہ خود وہیں سے نسخہ میں ترمیم کی کوئی اطلاع آجائے لیکن بعض ضدی قسم کے عطائیوں کا تو یہ حال ہے کہ جس غلط بات کو ایک مرتبہ تقلید یورپ میں اختیار کر لیا ہو اُسے پھر دانتوں سے پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں بعد ازیں اب اگر وہاں کے مفکرین کی تحقیقات میں بھی وہ غلط قرار پا گئی تو بھی یہاں کے مقلدین اس کی تردید و تکذیب پر آمادہ نہیں ہوتے فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ (جسے قبل ازیں وہ جھٹلا چکے ہیں اب اس پر وہ ایمان نہیں لانے والے ہیں) لطف کی بات یہ ہے کہ مغرب کی پیروی میں یہ لوگ جس گمراہی کو بھی اختیار کریں گے قرآن ہی سے "برآمد" کر کے اختیار کریں گے گویا قرآن سے انہیں ایسی محبت ہے کہ اس کا "ساتھ" نہیں چھوڑ سکتے۔ مغربی آقاؤں کی پیروی میں یہ لوگ گمراہی کے جس گڑھے میں لڑھکیں گے قرآن کو بھی ساتھ لڑھکائیں گے۔ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں<br>
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

الغرض قرآنی تصریحات دورِ حاضر کے مفکرین کی جدید تحقیقات اور خود پرویز صاحب کے اقتباسات سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ قوتِ استدلال، ملکۂ استنباط اور دلائل و براہین کی فراہمی میں عورت، مرد سے کمزور تر واقع ہوئی ہے اس لئے وہ صرف دو مرد گواہوں کی عدم موجودگی ہی میں (فان لم یکونا رجلین) ایک مرد اور ایک دوسری عورت کے ساتھ عدالتی گواہ کے طور پر حاضر ہو سکتی ہے اس کے ذہنی قویٰ میں ایک فطری کمزوری موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مرد جمیع نقائص و عیوب سے پاک ہے فضائل و رذائل اور محاسن و معائب ہر دو صنفِ بشر میں پائے جاتے ہیں نہ ساری خوبیاں عورتوں ہی میں ہیں اور نہ مردوں ہی میں۔ اسی طرح نہ سارے نقائص عورتوں ہی میں ہیں اور نہ مردوں ہی میں[1]۔ اس دار الامتحان

[1] یہاں یہ کہنا کہ ـــــ "جب فضائل و رذائل اور محاسن و مصائب دونوں اصنافِ بشر میں موجود ہیں تو یا تو دونوں اصناف کو ناقص العقل کہیے یا دونوں کو نہ کہیے" ـــــ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے عدالتی شہادت کی اس بحث میں "نقصِ عقل" کا تعلق صرف اس خامی سے ہے جس کا تفصیلی ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور جس پر اب تک کے تجربات، مشاہدات اور

میں انسانی ابتلاء و آزمائش کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر فردِ بشر میں خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کچھ خوبیاں اور کچھ خامیاں رکھی ہیں اگر ایک پہلو میں کسی صنف میں کوئی خامی ہے تو دوسرے پہلو میں خوبیاں بھی موجود ہیں فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (ہو سکتا ہے کہ تمہیں کسی چیز میں کراہت محسوس ہو مگر اللہ نے اس میں بھلائی بھی رکھی ہو) یہ خوبیاں اللہ تعالیٰ نے ہر فرد بشر میں اس کی فطری ذمہ داریوں کے حسب اقتضاء رکھی ہیں عورت کے اندر وہی فضائل و محاسن رکھے جو اس کی فطری ذمہ داریوں کی بجا آوری میں معاون ہیں اور مرد میں وہ خوبیاں اور کمالات ودیعت کئے جو اس کے فطری واجبات کی ادائیگی میں کارآمد ہیں۔ عورت کے دائرۂ عمل میں اگر مرد مسابقت پہ اتر آئے تو شکست فطرتاً اس کا مقدر ہو گی۔ مرد کے دائرۂ کار میں اگر عورت مقابلے پر اتر آئے تو وہ مرد کو نیچا نہیں دکھا سکتی البتہ اپنے فطری دائرۂ عمل سے خروج کے باعث وہ تمدن کو فساد اور بگاڑ کا نشانہ بنا دے گی ہر فرد بشر اپنی فطری استعدادات اور جبلی صلاحیتوں کی نشوونما اپنے فطری میدان عمل ہی میں رہ کر سکتا ہے، یہی فطری ارتقاء کا راستہ ہے فطری عروج و ارتقاء کا راستہ یہ نہیں ہے کہ کسی فرد بشر کو اس کے اپنے فطری دائرۂ کار سے اکھاڑ کر فطری نشوونما فطری دائرۂ کار میں اسے دوسرے میدانِ عمل میں لایا جائے بلکہ فطری ارتقاء کا راستہ یہ ہے کہ عورت کو اس کے دائرۂ عمل میں رکھا جائے اور اس سے تمدن کی خدمت کا وہ کام لیا جائے جو اس کی فطری صلاحیتوں سے میل کھاتا ہے اور مرد کو اس کے دائرۂ عمل میں رکھ کر اس سے تمدن کی خدمت کا وہ کام لیا جائے جو اس کی فطری صلاحیتوں کے موافق ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عورت کا میدان عمل اس کا گھر ہے اور مرد کا میدانِ عمل بیرون خانہ کی دنیا ہے عورت کو گھسیٹ کر مرد کے دائرۂ

---

شہادات دلالت کناں ہیں یعنی یہ کہ مقدمات کی جزئیات میں عورت کا الجھ جانا، ذہن کا ماؤف ہو جانا، پوری پوری صحت کے ساتھ فروعات کا بیان نہ کر پانا، اظہار مدعا میں غیر مبین رہ جانا، فراہمی دلیل، قوتِ استدلال اور ملکۂ استنباط میں مرد کے مقابلے میں کمزور واقع ہونا وغیرہ یہ سب کچھ تمام خواتین کے عام اور مشترک اوصاف ہیں انہی اوصاف کی بناء پر قرآن نے ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو گواہ ٹھہرایا ہے۔

عمل میں لانا (خواہ اسے عدالتی گواہ کے طور پہ لایا جائے یا منصبِ قضاء پر فائز کرنے کے لئے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر اسے سربراہِ مملکت کی کرسی پر براجمان کرنے کے لئے) ہر صورت میں فسادِ تمدن کا پیش خیمہ ہے۔ اس میں عورت کے لئے کامیابی نہیں بلکہ ناکامی ہے زندگی کے ایک پہلو میں مرد کمزور ہیں اور عورتیں بڑھی ہوئی ہیں اور دوسرے پہلو میں عورتیں ضعیف ہیں اور مرد قوی اور فائق ہیں۔ ہر صنفِ بشر کو کسی نہ کسی پہلو میں دوسرے صنفِ انسان پر فضیلت حاصل ہے فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) اب اگر عورتوں کو ان کے اپنے میدانِ عمل سے نکال کر مردوں کے میدانِ عمل میں لایا جائے تو اس دائرۂ عمل میں عورتیں فطرتاً مردوں سے کمتر صلاحیتوں کی مالک ہیں خواہ وہ کتنی بھی کوشش کریں ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کی صنف سے ارسطو، ابن سینا، کانٹ، ہیگل، خیام، شیکسپیئر، سکندر، نپولین، صلاح الدین ایوبی، نظام الملک طوسی اور بسمارک کی ٹکر کا ایک فرد بھی پیدا ہو سکے۔ دوسری طرف تمام دنیا کے مرد چاہے کتنا ہی سر ماریں وہ اپنے میں سے ایک معمولی درجے کی ماں بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مرد و زن کے دائرۂ کار کے متعلق یہ مختصر سی بحث ایک سلیم الفطرت آدمی کے فہم و تدبر اور افہام و تفہیم کے لئے کافی ہے اور اب مزید طولِ کلام کی حاجت نہیں ہے ؎

دریائے خوں بہانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں!

**نگہِ بازگشت**

آئیے اب مزید پیشقدمی کریں لیکن ٹھہریئے شاید آپ کا راہرو فکر کچھ تکان محسوس کر رہا ہو ذرا سستا لیجئے اور فرصت کے ان لمحات میں طے شدہ مسافت پر نگاہِ بازگشت ڈال کر دیکھئے کہ ہم بحث و تحقیق کی کن منزلوں سے گزر کر یہاں پہنچے ہیں اب تک ہم نے تین منزلیں طے کی ہیں۔

۱ ــــ فطری تقسیم کار کی رُو سے عورت کا میدانِ عمل اس کا گھر ہے وہ چراغِ

خانہ ہے شمع انجمن نہیں ہے اور مرد کا دائرۂ عمل بیرون خانہ کی دنیا ہے۔

۲ ـــــــ ایک صالح تمدن کے فطری ارتقاء کا صحیح راستہ یہی ہے کہ عورت کو اس کے دائرۂ کار میں رکھ کر تمدن کی خدمت کا وہ کام لیا جائے جو اس کی فطری صلاحیتوں سے میل کھاتا ہے اور مرد کو اس کے میدانِ عمل میں رکھ کر اس سے تمدن کی خدمت کا وہ کام لیا جائے جو اس کی فطری استعدادات کے موافق ہے اگر وہ اپنے فطری دائرۂ عمل سے خروج کریں گے تو ان کی فطری کمزوریاں مشہود ہو کر تمدن کے بگاڑ کا باعث بنیں گی۔

۳ ـــــــ عورت ملکۂ استنباط اور قوتِ استدلال میں مرد سے کمزور تر واقع ہوئی ہے وہ جزئیات کی صراحت میں غیر واضح رہ جاتی ہے مقدمات اور متنازعہ فیہ امور میں وہ دلائل و براہین کی فراہمی کے دوران الجھ جاتی ہے اور نزاعات و مقدمات کا فیصلہ کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ پاتا۔

ان تینوں نکات کو جناب پرویز صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ ان کے پیش کردہ حوالہ جات سے واضح ہے اور ان کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ عورت کو تمدن کی خدمت کے لیے انہی امور کو سرانجام دینا چاہیئے جو گھر کی چار دیواری سے متعلق ہیں انہیں مردانہ دائرۂ عمل میں کھینچ لانا خود عورت کے لئے بھی اور تمدن کے لئے بھی نقصان دہ ہے عورت کی ذہنی کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو عدالتی اور ملکی امور کو سرانجام دینے کا نظریہ بے بنیاد قرار پاتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جناب پرویز صاحب محترم عثمانی صاحب اور ان کے رفقائے کار، پرنالہ وہیں رکھتے ہیں اور ان کی طبیعت ان اعترافات کے باوجود بھی انہی اعترافات کے منطقی نتائج کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ بقول غالب ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

آیئے اب ہم شہادتِ نسواں کے موضوع پر جناب پرویز صاحب اور مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کے دلائل

## مسئلہ شہادتِ نسواں اور پرویز و عثمانی صاحب کے دلائل

کا جائزہ لیں لیکن پہلے ایک ضمنی گوشہ۔

اسلام نے مختلف امور و واقعات میں نصابِ شہادت کو مختلف رکھا ہے کہیں نصابِ شہادت چار مردوں پر مشتمل ہے کہیں تین مردوں پر کہیں دو مردوں پر اور کہیں ایک مرد پر۔ زنا و قذف کے مقدمات میں اسلام نے چار مرد گواہوں کی شرط عائد کی ہے، مالی لین دین میں قرآن نے دو مرد گواہوں کا ذکر کیا ہے لیکن اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو خواتین گواہ بن سکتی ہیں، تعدد شہداء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ "کوئی ایک گواہ ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے"۔ اس لئے گواہوں کی تعداد بڑھائی گئی ہے اور نہ ہی یہ مقصد ہے کہ ایک گواہ کے بیان میں جو سقم رہ جائے گا اسے دوسرا گواہ دور کر دے گا اور دوسرے کی شہادت میں جو کسر رہ جائے گی اسے تیسرا گواہ پوری کرے گا اسی طرح تیسرے گواہ کے شہادتی نقص کو چوتھا گواہ دور کر دے گا بلکہ تعدُّدِ شہداء کا اصل مقصد یہ ہے کہ متعدد شہادتوں سے حاصل ہونے والے یقین میں اضافہ، اعتماد میں زیادتی اور وثوق میں ازدیاد پیدا ہو جائے ایک گواہی کے نتیجے میں جو یقین، اعتماد اور وثوق پیدا ہوتا ہے دوسری، تیسری اور چوتھی گواہی اس ابتدائی یقین میں اضافہ در اضافہ کرتی جاتی ہے جس نسبت سے شہادتوں میں سے حاصل ہونے والا یقین بڑھتا جاتا ہے اسی نسبت سے شک و شبہ میں کمی ہوتی چلی جاتی ہے اور یہی مطلوبِ قرآن ہے۔

| | |
|---|---|
| ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰىٓ اَلَّا تَرْتَابُوْٓا۔ (۲۸۲/۲) | اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمہارے لئے زیادہ مبنی بر انصاف ہے اس سے اقامتِ شہادت میں زیادہ سہولت ہوتی ہے اور شکوک و شبہات کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ |

اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات ایک گواہ کے بیان کی کسر دوسرے گواہ کے بیان سے پوری ہو جاتی ہے لیکن بہرحال قرآن کا اصلی اور اولین مقصد شہادتوں سے حاصل ہونے والے یقین میں اضافہ اور زیادتی ہے جو فیصلے کی بنیاد بنتا ہے۔ یہ

علیحدہ بات ہے کہ اصل مقصد سے بالتبع یہ مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

گواہی سے متعلقہ اس ضمنی توضیح کے بعد اب ہم ان دلائل کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں جو جناب پرویز صاحب اور مولانا عمر احمد عثمانی صاحب نے دیئے ہیں ہم نے شہادت سے متعلقہ آیات کی وہی ترتیب رکھی ہے جو محترم عثمانی صاحب نے اپنی کتاب فقہ القرآن میں اختیار کی ہے ترجمہ آیات کے بعد انہی کے الفاظ میں ان کا طرز استدلال اور انداز استنباط درج ہے، ہمارا جواب شہادت سے متعلقہ تمام آیات سے فریق مخالف کے استشہاد و استدلال کے بعد شروع ہوگا۔

### ۱۔ انقضاء عدت کی صورت میں گواہی۔

| | |
|---|---|
| فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۚ (۶۵/۲) | توجب وہ اپنی عدت پوری کرلیں انہیں دستور کے مطابق (تجدید نکاح کرکے) روک لو یا ان سے دستور کے مطابق الگ ہو جاؤ اور اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنا لو اور اللہ کے لئے شہادت قائم کرو۔ |

### ۲۔ زنا کے سلسلے میں حکم شہادت۔

| | |
|---|---|
| وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ ۖ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ۝ (۴/۱۵) | اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے میں سے چار گواہ بنا لو پھر اگر وہ گواہی دیں تو انہیں گھروں میں بند کر دو تا آنکہ انہیں موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی سبیل نکال دے۔ |

ان دونوں آیات سے استدلال کرتے ہوئے مولانا عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"جس طرح عدت کے گواہوں والی آیت میں عورتوں کی گواہی کی مخالفت نہیں ہے اس طرح اس آیت میں بھی چار گواہ بنا لینے کا جو حکم دیا گیا ہے"

توکوئی ایسا اشارہ نہیں فرمایا گیا کہ یہ چاروں گواہ مرد ہی ہونے ضروری ہیں قرآن کریم کے الفاظ مردوں اور عورتوں دونوں کا احتمال رکھتے ہیں یہ کہنا زیادتی ہوگا کہ قرآنِ کریم نے مِنْكُمْ کی قید لگا کر جس میں کُمْ جمع مذکر حاضر کی ضمیر ہے مردوں کی تخصیص کر دی ہے کیونکہ قرآن کریم میں عموماً مذکر ہی کے صیغوں سے مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے ورنہ عورتوں کو تمام مسائل سے سبکدوش کرنا پڑے گا۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (صلوٰۃ قائم کرو اور زکوٰۃ دو) جمع مذکر ہی کے صیغے ہیں تو کیا یہ کہہ دیا جائے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ صرف مردوں پر فرض ہے اور عورتیں اس میں داخل نہیں ہیں۔ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۸۹)

۳۔ اموال یتامیٰ کی واپسی سے متعلق حکم۔

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ○ (۴/۶)

توجب تم ان کے اموال ان کے حوالہ کرو توان پر گواہ بنالیا کرو اور اللہ حساب لینے والا کافی ہے۔

اس آیت سے یوں استدلال کیا گیا ہے۔

"اس حکم میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے کہ گواہ مرد بنائے جائیں یا عورتیں گواہ بنائی جائیں اس آیت کریمہ میں صرف شاہد بنا لینے کا ذکر ہے اور شاہد یعنی گواہ مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ص ۹۰)

"قرآن میں صرف شاہد بنا لینے کا حکم دیا گیا ہے اور شاہد یعنی گواہ مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔" (فقہ القرآن ج ص ۹۰)

۴۔ قذف کے متعلق حکم شہادت۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

اور جو لوگ پاکدامن عورتوں کو تہمتیں لگاتے ہیں پھر چار گواہ پیش نہیں کر پاتے انہیں اسّی[۸۰]

ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۲۴/۴)

کوڑے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو یہی لوگ فاسق ہیں۔

' اس آیت سے یوں استنباط کیا گیا ہے۔

" اس آیت کریمہ میں چار گواہ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے گواہ مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی ہو سکتی ہیں الذین یرمون جمع مذکر کا صیغہ ہے لیکن اگر عورتیں تہمت لگائیں تو حدِ قذف ان پر بھی جاری کی جاتی ہے الذین یرمون میں بھی شامل ہیں لہٰذا اربعة شهداء میں بھی لازماً عورتیں شامل ہوں گی۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۱-۹۰)

## ۵۔ حکم شہادت بسلسلۂ وصیت۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ (۵/۱۰۶)

اے پیروانِ دعوت ایمانی! تمہارے درمیان وصیت کے وقت شہادت ضروری ہے جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اپنے میں سے دو معتبر آدمیوں کی یا دو اپنے غیروں (غیر مسلموں) میں سے اگر تم زمین میں سفر کرو اور وہاں تمہیں پہنچنے والی موت آپہنچے۔

اس آیت میں یہ طرز استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

" اس آیتِ کریمہ میں مردوں یا عورتوں میں کوئی تخصیص نہیں فرمائی گئی حالتِ سفر میں اگر کسی کو موت آنے لگے اور اس کے پاس وہاں کچھ مال ہو اور وہ اس کے لئے کوئی وصیت کرنا چاہتا ہو تو دو معتبر آدمی مسلمانوں میں سے اور اگر مسلمان نہ ہوں تو کفار ہی میں سے وصیت کے گواہ بنا لینے چاہئیں ظاہر ہے کہ مسلمان آدمی مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی ہوتی ہیں عورتوں کو آدمیت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ نہ اسلام سے خارج کیا جا سکتا ہے وہ بھی آدمی ہوتی ہیں اور وہ بھی مسلمان ہوتی ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۱)

## ۶۔ وصیت میں شک وشبہ کی صورت میں۔

"اس سلسلہ میں اگر مورث کے ورثاء کو یہ شبہ ہو کہ جو دو گواہ وصیت کی گواہی دے رہے ہیں انہوں نے کوئی خیانت کی ہے تو حکم دیا گیا ہے کہ مورث کے ورثاء میں سے دو آدمی قسمیں کھائیں کہ انہوں نے خیانت کی ہے اور ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ سچی ہے اور ہم ان پر الزام لگانے میں کوئی زیادتی نہیں کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ اگرچہ شہادت نہیں ہے بلکہ قسم ہے لیکن قرآن کریم نے اسے بھی شہادت ہی سے تعبیر فرمایا ہے لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اس شہادت میں بھی مردوں اور عورتوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے اگر کسی کی وارث صرف اس کی بیوی اور بیٹی ہو تو کیا اسلامی شریعت اسے قسموں کی اجازت نہیں دے گی اور ان کے مال میں خیانت کا کوئی نوٹس نہیں لیا جائے گا[1] (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۲)

## ۷۔ شہادتِ لعان کا حکم۔

اس مسئلے میں محترم عثمانی صاحب آیت کی بجائے اس کے مفہوم پر اکتفا کرتے ہیں اور یوں استدلال فرماتے ہیں۔

"ساتویں شہادت لعان کے مسئلہ میں آتی ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں قسمیں کھا کر تہمت سے برأت اور فریق ثانی کی تکذیب کرتے ہیں، شوہر پانچ قسمیں کھاتا ہے کہ میں نے جو تہمت لگائی ہے اس میں میں سچا ہوں اور بیوی پانچ قسمیں کھاتی ہے کہ شوہر نے مجھ پر جو تہمت لگائی ہے اس میں وہ جھوٹا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ نور کی آیات ۶ تا ۹) یہ بھی شہادتیں

---

[1] ضرور نوٹس لیا جائے گا کیونکہ یہاں ورثاء میں مرد گواہ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں متوفی کی بیوی اور بیٹی ہی کو اس خیانت کا علم ہے جہاں کوئی مرد گواہ موجود نہ ہو وہاں اگر تنہا عورتیں ہی حقیقت حال سے باخبر ہوں تو وہی گواہ ہو سکتی ہیں یہ مسئلہ امت میں پہلے ہی مسلم ہے علاوہ ازیں مثال مذکور میں یہ بیوی اور بیٹی خود مدعی کی حیثیت میں ہوں گی اس لئے انہیں خود اپنے حقوق کا دعویٰ کرنے کا حق پہنچتا ہے ان کے بیان یا گواہی پر اسلامی حکومت جو نوٹس لے گی اس کی علت بہر حال وہ نہیں ہے جو عثمانی صاحب ارشاد فرما رہے ہیں۔

نہیں بلکہ قسمیں ہیں مگر قرآن کریم نے ان کو بھی شہادتیں ہی کہا ہے یہاں تو واضح طور پہ قرآن کریم نے مردوں اور عورتوں کو ایک ہی درجہ پہ رکھا ہے مرد کے لئے بھی پانچ ہی قسمیں ہیں اور عورت کے لئے بھی پانچ قسمیں ہیں ایسا نہیں کیا گیا کہ مرد کو تو قسمیں کھانے کا حق دیا جاتا اور عورت کو اس سے محروم رکھا جاتا اور یہ بھی نہیں کیا گیا کہ مردوں سے پانچ قسمیں لی جائیں اور عورتوں سے کہا جاتا کہ وہ دس قسمیں یعنی مردوں سے ڈبل قسمیں کھائیں بلکہ دونوں صنفوں کو مساوات کا درجہ دیا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۳)

شہادت سے متعلق ان ساتوں آیات سے جو استدلال کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

"(قرآن میں) کسی بھی مقام پر شہادت کے ضمن میں عورتوں یا مردوں میں تخصیص یا تفریق نہیں کی گئی قرآن نے صرف گواہ (شاہد) کہا ہے خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں۔ اس کی رُو سے شہادت کے لئے نہ جنس (SEX) کی کوئی تخصیص ہے نہ شرط۔" (طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۸۳ء)

اب ہم ان دعاوی پر جن پر جناب پرویز صاحب اور مولانا عثمانی صاحب نے

**پرویز صاحب اور عثمانی صاحب کے دعاوی کا تفصیلی جواب**

اپنے استدلال کی بنیاد قائم کی ہے درج ذیل سطور میں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

**۱۔ مفہوم "شاھد"**

عربی زبان میں "شاہد" کا لفظ صرف مرد گواہ کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ عورت کے لئے "شاہدہ" کا لفظ بولا جاتا ہے آیاتِ شہادت میں سے کسی آیت میں بھی "شاہدہ" یا "شاہدات" کے الفاظ وارد نہیں ہوئے کیا وہ خدا جس نے ایک سو چودہ سورتوں پر مشتمل قرآن مجید نازل کیا ہے اگر عورتوں پر گواہی کا فریضہ ہمیشہ کے لئے ثابت اور محفوظ کر دینا چاہتا تو کسی بھی آیت میں "شہداء" کی جگہ یا اس کے ساتھ "شاہدات" کے الفاظ نازل کر دینے میں اسے کیا روکاوٹ ہو سکتی تھی؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ خود نہیں چاہتا کہ عورتیں ادائیگی شہادت کے نتیجے میں اپنی فطری

حدود سے خروج کر جائیں۔ قرآن نے بہر صورت مرد اور عورت کے فطری دوائر حیات کا خیال رکھتے ہوئے مرد کو عدالتی معاملات میں ادائیگی شہادت کا ذمہ دار ٹھہرایا اور عورت کی فطری کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے (باستثنائے مجبوری حالات) امور خانہ داری کے فرائض سونپے اس فطری تقسیم کار میں کسی صنف بشر پر کوئی زیادتی نہیں کی بیرونِ خانہ کی ذمہ داری جس طرح مرد کامیابی سے پوری کر سکتا ہے عورت نہیں کر سکتی۔ درونِ خانہ کے فرائض کی بجا آوری جس سلیقے سے ایک عورت سرانجام دے سکتی ہے مرد نہیں دے سکتا۔ شہادت کا فریضہ اگر مرد کے ذمہ ڈالا گیا ہے تو اس میں اس کی کوئی بے جا عزت افزائی نہیں ہے اور اگر عورت پر اس فریضہ کی ادائیگی عائد نہیں کی گئی تو اس میں اس کی کوئی تحقیر و توہین نہیں ہے (بلکہ اس فریضے کا بار اس پر سے اٹھا کر اسے سبکدوش کر دیا ہے) اسلام نے ہر جنس بشر کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق وہی کام سونپا ہے جس کی اس میں اہلیت و استعداد پائی جاتی ہے ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے — جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ، تو پروانے کو جلنا! — "غم" ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

عربی زبان کے قواعد سے باخبر لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ ایک اور دو افراد

۲۔ **اَرْبَعَةَ شُهَدَآءَ** کی تعداد کے لئے جو اسم عدد مستعمل ہوتا ہے وہ معدود کی تذکیر و تانیث کے مطابق ہوتا ہے مگر تین سے دس تک معدود افراد کے لئے جو عدد استعمال کیا جاتا ہے وہ مذکر معدود کی صورت میں مؤنث اور مؤنث معدود کی صورت میں مذکر ہوتا ہے قرآن پاک میں اَرْبَعَةَ شُهَدَآءَ کی ترکیب میں عدد (یعنی اربعة) مؤنث ہے جو معدود (یعنی شہداء) کی تذکیر پر دلالت کرتا ہے اس طرح مؤنث عدد (اربعة) نے مذکر معدود (شہداء) کے ساتھ مل کر اس آیت کو مردوں کے لئے خاص کر دیا ہے۔ اگر کتاب اللہ میں مذکر عدد (اربع) کے ساتھ مؤنث معدود (شاہدات) کا الحاق ہوتا تو آیت خواتین کی شہادت کے لئے خاص ہو کر رہ جاتی جیسا کہ اب مردوں کی شہادت کے لئے خاص ہو کر رہ گئی ہے لیکن اگر مرد اور عورتیں دونوں ہی گواہ کی

حیثیت سے مراد ہوتے تو آیت کے الفاظ کی ترتیب یوں ہوتی "تولو یاتوا بار بعۃ شہداء او اربع شاھدات" لیکن قرآن کریم میں الفاظ کی ترتیب یہ نہیں ہے اس طرح یہ آیات بلاشک وشبہ قطعی طور پر مردوں کے لئے خاص ہو کر رہ گئی ہیں۔

میرے اس مقالے کی تردید میں (جو اس کتاب میں شامل ہو کر اب آپ کے زیر مطالعہ ہے) محترم عثمانی صاحب نے جو مضمون قلمبند فرمایا تھا اس کا مکمل جواب تو اگلے باب میں تفصیل سے موجود ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے میں یہ چاہتا ہوں کہ "اربعۃ شہداء" کی میری اس توجیہہ و وضاحت پر انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی حقیقت کی

**ایک اعتراض اور اس کا جواب**

یہیں وضاحت ہو جائے وہ جو کچھ فرماتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ــــ "بیشک قرآنی الفاظ" اربعۃ شہداء" کے صیغے مذکر ہی کے صیغے ہیں مگر مذکر کے ان صیغوں میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہیں" ــــ لیکن میں عرض کروں گا کہ قرآن پاک میں "چار گواہوں" کا ذکر سب سے پہلے جس آیت میں نازل ہوا ہے وہ سورہ نساء کی آیت ۱۵ ہے اس کے بعد سورۂ نور کی آیات میں "اربعۃ شہداء" کا ذکر آیا جو بعد میں نازل ہوئی ان آیات میں مذکور اسلامی قانونِ شہادت کی اصل بنیاد اسی آیت پر ہے جو سب سے پہلے "چار گواہوں" کے متعلق نازل ہوئی تھی اب اصل دیکھنے کی بات یہ ہے کہ قرآن پاک کی "چار گواہوں" سے متعلق سب سے پہلی آیت میں مرد گواہ مراد ہیں یا مرد و عورت دونوں اصناف بشر؟ محترم عثمانی صاحب اس سے مراد دونوں اصنافِ انسان لیتے ہیں اور دلیل دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ ــــ "یہ کہنا زیادتی ہے کہ قرآن کریم نے "منکم" کی قید لگا کر جس میں "کم" جمع مذکر حاضر کی ضمیر ہے مردوں کی تخصیص فرما دی ہے کیونکہ قرآن کریم میں عموماً مذکر ہی کے صیغوں سے مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب فرمایا گیا ہے" ــــ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۸۹) میرا موقف یہ ہے کہ آیت $\frac{4}{15}$ میں مذکر کے صیغے صرف مردوں ہی کے لئے خاص ہیں کیونکہ اصلاً یہ صیغے ہوتے ہی صنف مذکر کے لئے ہیں عورتوں کا ان میں داخل

ہونا بطور مجاز ہے۔ لیکن محترم عثمانی صاحب کا اصرار ہے کہ "یہ صیغے مجاز ہو یا مشترک۔ بہر حال مذکر کے ان صیغوں میں دونوں اصنافِ بشر داخل ہیں"۔ اس قضیئے کے قطعی فیصلے کے لئے الفاظِ قرآن کی طرف رجوع کیجئے۔ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ مِنْ نِّسَآءِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَۃً مِّنْکُمْ (جو عورتیں تمہاری خواتین میں سے بیحیائی کا ارتکاب کریں ان پر اپنے میں سے چار ---- کو گواہ بنالو)۔ مِنْکُمْ (جو محترم عثمانی صاحب کی دلیل کی بنیاد ہے) میں جو "کم" کی ضمیر موجود ہے وہی ضمیر ہے جو نِسَاءِکُمْ میں موجود ہے۔ نِسَآءِکُمْ مرکب اضافی ہے جس میں نساء (خواتین) مضاف ہے اور "کُمْ" کی ضمیر مضاف الیہ ہے اب یہ ظاہر ہے کہ جملہ افراد صنفِ مؤنث لفظ "نساء" (خواتین) میں داخل ہیں جس کے نتیجہ میں باقی افراد جو صنف مذکر ہی کے افراد ہیں ضمیر "کُمْ" کے تحت آجاتے ہیں اس طرح نساء (خواتین) کے بالمقابل "کُمْ" کی ضمیر میں جو لوگ مراد ہیں وہ خالصتاً مرد حضرات ہی ہیں۔ لہٰذا "نساءکم" اور "منکم" دونوں میں موجود "کُمْ" کی ضمیر مردوں ہی کے لئے مخصوص ہے اگر جمع مذکر حاضر کی یہ ضمیر خواتین و حضرات دونوں کے لئے عام اور مشترک ہو بھی تب "نساءکم" (تمہاری خواتین) کے مرکب اضافی نے اس عموم و اشتراک کو توڑ کر عورتوں کو لفظ "نساء" میں اور مردوں کو ضمیر "کُمْ" میں مخصوص اور محصور کر دیا ہے۔

اب اگر یہاں "اربعۃ شہداء" سے مراد "مرد گواہ" ہیں تو سورۂ نور کی آیات (جو اسی آیت پر مبنی ہیں) میں بھی "اربعۃ شہداء" سے مراد بھی "مرد گواہ" ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ محترم عثمانی صاحب مِنْکُمْ سے استدلال شروع کرتے ہیں اور پھر نماز و زکوٰۃ سے متعلقہ آیات کی آڑ میں اسے خواتین تک وسیع کر دیتے ہیں حالانکہ "منکم" سے بھی پہلے "نساءکم" موجود ہے مگر وہ یہاں سے اپنے استدلال کی ابتداء نہیں کرتے۔

۳۔ مذکر کے صیغے | جہاں تک اس استدلال کا تعلق ہے کہ

"قرآن میں شہادت کے سلسلے میں مذکر کے صیغوں سے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے ان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں کیونکہ قرآن کریم میں مذکر ہی کے صیغوں سے مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے ورنہ عورتوں کو تمام مسائل سے سبکدوش کرنا پڑے گا۔

اقیموا الصلوٰۃ واتو الزکوٰۃ جمع مذکر ہی کے صیغے ہیں تو کیا یہ کہہ دیا جائے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ صرف مردوں پر فرض ہے اور عورتیں اس خطاب میں داخل نہیں ہیں۔"

یہ بہت ہی کمزور استدلال ہے جو ایک حقیقت سے نظریں چرا لینے کا نتیجہ ہے اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں میں سے ہر جنس بشر کو بعض ایسی منفرد اور ممتاز خصوصیات سے نوازا ہے جن سے دوسری جنس بشر محروم ہے بالفاظ دیگر مردوں میں بعض ایسی منفرد خصوصیات ہیں جو عورتوں میں نہیں ہیں اور عورتوں میں بعض ایسی ممتاز خصوصیات ہیں جن سے مرد محروم ہیں انہی منفرد اور ممتاز خصوصیات کی بناء پر ہر صنف بشر کا علیحدہ علیحدہ دائرۂ کار ہے جس میں وہ اپنی ان فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہوئے تمدن کی خدمت سرانجام دیتے ہیں لیکن بعض خصوصیات اور صلاحیتیں ایسی بھی ہیں جو مرد اور عورت دونوں میں مشترک ہیں۔ محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں ان کی صلاحیتوں اور خصوصیات میں فرق ضرور ہے کچھ خصوصیات مردوں میں ایسی ہیں جو عورتوں میں نہیں ہیں کچھ خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں نہیں ہیں اور بیشتر خصوصیات دونوں میں مشترک اور مساوی ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ صفحہ ۵)

اس حقیقت کی بناء پر حیاتِ انسانی تین میدان ہائے عمل میں منقسم ہے۔

**اوّل** ـــــ مردوں کا دائرۂ عمل جس میں مرد کی منفرد خصوصیات کی رعایت کرتے ہوئے اسے بیرونِ خانہ کے واجبات کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

**دوم** ـــــ عورتوں کا دائرۂ عمل جس میں عورتوں کی منفرد خصوصیات کی رعایت کرتے ہوئے اسے درونِ خانہ کے امور کو سرانجام دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

**سوم** ـــــ مشترک دائرۂ عمل جس میں دونوں کی مشترک خصوصیات کی نشو وارتقاء ہوتی ہے ایمان، اعتقاد، عبادات اور اخلاقیات کی جملہ تعلیمات اسی مشترک میدان کار سے متعلق ہیں دراصل اسی دائرۂ عمل میں قرآن مذکر کے صیغوں سے دونوں اصنافِ بشر کو خطاب کرتا ہے۔

اس حقیقت کو جان لینے کے بعد اب یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ مذکر کے صیغوں کے خطاب میں عورتیں صرف اسی وقت مردوں کے ساتھ شامل ہوں گی جب ان صیغوں میں دیا جانے والا حکم مرد اور عورت کے مشترک دائرۂ عمل سے تعلق رکھتا ہو[1]۔ جہاں حکم کا تعلق صرف مرد کے دائرۂ کار سے ہو وہاں عورتیں یقیناً اس حکم سے خارج ہوں گی مثلاً قرآن کہتا ہے لَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (تم اپنے سر نہ منڈواؤ یہاں تک کہ قربانی کے جانور اپنے ٹھکانوں تک پہنچ جائیں)۔ اور لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۔ (انشاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے)۔ ان دونوں آیات میں اگرچہ مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں مگر ان کے مخاطب صرف مرد ہیں۔ کیونکہ حلق راس سے متعلقہ امر اور خبر مردوں ہی سے متعلق ہے عورتیں سر نہیں منڈوایا کرتیں علاوہ ازیں مندرجہ ذیل آیت تو مردوں ہی سے خاص ہے اس کے حکم میں تو کسی طرح عورتوں کو داخل کیا ہی نہیں جا سکتا۔

فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ‏ دورانِ حیض اپنی بیویوں سے علیحدہ رہو

---

[1] الآیہ کہ اس دائرہ میں بھی کوئی حکم جزوی طور پر یا کلی طور پر کسی ایک صنف کے لئے مخصوص ہو جائے۔

| | |
|---|---|
| وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ (۲۲۲/۲) | اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ جب وہ خوب پاکیزہ ہو جائیں تو اللہ کے حکم کے مطابق ان کے ہاں جاؤ۔ |

ان آیات سے یہ واضح ہے کہ مذکر کے صیغوں میں دیئے جانے والے حکم میں عورتیں صرف اسی وقت شامل ہوں گی جبکہ یہ حکم مرد اور عورت دونوں کے مشترک میدانِ عمل سے متعلق ہو ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مشترک میدانِ عمل سے تعلق رکھنے والے احکام کو صرف صیغہ مذکر ہی میں کیوں پیش کیا جاتا ہے؟ مؤنث کے صیغوں میں کیوں ایسا حکم نہیں دیا جاتا جو مرد اور عورت دونوں سے متعلق ہو؟ تو ہم عرض کریں گے کہ مذکر کے صیغوں میں خطاب کرنے کا انداز ایک جانا پہچانا اسلوب ہے جسے ہر زبان، ہر دور اور ہر ملک میں اپنایا جاتا رہا ہے اور اپنایا جا رہا ہے تاہم قرآن کریم میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن میں مؤنث کا صیغہ اختیار کیا گیا ہے اور اس صیغے کے حکم میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں مثلاً

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۖ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۲/۶۰) | اے نبی جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان نہ گھڑ لائیں گی اور کسی معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو یقیناً اللہ بڑا معاف کرنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ |

اس آیت کے مطابق جن امور پر عورتوں سے بیعت لینے کا ذکر ہے حضورؐ مردوں سے بھی انہی باتوں پر بیعت لیا کرتے تھے کیونکہ ان باتوں میں سے کوئی ایسی بات نہیں جو صرف

مرد یا صرف عورت کے دائرۂ عمل سے متعلق ہو چنانچہ باوجودیکہ اس آیت میں خطاب عورتوں سے ہے مگر چونکہ ان میں مذکور باتیں مشترک دائرۂ عمل سے متعلق ہیں اس لئے حضورؐ اکرمؐ انہی باتوں پر مردوں اور عورتوں دونوں سے بیعت لیا کرتے تھے۔

اب رہا اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ کا حکم تو ظاہر ہے کہ یہ حکم بھی مرد اور عورت دونوں کے مشترک میدانِ عمل سے متعلق ہے اور جہاں تک عدالتی شہادت کا تعلق ہے گذشتہ صفحات کی تفصیلی بحث سے یہ بات واضح ہے کہ شہادت کے مسائل و معاملات صریح طور پر امور بیرونِ خانہ میں شامل ہیں جو خالصتاً مرد ہی کا میدانِ عمل ہے اس لئے آیاتِ شہادت کے حکم میں محض مذکر کے صیغوں کی بنیاد پر عورتوں کو مردوں کے ساتھ شامل کرنا ایک ایسی سینہ زوری ہے جس کا محرک مغرب کی اندھی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

شہادت کا معاملہ کوئی معمولی معاملہ نہیں ہے عدالتوں کا نظام بلکہ حکومتوں

**۴۔ اہمیت شہادت کا تقاضا**

کا نظام گواہیوں پر ہی قائم ہے شہادت کی اس اہمیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ قرآن اس کی ادائیگی کے سلسلے میں عورتوں کا کھلے اور دو ٹوک انداز میں گواہ ہونا ثابت کرتا (اگر فی الواقع اس ذمہ داری میں وہ بھی مردوں کے ساتھ شامل ہوتیں) لیکن قرآن الٹا ایسے قرائن بھی پیش کرتا ہے جو شہادتِ نسواں کے عدم جواز کو واضح اور قطعی بنا دیتے ہیں۔

عام اخلاقی ہدایات میں ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مشترک دائرۂ عمل کے معاملات میں (جن میں مذکر کا صیغہ ہی دونوں اصناف کے مخاطب حکم ہونے کی کافی دلیل بن جاتا ہے) صرف صیغہ مذکر کے استعمال پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ عورتوں کو الگ مستقل طور پر بھی مخاطب کرنا ضروری سمجھتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ | اے ایمان والو! نہ مرد، دوسرے مردوں |
| قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنُوْا | کا مذاق اڑائیں اور نہ عورتیں، دوسری |
| خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ | عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ مذاق |

نِسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ‌ (۴۹ / ۱۱) کا نشانہ بننے والے مذاق اڑانے والیوں سے بہتر ہوں۔

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ـــــ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ـــــ مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ـــــ اور مومن خواتین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں ـــــ

اب ظاہر ہے کہ تمسخر سے منع کرنے اور نگاہوں کو نیچا رکھنے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کے معاملے سے شہادت کا معاملہ اگر زیادہ اہم نہیں ہے تو اس کے برابر تو ضرور ہی ہے آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن نے غضِّ بصر، حفاظت فرج اور اجتناب تمسخر کے لئے تو مرد اور عورت کو الگ الگ خطاب کیا حالانکہ عام اخلاقیات سے تعلق رکھنے والے یہ احکام اگر صیغۂ مذکر میں بھی دیئے جاتے تو دونوں اصنافِ بشر ہی اس کے مخاطب بنتے۔ لیکن شہادت کے معاملے میں (جو سراسر بیرون خانہ کی دنیا سے متعلق ہے اور مرد کے دائرۂ کار میں شامل ہے) قرآن نے نہ صرف یہ کہ عورتوں کی گواہی کا قطعی ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ایسے قرائن بھی بین السطور میں رکھ دیئے ہیں جو امر شہادت کو عورتوں

**۵۔ "ان تضل" کی علت** کی بجائے مردوں ہی سے خاص کر دیتے ہیں اگر بقول جناب پرویز صاحب اور مولانا عمر احمد عثمانی صاحب۔

"عورت کو ہر معاملے میں اور ہر شعبۂ حیات میں مرد ہی کی طرح ہر معاملے میں گواہی دینے کا حق حاصل ہے۔ حدود و قصاص کے معاملات ہوں یا مالیات و اقتصادیات کے قرآن نے کہیں بھی مرد اور عورت میں تفریق نہیں کی۔"

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں لین دین کے معاملے میں آخر یہ فرق کیوں رکھا

گیا؟ یہاں فرق رکھنے کی علت کیا ہے؟ کیا وہ علت حدود و قصاص میں مرتفع ہو جاتی ہے؟ کیا "ان تضل" کی صورتحال عورت کو صرف مالی معاملات ہی میں لاحق ہوتی ہے؟ حدود و قصاص میں نہیں؟ آخر کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت میں قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی شہادت کو لازم کیا؟ آپ جو بھی وجہ پیش کریں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ وجہ دوسرے مقاماتِ شہادت میں کیوں نہیں پائی جاتی؟

حقیقت یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی کو طے کر کے مرد و زن کی شہادت میں مساوات کے قائلین کے لئے ایک ایسی الجھن پیدا کر دی ہے جسے دُور کرنا کسی کے بس کا کام نہیں۔ اگر سورہ بقرہ کی آیت میں ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی کا سرے سے ذکر ہی نہ ہوتا اور یہ آیت صرف مردوں تک ہی ذکر شہادت کو محدود رکھتی تو باقی آیاتِ شہادت کے مذکر کے صیغوں سے سینہ زوری کی بنیاد پر اگر مرد و زن دونوں کی گواہی کا جواز تراشا جاتا تو اس میں کسی قدر وزن ہو سکتا تھا۔ لیکن اب جبکہ امور مالیات میں ایک مرد کے برابر دو عورتوں کی شہادت قطعی طور پر طے پا چکی ہے تو پرویز صاحب اور مولانا عثمانی صاحب کے غبارہ استدلال کی ساری ہوا نکل جاتی ہے اور اپنے موقف کی حمایت میں اب اس آیت کی رکیک تاویلات میں پڑنا بے جا سخن سازی کی بھونڈی کوششیں ہیں۔

**۶۔ شہادت اور اولین قرآنی معاشرہ**

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آیا زمانہ نزول قرآن میں لوگوں کے اندر قرآنی اصول و ضوابط کے محض الفاظ ہی پڑھ کر سنائے جاتے تھے، یا ان قوانین کو عملاً نافذ بھی کیا جاتا تھا؟ کیا اسلام کی تبلیغ محض زبانی جمع خرچ تک محدود تھی یا اس کی بنیاد پر کسی جیتے جاگتے تمدن کی عمارت کو بھی استوار کیا جاتا تھا؟ کیا احکامِ قرآن محض ثوابِ تلاوت کے لئے اترا کرتے تھے یا ان احکام پر ایک سوسائٹی اور معاشرے کی تشکیل بھی وجود میں آئی تھی؟ اگر آپ ان سوالات کی پہلی شقوں کے قائل ہیں تو اپنے موقف میں تن تنہا ہیں کوئی آپ کا حامی و ناصر اور ساتھی و ہمنوا نہیں ہے لیکن اگر آپ دوسری صورت ہی کو صحیح مانتے ہیں اور وہی

واقعتاً صحیح بھی ہے تو آپ سے دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا دَورِ نبویؐ اور پورے خلافتِ راشدہ کے دَور میں کبھی عورتیں گواہ بن کر (حدود و قصاص کے معاملات میں) نمودار ہوئی ہیں۔ زیادہ نہیں صرف ایک ہی ایسی مثال پیش فرما دیں جس میں یہ مذکور ہو کہ ـــــ فلاں مقدمہ میں ـــــ فلاں عدالت میں ـــــ فلاں قاضی کے سامنے ـــــ فلاں عورت ـــــ فلاں مردوں کے ساتھ بطور گواہ پیش ہوئی تھی۔ یاد رہے کہ عدالت سے باہر کسی کے اظہارِ رائے کو عدالتی شہادت نہیں کہتے ایسی اظہارِ رائے کی آزادی ہر مرد و زن کو حاصل ہے۔ زیرِ بحث مسئلہ عورت کی عدالتی شہادت کا مسئلہ ہے اظہارِ رائے یا اطلاع و اخبار کا مسئلہ نہیں۔

جہاں تک محترم عثمانی صاحب، جناب پرویز صاحب اور دیگر متجددین کی اس

۷۔ **حلفِ لعان اور مساوات** | دلیل کا تعلق ہے کہ

> "لعان میں مردوں اور عورتوں دونوں کو ایک ہی درجے میں رکھا گیا ہے مرد کے لئے بھی "اربع شہادات" ہیں اور عورت کے لئے بھی۔ دونوں اصناف کو مساوات کا درجہ دیا گیا ہے یہ نہیں کہا گیا کہ عورت، مرد سے دگنی یا مرد، عورت سے آدھی شہادتیں پیش کرے۔"

تو یہ درحقیقت کوئی دلیل ہے ہی نہیں بلکہ غلط فہمی میں خود مبتلا ہونے کی اور دوسروں کو مغالطہ دینے کی ایک "حسین کوشش" ہے۔

(الف) سوال یہ ہے کہ چار مرتبہ کے یہ حلف اور پانچویں مرتبہ خدا کے غضب و لعنت کی یہ استدعا کیا فی الواقع شہادت ہیں؟ | **بیان لعان، شہادت یا حلف؟** اگر میاں بیوی ہی شاہد ہیں تو پھر مدعی اور مدعا علیہ کون ہیں؟ ہر مقدمہ چار ارکان پر مشتمل ہوتا ہے۔ ۱۔ مدعی ۔ ۲۔ مدعا علیہ ۔ ۳۔ دعوی ۔ ۴۔ گواہ ۔ اب اگر میاں بیوی میں لعان کی یہ کارروائی محض شاہد اور شاہدہ کی حیثیت سے ہے تو مدعی اور مدعا علیہ کون ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ لعان میں گواہ ہوتے ہی نہیں ہیں لعان میں میاں بیوی

شاہد اور شاہدہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں اسی لئے تو اسے زنا اور قذف کے مقدمات سے علیحدہ پوزیشن دی گئی ہے۔ یہاں میاں اور بیوی، مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے آتے ہیں۔ ایک فریق۔ ایک متعین الزام کی صورت میں ایک "دعویٰ" پیش کرتا ہے دوسرا فریق اس "دعوے" کی تردید و تکذیب کرتا ہے اور دونوں طرف سے اس کارروائی میں جو "بیانات" دیئے جاتے ہیں وہ حقیقتاً "شہادتیں" نہیں بلکہ محض حلف اور قسمیں ہیں۔ خود محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

"لعان اور وصیت کے سلسلے میں تو انہیں شہادت سے تعبیر فرمانا محض مجاز ہے ورنہ حقیقت میں وہ شہادتیں نہیں بلکہ قسمیں ہیں"
(فقہ القرآن ج ۳ ص ۸۷)

"یہ شہادتیں نہیں ہیں بلکہ قسمیں ہیں مگر قرآن نے ان کو بھی (مجازاً) شہادتیں ہی کہا ہے" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۸۷)

اب ظاہر ہے کہ لعان کی شہادتوں کو (جو دراصل قسمیں ہیں) دیگر عام مقدمات کی شہادتوں پر قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حال ان شہادتوں کا ہے جو وصیت کے متعلق سورۂ مائدہ کی آیات ۱۵۶ تا ۱۵۸ میں مذکور ہیں کیونکہ یہ بھی دراصل حلف اور قسمیں ہی ہیں۔ انہیں بھی عام عدالتی شہادتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

جناب پرویز صاحب اور مولانا عثمانی صاحب کی دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ وہ

(ب) **شہادت اور حلف میں فرق؟** لعان کی "شہادتوں" میں اور دیگر مقدمات کی شہادتوں میں قطعی فرق نہیں کرتے اور لعان کے مقدمہ کی "شہادات" کو دوسرے مقدمات کی شہادات پر قیاس کرتے ہیں۔ قرآن نے مرد اور عورت میں "شہادت" کے معاملے میں فرق کیا ہے "حلف" اور "قسم اٹھانے" کے معاملے میں قطعاً فرق نہیں کیا کیونکہ لعان کے معاملے میں جہاں "حلف اٹھانے" کا ذکر ہے وہاں مرد اور عورت مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت میں آتے ہیں جبکہ سورہ بقرہ والی آیت میں مرد اور عورت محض گواہ کی

حیثیت سے پیش ہوتے ہیں اس فرق کو پیش نظر نہ رکھنے کے باعث یہ لوگ لعان کی قسموں میں پائی جانے والی مساوات کو مالی مقدمات تک متعدی کر دیتے ہیں حالانکہ جہاں قرآن نے مساوات کو پیشِ نظر رکھا ہے وہ لعان کی "قسمیں" ہیں یہاں فریقین مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں قرآن نے مساوات کو لازم نہیں کیا وہ "گواہیاں" ہیں جو گواہوں کی حیثیت سے ادا ہوئی ہیں نہ کہ مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جہاں قرآن نے مساوات کو برقرار رکھا ہے وہاں پوزیشن اس سے مختلف ہے جہاں اس نے مساوات کو ترک کر دیا ہے۔ نہ معلوم جو لوگ قرآن کے مطلق کو مطلق رکھ کر اور مقید کو مقید رکھ کر احترامِ قرآن کا دم بھرتے ہیں انہیں احترامِ قرآن کا خیال اس وقت کیوں نہیں آتا جب وہ دو جداگانہ حیثیت اور نوعیت کے مقدمات میں فرق و امتیاز کو نظر انداز کر کے ایک کو دوسرے پر بے جا قیاس کرتے ہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ قرآن نے جس طرح مرد اور عورت کی شہادت میں فرق کو ملحوظ رکھا ہے اس طرح اس نے "قسموں" میں اس فرق کو کیوں پیشِ نظر نہیں رکھا؟ تو یہ بات "شہادت" اور "حلف" کی حیثیت جان لینے سے واضح ہو جاتی ہے۔

(ج) حلفِ لعان میں مساوات کیوں؟

شہادت ایک طویل ذہنی مصروفیت کا عمل ہے جو تین مراحل پر مشتمل ہے۔

اولاً، یہ کہ شاہد کسی واقعے کو بغور دیکھتا ہے یا اس کے متعلق کسی سے سنتا ہے کسی واقعے کے اس مشاہداتی یا سماعی مطالعے میں وہ واقعات کے تمام پہلوؤں کا گہری نظر سے جائزہ لیتا ہے تاکہ ادائے شہادت کے وقت وہ فریقِ مخالف کی جرح کا سامنا کر پائے۔

ثانیاً یہ کہ واقعات کے جملہ پہلوؤں کو بڑی حفاظت سے اپنے حافظے کے سٹور ہاؤس میں جمع رکھتا ہے اور اس کوشش میں رہتا ہے کہ کوئی پہلو نسیان یا ذہول کا شکار ہو کر حافظے سے خارج نہ ہو جائے حقیقت یہ ہے کہ یہ مرحلہ ذہنی مصروفیت اور محنت کے اعتبار سے پہلے مرحلے سے بھی شدید تر ہے۔

ثالثاً یہ کہ ادائے شہادت کے وقت شاہد عدالت میں قاضی کے سامنے ان معلومات کو جو اس نے حافظے میں سمیٹ کر رکھی ہوئی ہیں بلا کم و کاست پیش کر دے یہ مرحلہ سابقہ دونوں مراحل سے کٹھن تر ہے شاہد کو واقعات کی تمام کڑیاں، حافظے کے وسیع سٹور ہاؤس سے ایک خاص ترتیب کے ساتھ برآمد کرنی پڑتی ہیں اور سلسلہ واقعات کی تمام کڑیوں کو مناسب ترین الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرنا پڑتا ہے تاکہ جزئیات کو صحت اور صراحت کے ساتھ پیشِ عدالت کر دیا جائے اس طرح ادائے شہادت کے اس آخری مرحلے میں ذہن حافظے اور زبان کی سب قوتیں مل کر اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔

شہادت کے یہ مراحل اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ شہادت کا عمل باریک بینی پر مشاہداتی قوت، حافظے کی قوتِ استحضار اور ذہن و زبان کی قوتِ بیان کا تقاضا کرتا ہے عورت بہرحال اسی میدان میں مرد سے کمتر اور کمزور تر واقع ہوئی ہے وہ جزئیات کی کماحقہ صراحت نہیں کر سکتی اور بیان و کلام میں بھی غیر واضح رہ جاتی ہے (وھو فی الخصام غیر مبین) اس لئے ادائیگی شہادت میں اس کی فطری کمزوری کی رعایت رکھی جاتی ہے اور دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

اس کے برعکس "حلف" میں ذہنی مصروفیت کا یہ طویل عمل مفقود ہوتا ہے ہر فریق کو صرف ایک جملے میں اپنے موقف کو پیش کرنا ہوتا ہے مثلاً شوہر حلفیہ کہتا ہے کہ "میں اپنی بیوی پہ متعین الزام لگانے میں سچا ہوں اور وہ جھوٹی ہے"۔ اسی طرح عورت صرف ایک جملے میں حلفیہ بیان دیتی ہے کہ "میرا شوہر مجھ پر الزام لگانے میں جھوٹا ہے اور میں سچی ہوں"۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مختصر بیان میں، جس میں ہر فریق ایک متعین الزام کی تصدیق یا تردید کرتا ہے، ذہن دماغ، حافظے اور زبان کا کوئی لمبا سلسلۂ عمل وجود میں نہیں آتا اس لئے قرآن نے "شہادت" کے معاملے میں جو عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک مشکل عمل ہے فرق کیا ہے جبکہ "قسموں" کے معاملے میں جہاں سادہ سے انداز میں ایک الزام کی تصدیق یا تردید پیش نظر ہوتی ہے قرآن نے فرق نہیں کیا ہے۔

رہا ایک کی بجائے چار قسموں کا معاملہ! تو یہ دراصل معاملے کی اہمیت کے پیش نظر

ہے، ایک خدا ترس آدمی کے لئے جھوٹ بولنا بجائے خود بہت گراں گزرتا ہے کجا یہ کہ وہ جھوٹ بھی حلف کے ساتھ بولے اور حلف بھی ایک نہیں بلکہ اکٹھے چار اور سب سے آخر میں اللہ کے غضب و لعنت کی خود طلبی۔ یہ سب باتیں ایک متقی اور پرہیزگار شخص پر ایک پہاڑ اٹھانے سے بھی زیادہ وزنی کام ہے اب اگر وہ ایک ایک کر کے چار حلف اٹھاتا ہے تو خوب سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہے کہ اسے اپنے آپ کو خدا کی رحمت کا مستحق بنانا ہے یا لعنت کا حقیقت یہ ہے کہ ایک صاحبِ ایمان و تقویٰ شخص کا دل ایسے معاملات میں کانپ جاتا ہے۔

جناب پرویز صاحب اور مولانا عثمانی صاحب کے دلائل کا ہم بھرپور جائزہ لے چکے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ، ذہنی طور پر مغربی افکار سے بری طرح متاثر بلکہ مغلوب ہیں۔ مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے، اسلام کو کھلے طور پر چھوڑ بھی نہیں سکتے کہ اس کی ہمت ان میں نہیں ہے لیکن اس کی تعلیمات کو فکر و نظر کے اعتبار سے یہ لوگ ماننے کے لئے تیار بھی نہیں ہیں۔ اس لئے انہوں نے ماننے اور نہ ماننے کے درمیان یہ راہ اختیار کی ہے کہ مغربی افکار و اطوار کی روشنی میں اسلام ہی کی "مرمت" کر ڈالی جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے انکارِ حدیث کے بعد جب قرآن کا مطالعہ شروع کیا تو بجائے اس کے کہ اپنے نظریات کو تابعِ قرآن بناتے الٹا قرآن ہی کو اپنے افکار کی روشنی میں تاویل و تحریف کے خراد پر چڑھا دیا جس کے نتیجے میں وہ بزعم خویش

ع رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

۱۔ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے۔

۲۔ دو عورتوں کا حصۂ وراثت ایک مرد کے برابر ہے۔

۳۔ دو عورتوں کی شخصیت ایک مرد کے برابر ہے۔

ان تینوں جملوں پر غور فرمائیے ——— اور پھر ——— یہ ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ مولانا عثمانی صاحب اور جناب پرویز صاحب، دونوں پہلے جملے کا انکار کرتے ہیں، لیکن جو لوگ پہلے جملے کو مانتے ہیں ان پر یہ دونوں بزرگ تیسرے جملے کو ماننے کا بھی الزام عائد کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ لوگ پہلے جملے کو ماننے کے ساتھ ساتھ، تیسرے جملے کو ماننے کی تردید

اور نفی بھی کرتے ہیں لیکن یہ دونوں مہربان اپنا پورا زورِ بیان اپنے مخالفین کے خلاف صرف اس بات پر صرف کرتے ہیں کہ جو پہلے جملے کو مانتا ہے وہ تیسرے جملے کو بھی مانتا ہے مگر یہ دونوں بزرگ خود دوسرے جملے کے قائل ہیں اور تیسرے جملے کو نہ ماننے کی اسی طرح تردید کرتے ہیں جس طرح ان کے مخالفین کرتے ہیں۔

یہ عجیب طرزِ عمل ہے کہ یہ دونوں صاحبان اپنے مخالفین پر محض اس وجہ سے ایک الزام لگاتے ہیں کہ جو بات ان کے مخالفین نے تسلیم کی ہے وہ ان دونوں کو تسلیم نہیں ہے لیکن ویسی ہی ایک دوسری بات یہ خود بھی مانتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں یہ لوگ اس الزام کو خود اپنے سر لینے کے لئے تیار نہیں ہیں جو اپنے مخالفین کے سر تھوپ رہے ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جہاں تک عورت کی شخصیت کا تعلق ہے وہ از روئے قرآن مرد ہی کی طرح قابلِ احترام ہے۔ عزت واحترام کے اعتبار سے مرد اور عورت کی شخصیت میں قرآن نے کبھی اور کہیں فرق نہیں کیا۔ دونوں کو قابلِ عزت وتوقیر قرار دیا۔ دونوں انسانیت کے گل سرسبد ہیں دونوں ذرّیتِ آدم میں داخل ہیں دونوں عمارتِ تمدن کے معمار ہیں دونوں سفرِ حیات کے مسافر ہیں، دونوں کائنات کے مرکزی کردار ہیں اور دونوں انسانیت کے یکساں اجزاء ہیں۔

**عورت اور مرد ـــــ معزز ومحترم**

| | |
|---|---|
| يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (۴/۱) | اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ |

ایک اور مقام پر فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔

| | |
|---|---|
| فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ | سو ان کی دعا کو ان کے رب نے قبول کر لیا کہ میں تم میں سے کسی شخص کے کام کو اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت تم باہم |

مِنۢ بَعۡضٍ ۔ ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

تمدنی اصلاح اور معاشرتی فلاح وبہبود میں دونوں یکساں کردار ادا کرتے ہیں اگرچہ دونوں کا دائرۂ عمل مختلف اور جداگانہ ہے۔

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنَاتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ‌ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ (۹/۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں جو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں

صرف معاشرتی اصلاح ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی معاشرتی بگاڑ اور تمدنی فساد پیدا ہوا ہے، ہوتا ہے یا ہوگا اس کی ذمہ داری بھی دونوں اصنافِ بشر پر ہے۔

اَلۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ بَعۡضُهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ‌ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمُنۡكَرِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمَعۡرُوۡفِ (۹/۶۷) منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک دوسرے کے ہم رنگ ہیں جو برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں۔

جادۂ خیر اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی اہلیت بھی دونوں میں مشترک ہے۔

اِنَّ الۡمُسۡلِمِيۡنَ وَالۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡقٰنِتِيۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيۡنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالۡخٰشِعِيۡنَ وَالۡخٰشِعٰتِ وَالۡمُتَصَدِّقِيۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقٰتِ وَالصّٰٓئِمِيۡنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالۡحٰفِظِيۡنَ فُرُوۡجَهُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيۡنَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِيۡمًا ‏۝ (۳۳/۳۵) بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور بندگی کرنیوالے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت سہنے والے مرد اور محنت سہنے والی عورتیں اور دبے رہنے والے مرد اور دبی رہنے والی عورتیں اور خیرات کرنیوالے مرد اور خیرات کرنیوالی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور تھامنے والے مرد اپنی شہوت کی جگہ اور تھامنے والی عورتیں اور یاد کرنیوالے مرد اللہ کو بہت سا اور یاد کرنیوالی عورتیں رکھی ہے اللہ نے ان کے واسطے معافی اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

مردوں اور عورتوں کی شخصیتوں میں مساوات ایک ایسی حقیقت ہے جس

کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا لیکن دنیا کے اس دار الامتحان میں انسانیت کی ان دونوں اصناف میں بعض کمزوریاں بھی ہیں اور بعض خوبیاں بھی ہیں جن کے باعث دونوں کے دائرہ ہائے عمل مختلف ہو گئے ہیں۔ انہی کمزوریوں کی رعایت کرتے ہوئے بعض واجبات مرد پر سے ساقط کر دیئے گئے ہیں اور بعض وظائف عورت پر سے۔ بعض امور کی انجام دہی مرد کا ذمہ قرار پائی اور بعض امور کی سرانجام دہی فریضۂ خواتین قرار پائی، منجملہ ان ذمہ داریوں کے جو عورت پر سے ساقط کر دی گئیں ایک ادائیگیٔ شہادت کی ذمہ داری ہے جسے جملہ معاملات سے سمٹا کر محض معاشی لین دین کی حد تک محدود کر کے بحالتِ مجبوری (دو مردوں کی عدم موجودگی میں) ایک مرد اور ایک عورت کے ساتھ گوارا کیا گیا ہے عورت اور مرد کی شخصیتوں کی مساوات کے کھلے کھلے اعتراف کے ساتھ اس کی واقعی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے اسے عدالتی ہنگاموں سے دُور رکھنا کوئی ظلم نہیں ہے جو عورت پر کیا گیا ہے۔ اور نہ یہ کوئی توہین و تذلیل ہے جو اس سے روا رکھی گئی ہے بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کا بوجھ اگر عورت پر لاد دیا جائے تو اس میں خود اس کا بھی نقصان ہے اور تمدن کا بھی خسارہ ہے عورت گھر کی چار دیواری سے نکل کر اپنے فطری وظائف (حمل، پیدائش، پرورش و تربیتِ اطفال) سے تو بہر صورت نجات نہیں پا سکتی البتہ اس کے اوپر بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ جس سے تمدن کے قوام میں ایسا بگاڑ اور فساد رُونما ہوگا جس کی اصلاح کی ہر تدبیر معاشرتی شکست و ریخت کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دے گی۔

**عورت کے ترکِ خانہ کے مفاسد**

مغربی تہذیب کا المیہ ہمارے لئے باعث عبرت و موعظت ہے عورت گھر سے نکلی تو گھر کا سکون بھی ساتھ ہی نکل گیا، ہنستے بستے گھر اُجڑ کر رہ گئے مادی راحت و آرام کے سارے لوازمات گھر میں موجود ہیں مگر وہ ہستی جس کے دم سے دنیا راحت ہے، موجود نہیں تو گھر جائے سکون اور مسکن اور مامن نہ رہے خاتونِ خانہ کے گھر سے نکلنے کے بعد اس کی فطری ذمہ داریوں پر بیرونِ در کی ذمہ داریوں کا جو اضافہ ہوا وہ تو خیر الگ رہا جب وہ گھر سے نکلی تو اس کے لئے کوئی قوّام (نگران و محافظ) نہ رہا جو اس کے معاشی اخراجات کا بوجھ اٹھاتا اس آزادی کے طفیل اب ایسے

خود کمانا پڑا، قطع نظر اس کے کہ وہ کسی آبرومندانہ طریقے سے کمائے یا اخلاق سوز طریقے سے۔ اختلاطِ مرد و زن کی اس سوسائٹی میں صنف مخالف کے لئے زیادہ سے زیادہ پُرکشش جاذبِ نظر حسین وجمیل اور "دلکش تتلیاں" بننے کی خاطر نت نئے قیمتی ملبوسات گرانقدر سامانِ آرائش وزیبائش کے بھاری مصارف کا بوجھ بھی اٹھانا پڑا۔

زنا اور دیگر فواحش و معاصی کا ایسا سیلاب امڈ آیا کہ پیرو جوان تو رہے ایک طرف کمسن بچے تک اس کی لپیٹ میں آگئے اخلاقی اقدار کا جو جنازہ نکلا اس کا ذکر ہی نہ کیجئے کیونکہ مادّی منڈی میں "اخلاق" ویسے ہی جنس کاسد بن کر رہ جاتا ہے، زنا کی بدولت "کنواری ماؤں" کی بہتات ہوگئی، جنسی امراض وبار کی طرح عام ہوگئے یہ بات جاننا کوئی مشکل نہیں کہ مخلوط سوسائٹی میں جہاں ہر قدم پر صنفی جذبات کی تسکین کے مواقع میسر ہوں تو آخر شوہر کو بیوی کی اور بیوی کو شوہر کی حاجت کیا باقی رہ جاتی ہے؟ وہ کیوں تاعمر ایک دوسرے سے بندھے رہیں۔ چنانچہ نوبت بایں جا رسید کہ ازدواجی زندگی مرد و زن میں سے ہر ایک کے لئے ایک ناروا بوجھ اور بے جا پابندی بن گئی جس سے آزاد ہونے کی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا نتیجتاً ازدواجی وفاداریاں دم توڑتی چلی گئیں۔

پھر عورت کے خروج سے تربیتِ اطفال کا ایک اور مسئلہ پیدا ہوا کیونکہ بچوں کی ماں اگر چراغِ خانہ بن کر رہتی تو اپنے نورِ تربیت سے انہیں نوازتی رہتی مگر جب وہ شمع محفل بنی تو بچے ماں کی تربیت و پرورش سے محروم ہو گئے بچوں کی تربیت کا احساس شائد گھر سے نکلی ہوئی ماں کو واپس لے آتا مگر ماحول میں روز افزوں بڑھتی ہوئی جنسی آتش اور ذوقِ آوارگی نے اسے واپس نہ آنے دیا بچوں کو پالنے پوسنے کے لئے پرورش گاہیں تعمیر کی گئیں، شیرِ مادر کی فطری غذا کی جگہ ڈبوں کے مصنوعی دودھ نے لے لی، حقیقی ماں کی جگہ پُر کرنے کے لئے کرائے کی "ماؤں" کو بھرتی کیا گیا۔ گھر کی انفرادی توجہ سے بچوں کی نگہداشت اور پرداخت کی بجائے اب ان "آدم ساز فیکٹریوں" میں "ٹھیکے" پر "تعمیر انسانیت" کا کام کیا جانے لگا۔

بچے ان اداروں سے فطری اور انفرادی شخصیتوں کی بجائے یوں مصنوعی اور اجتماعی

شخصیتیں لے کر برآمد ہوئے کہ گویا وہ انسان نہیں، باٹا کے جوتے ہیں جو کمپنی سے ایک جیسی شکل لے کر باہر آرہے ہیں ان پرورش گاہوں میں بچے پیدا ہوتے ہی پہنچا دیئے جاتے ہیں جہاں ان کے علائق و روابط اپنے رشتہ داروں سے تو درکنار، اپنے حقیقی والدین تک سے کماحقہ قائم نہیں ہو پاتے جس بچے کو شعور کی آنکھ کھولتے ہی نرسنگ ہومز (NURSING HOMES) میں اپنے والدین اور اعزہ و اقرباء کی بجائے کرائے پر فراہم کی گئی "مصنوعی مائیں" اور "مصنوعی فادر" نظر آئیں اسے اپنے اعزاء، واقرباء اور والدین سے کیا محبت، الفت، ہمدردی، موانست اور غمگساری ہو سکتی ہے۔

خیر! ان چیزوں کو چھوڑیئے کہ آج "عقلی ارتقاء" کے اس روشن دور میں ان "جذباتی رشتوں" کو کون پوچھتا ہے۔ سوچیئے اس بات پر کہ کرائے کی مائیں تو مل سکتی ہیں اور مل رہی ہیں مگر ان میں ایک حقیقی ماں کی شفقت، محبت، خیر خواہی ایثار و قربانی اور مامتا کے جذبات کون پیدا کرے گا یہی وجہ ہے کہ ان بچوں کی ذہنی، جذباتی، نفسیاتی اور اخلاقی نشوونما میں ایسی خامیاں رہ جاتی ہیں جن کی بناء پر ان میں (ابتدائی عرصہ حیات ہی سے) جرائم کی بہتات کا تناسب اس قدر زیادہ ہے کہ اب وہاں مفکرین اور سماجی مصلحین بھی اپنی نوخیز نسلوں میں جرائم پیشہ رجحانات کو دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں لیکن اب پانی سر سے گزر چکا ہے اب وہاں کی عورت "آزاد" ہو چکی ہے وہ جب اور جہاں چاہے بوائے فرینڈ بنا سکتی ہے جب چاہے "کنواری ماں" کا اعزاز پا سکتی ہے، وہ "آزاد" ہے جس کے لئے چاہے وجہ سکون بن جائے اور اپنے نگینۂ عصمت کو منڈی کا مال بنا دے۔

—— سوال یہ ہے کہ مغرب میں —— اخلاقی اقدار کے دم توڑ دینے —— گھروں کے اجڑ جانے —— ازدواجی وفاداریوں کے ختم ہو جانے —— زنا کے عام ہونے —— جنسی امراض کے بڑھ جانے —— بچوں اور والدین کے باہمی روابط کٹ جانے —— اور —— موجودہ تربیت کے نتیجے میں، بچوں کے جرائم پیشہ بن جانے اور ان کی شخصیتوں کے ناقص رہ جانے کے —— اسباب کیا ہیں؟ آپ جتنا بھی غور فرمائیں اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مسائل کا یہ خارزار صرف ایک جڑ سے پھوٹا اور

**ان مفاسد کی جڑ کیا ہے؟**

پھیلتا چلا گیا ہے ـــــ اور وہ ہے عورت کا درونِ خانہ سے بیرونِ خانہ امور میں داخل ہو جانا۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت کا فطری میدانِ عمل بیرونِ خانہ نہیں بلکہ اندرونِ خانہ واقع ہے اسلام کی نگاہ میں وہ شمع محفل نہیں چراغِ خانہ ہے، اس کی صلاحیتیں اور استعدادیں گھر کی چار دیواری میں تربیتِ اطفال کے لئے اور امور خانہ کی سرانجام دہی کے لئے امانت ہیں اس کی یہ صلاحیتیں، استعدادیں، قویٰ اور خوبیاں تاریکئ خانہ کو کافور کرنے کے لئے ہیں تاکہ اس کے نتیجے میں معاشرہ خود بخود اور بالواسطہ منور ہو جائے۔

**عثمانی و پرویز کی ایک اور غلط روی!**

جناب پرویز صاحب اور مولانا عثمانی صاحب جب "شہادتِ نسواں" پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ "خبر" اور "شہادت" کے درمیان جو نازک فرق ہے اسے ملحوظ خاطر نہیں رکھتے جس کے باعث وہ خود بھی الجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھاتے ہیں۔

**خبر و شہادت کا فرق**

احاطۂ عدالت سے باہر کسی صنفِ بشر کا کسی واقعے کی اطلاع دینا "خبر" کہلاتا ہے جبکہ عدالت میں کسی جج کے روبرو، کسی چشم دید واقعے کی (گواہی کی نیت سے) اطلاع دینا "شہادت" کہلاتا ہے خبر دینے میں نصابِ خبر (تعداد مخبرین و جنس مخبرین) کی کوئی قید و پابندی نہیں ہے جبکہ ادائے شہادت میں ہر معاملہ و مقدمہ میں باقاعدہ نصاب مقرر ہے۔ خبر کے سلسلے میں بعض اہل علم کے نزدیک مخبرین کے لئے کوئی اوصاف مقرر نہیں ہیں فاسق و فاجر اور عادل و صادق آدمی بھی مخبر بن کر کوئی اطلاع دے سکتا ہے جبکہ گواہوں کے لئے باقاعدہ اوصاف مقرر ہیں بعض لوگ اسلام، عقل، عدالت، ضبط الخبر اور ذاتی مشاہدہ کے اوصاف کو مخبرین کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں جبکہ وہ "شہادت" کو "خبر" سے خاص تر کرتے ہوئے، شاہدین کے لئے حریت، ذکوریت اور تعدد شہداء کو اضافی اوصاف قرار دیتے ہیں۔

خبر اور شہادت کے اس فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے مولانا عثمانی صاحب نے جن واقعات سے استدلال و استشہاد فرمایا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی واقعہ بھی ان کے

موقف کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہم ذیل میں ان کے "دلائل" کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۱) مولانا عثمانی صاحب محترم، علوی دور کے ایک واقعے کو دلیل بناتے ہوئے

**علوی دَور کی نظیر اور اس کی حقیقت** ارشاد فرماتے ہیں کہ

"چاروں خواتین نے حضرت علی کے سامنے شہادت دی کہ فلاں عورت نے فلاں بچہ کو پیروں سے روند کر ہلاک کر دیا تو آپ نے ان کی شہادت قبول فرمائی ایک دوسرا واقعہ ہند بنت طلق بیان کرتی ہیں کہ ہم چند عورتیں ایک جگہ تھیں، وہیں ایک جگہ ایک بچہ کپڑے میں ڈھکا ہوا پڑا تھا ایک عورت نے ادھر سے گزرتے ہوئے اسے اپنے پیروں سے روند ڈالا بچہ کی ماں نے دعویٰ کیا کہ فلاں عورت نے میرے بچے کو ہلاک کر دیا ہے اس کی گواہی حضرت علیؓ کے سامنے دس عورتوں نے دی جن میں میں بھی شامل تھی تو حضرت علی نے اس عورت کے خلاف دیت (خون بہا) کا فیصلہ فرما دیا۔"

(فقہ القرآن ج ۲ ص ۱۰۲)

یہ دونوں روایات صاف بتاتی ہیں کہ یہاں مرد گواہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا جو وقوعہ کا عینی شاہد قرار پاتا محض عورتیں ہی عورتیں تھیں اور اس بات پر اُمّت کا اجماع ہے کہ جس بات یا معاملے پر مرد مطلع نہ ہو پائے ہوں محض عورتوں ہی کو اس کا علم ہو تو ایسے معاملات میں خواتین کی شہادت بلا اختلاف قابل قبول ہوتی ہے مولانا عثمانی صاحب کے حق میں یہ روایات صرف اس صورت میں دلیل قرار پا سکتی ہیں جبکہ یہاں مرد اور عورتیں مساوی تعداد میں گواہ ہوتے لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

(۲) محترم عثمانی صاحب کی دوسری دلیل وہ واقعہ ہے جو دَورِ فاروقی میں

**نظیر دورِ فاروقی کی حقیقت** وقوع پذیر ہوا۔

"ایک روایت میں ہے کہ چار عورتوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے شہادت دی کہ فلاں شخص نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی چنانچہ آپ نے بیوی کو شوہر سے جدا کر دیا۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۰۳)

یہاں بھی معاملہ وہی ہے مرد گواہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ شوہر کے طلاق دینے کا معاملہ صرف خواتین ہی کو معلوم ہے اس لئے انہوں نے شہادت دیدی، اب ظاہر ہے کہ جہاں حقیقتِ حال کا علم صرف عورتوں ہی کی حد تک محدود ہو وہاں وہی گواہ قرار پا سکتی ہیں۔ نہ معلوم محترم عثمانی صاحب کو یہ کس نے بتا دیا ہے کہ "عورت سرے سے گواہ ہو ہی نہیں سکتی خواہ کیسا اور کوئی سا بھی معاملہ ہو۔"

صرف یہی دو واقعات پورے چالیس سالہ دورِ خلافت راشدہ اور عہدِ نبویؐ میں صاحبِ "فقہ القرآن" کو مل سکے جس کو انہوں نے اپنے موقف کی دلیل بنا لیا۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ان میں ان کے لئے قطعاً کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ دورِ صحابہ میں یہ دونوں عدالتی فیصلے جن کے خلاف کسی صحابئ رسول کی کوئی آواز نہیں اٹھی بجائے خود اس امر پہ اجماع صحابہ کی دلیل ہے کہ "جس معاملے میں حقیقت حال کا علم صرف خواتین ہی کو ہو اور مرد گواہ میسر نہ ہو وہاں خواتین ہی گواہ بن کر عدالت میں شہادت دیں گی۔"

اب ہم محترم عثمانی صاحب کی ایک ایسی دلیل کی حقیقت واضح کرتے ہیں

**قتلِ عثمان اور شہادتِ نسوان** جس کو انہوں نے بڑے زور شور سے تقریباً آٹھ صفحات پر پھیلا کر پیش کیا ہے اس دلیل کے متعلق ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس سے "شہادت نسواں" پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے، چنانچہ وہ ـــــ "حدود و قصاص میں عورت کی شہادت قبول کرنے پر صحابہ کا اجماع" ـــــ کے الفاظ سے ایک چونکا دینے والی سرخی قائم کر کے رقمطراز ہیں:

"نامناسب نہ ہوگا کہ اس مقام پر میں تاریخِ اسلام کے ایک اہم واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا چلوں جس کی بنیاد پر چودہ سو سال سے آج تک امتِ مسلمہ دو دھڑوں میں بٹتی چلی آ رہی ہے چنانچہ مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان ذوالنورینؓ خلیفۂ سوم کے خلاف مصر، بصرہ اور کوفہ کے تین ہزار باغیوں نے شورش برپا کی اور خلیفۂ مظلوم کو

شہید کر دیا وہ اپنے بالاخانے میں جمعہ کے دن تلاوتِ قرآن کریم میں مصروف تھے جو صحابہ اور جاں نثار خدام مکان کے نچلے حصے میں آپ کی حفاظت کے لئے موجود تھے ان سب کو آپ نے واپس کر دیا۔۔۔۔۔یہاں تک کہ گھر میں آپ اور آپ کی زوجہ محترمہ حضرت نائلہ (امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کی ہمشیرہ) ہی موجود تھے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۰۵-۱۰۶)

پھر شہادتِ عثمان کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"یہ ساری تفصیلات جو حضرت عثمان کے گھر میں پیش آئیں کس نے بیان کیں؟ ان کا شاہد کون تھا؟ سوائے ایک حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا کے اس وقوعہ کا دیکھنے والا کون تھا؟ اگر کوئی اور بھی تھا تو اس نے مدافعت کر کے اپنی کتنی انگلیاں کٹوائیں؟" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۰۸)

اس کے بعد پھر طولِ بحث کو اختیار کرتے ہیں اور نتیجۂ بحث کو یوں ظاہر فرماتے ہیں

"ملاحظہ ہو ایک طرف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک جم غفیر قصاص کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف حضرت علی اور ان کے تمام ہمنوا صحابہ اس مطالبہ کو صحیح مان کر عذر یہ پیش کر رہے ہیں کہ ابھی خلافت مستحکم نہیں ہوئی باغیوں کا زور ہے ہم قصاص نہیں لے سکتے جونہی حالات درست ہوں گے اور ہمیں قصاص لینے کی قدرت حاصل ہو گی ہم ضرور قصاص لیں گے لیکن امن و امان قائم ہو جانے کا انتظار فرمائیے یعنی دونوں فریق قصاص میں صرف ایک عورت (حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا) کے بیان پر قصاص کو صحیح قرار دے رہے ہیں اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ صحابہ کرام کا اجماع حقیقی نہیں تھا کہ قصاص میں صرف ایک عورت کی شہادت قبول کی جانی چاہیئے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۱۱)

محترم عثمانی صاحب کے اس طرزِ استدلال، اندازِ استنباط اور "اجماعِ حقیقی" پر ہم اس کے سوا کیا تبصرہ کریں کہ ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

بندۂ خدا! جب حضرت علی کو قصاص کی عدالتی چارہ جوئی پر قدرت ہی حاصل نہ ہو پائی تھی اور وہ کوئی عدالت قائم ہی نہ کر پائے تھے مدعی اور مدعا علیہ اپنا دعویٰ دائر کرنے اور اس کے مقابل جوابدہ ہونے کی پوزیشن میں آئے ہی نہیں، شہادتوں کو طلب کیا ہی نہ جا سکا تو حضرت نائلہ کی "عدالتی شہادت" پر اجماع کب کہاں اور کیسے منعقد ہو گیا؟ نہ مدعی کا وجود، نہ مدعا علیہ کا وجود، نہ دعویٰ کی دائرگی، نہ عدالت کا وجود، نہ کسی قاضی کی تقرری، نہ مقدمہ کی سماعت کا وجود لیکن "شہادتِ نسواں" پر صحابۂ کرامؓ کا اجماع اور وہ بھی "اجماع حقیقی"!!

ع تعجب پر تعجب ہے اچنبھے پر اچنبھا ہے

حضور! "شہادتِ نسواں" پر اجماع ثابت کرنے سے پہلے عدالت، دعویٰ مدعی، مدعا علیہ اور قاضی کا وجود تو ثابت کیجئے۔

پھر آپ سارے معاملے کی بنیاد حضرت نائلہ کی "شہادت" پر رکھتے ہیں کیا اگر کوئی عدالت اس کیس کی سماعت کرتی تو مجرمین و قاتلینِ عثمان میں سے کوئی بھی عدالت میں کھینچ کر نہ لایا جاتا؟ صرف حضرت نائلہ ہی کو بلایا جاتا؟ کیا محمد بن ابی بکر کو عدالت میں پیش نہ کیا جاتا؟ کیا کنانہ بن بشر کو (جس نے خلیفۂ مظلوم کو ان کی پیشانی پر لوہے کی لاٹ مار کر گرا دیا تھا) عدالت نہ پوچھتی؟ کیا سودان بن حمران کو (جس نے خلیفۂ ثالث پر دوسری کاری ضرب لگائی تھی) عدالت بازپرس کے لئے نہ بلاتی؟ اور کیا سنگدل عمرو بن الحمق (جو سینۂ عثمان پر چڑھ کر مرتکب قتل ہوا) عدالت کی پوچھ گچھ سے بچ رہتا؟ کیا یہ تمام مجرمین و مفسدین روئے زمین پر موجود نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عدالت قائم ہوتی تو ضابطے کی پوری کارروائی عمل میں آتی اور اس "شہادتِ نسواں" کی واقعی حیثیت نکھر کر سامنے آجاتی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دلیل پکڑی جاتی ہے اس واقعے سے جس میں عدالت کے عملاً قائم کرنے اور عدالتی کارروائی کے روبعمل آنے کی نوبت

ہی نہیں آئی۔

ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اگر "شہادت" اور "خبر" کا فرق مولانائے محترم کے پیشِ نظر ہوتا تو وہ ایسا کمزور استدلال نہ فرماتے۔ حقیقت یہ ہے حضرت نائلہ سے واقعات کی جو اطلاع صحابہ کو ملی اس کی نوعیت "عدالتی شہادت" کی نہیں بلکہ "خبر" کی ہے۔

تاہم اگر بر سبیل تنزل حضرت نائلہ کی اس خبر و اطلاع کو "عدالتی شہادت" مان بھی لیا جائے تب بھی اس میں محترم عثمانی صاحب کے موقف کی دلیل موجود نہیں ہے کیونکہ وقوعہ کے وقت سرے سے کوئی مردِ گواہ موجود ہی نہیں تھا۔ یہ بات پہلے بارہا بیان ہو چکی ہے کہ اگر جائے واردات پر کوئی مرد گواہ موجود نہ ہو اور عورت ہی تن تنہا موجود ہو تو وہی گواہ بن سکتی ہے لیکن اس سے بہرحال یہ بات پھر بھی ثابت نہیں ہوتی کہ عورت کی گواہی مرد کی گواہی کے برابر ہے۔

مولانا عثمانی صاحب اس واقعہ کو "شہادتِ نسواں" کی ایسی دلیل قرار دیتے ہیں جس پر صحابہ کا "اجماعِ حقیقی" قائم ہو چکا ہے۔

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

یہ اگر "حقیقی اجماع" ہے بھی تو اس پر نہیں کہ "عورت کی گواہی مرد کی گواہی کے برابر ہے" اور نہ ہی اس بات پر ہے کہ — "خواتین ہر حالت میں قتل و قصاص کے مقدمات میں گواہ بن سکتی ہیں" — بلکہ یہ صرف اس امر پہ ہے کہ "جہاں جائے واردات پر مرد موجود نہ ہوں اور تنہا خواتین ہی موقعہ کی گواہ ہوں وہاں وہی عدالتی گواہ بن سکتی ہیں"۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ واقعہ زیر بحث میں تو صرف عورت کی "خبر" پر ہی اجماع قرار پاتا ہے۔ "عدالتی شہادت" پر نہیں۔

نامناسب نہ ہو گا اگر ہم خواتینِ عہدِ نبوی کے ان واقعات پر بھی مختصر سا تبصرہ کر دیں جن کا تعلق جنگی امور میں شرکت سے ہے اگرچہ "شہادتِ نسواں" سے ان واقعات کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اخبارات میں انہیں اس بات کے

"جواز" کے لئے بطور دلیل پیش کر دیا جاتا ہے کہ اسلام نے خواتین کے میدانِ عمل کو گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اسے "آزادی" دی ہے کہ وہ مغربی عورت کی طرح مرد کے شانہ بشانہ ہر شعبۂ زندگی میں ہم قدم و ہمرکاب ہو سکے حتیٰ کہ وہ جنگ کے میدان میں بھی مرد کے ساتھ شریکِ حرب و قتال بن سکتی ہے۔

خواتینِ عہدِ نبوی اور حرب و قتال

یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں ہے کہ جنگ کا زمانہ ایک ہنگامی زمانہ ہوتا ہے جب جنگ کے بادل پوری قوم پر امڈ آتے ہیں تو ہر مرد و زن اور پیر و جوان کا یہ فرض ہے کہ ملک کے دفاع میں مقدور بھر حصہ لے جنگی دور میں تمام افرادِ امت کی قوتیں دفاعِ وطن پر صرف ہوتی ہیں ایسے ہنگامی حالات میں خواتین اسلام بھی مجاہدین کے ساتھ شریکِ معرکہ ہو کر اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں، بشرطیکہ معرکۂ کارزار میں یہ فوج پر گراں ثابت ہونے کی بجائے لشکرِ اسلام کے لئے ممد و معاون ثابت ہوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں عورتیں اسی حیثیت سے محاذِ جنگ پر حاضر ہوا کرتی تھیں، نزولِ حکم حجاب سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اسلام کی بیٹیاں عساکرِ اسلامی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے پانی پلانے اور کھانا پکانے کی خدمات سرانجام دیا کرتی تھیں۔ لیکن بہرحال یہ حققیت ہر ایک پر عیاں تھی کہ عورت بنیادی طور پر ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے کردار کے ذریعے اسلامی تمدن کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ معرکۂ کارزار میں دشمنوں کا سر کاٹنے اور خون بہانے کے لئے ہر گز نہیں عہدِ نبویؐ کی عورتیں مسلم سپاہ کے لئے خورد و نوش کا بندوبست کرنے یا مجروحین کی مرہم پٹی کے لئے ہی شریکِ جنگ ہوا کرتی تھیں بخاری میں یہ مذکور ہے کہ جنگِ اُحد[1] میں حضرت عائشہؓ اور ام سلیم رضی اللہ عنہما اپنی کمر پر پانی کے مشکیزے اٹھا اٹھا کر لاتی تھیں اور سپاہیوں کو پانی پلاتی تھیں اس دوڑ دھوپ میں جب وہ اپنے پائینچے اٹھاتیں تو پنڈلیوں کا زیریں حصہ کھل جاتا تھا اسی طرح حضرت ام سلیط رضی اللہ عنہا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں سرگرم رہیں دیگر خواتین

---

[1] یاد رہے کہ جنگ احد تک احکامِ حجاب کا نزول نہیں ہوا تھا۔

کے ساتھ حضرت ربیع بنت معوذ بھی زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہی تھیں۔ نیز بعض مجروحین کو مدینہ پہنچانے کا کام بھی بعض خواتین ہی نے انجام دیا تھا ام عطیہؓ کے متعلق روایات میں یہ مذکور ہے کہ وہ سات جنگوں میں شریک ہوئی تھیں اور ان کی ذمہ داری میں کھانا تیار کرنا کیمپ کی حفاظت کرنا زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا اور بیماروں کی تیمارداری کرنا شامل تھا ایسی خواتین کو مال غنیمت میں سے حصہ پانے کا بھی مستحق گردانا جاتا تھا۔

بہرحال ان واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ عورت کا دائرۂ کار گھر کی چار دیواری ہے تاہم جب (ہنگامی حالات میں) ملکی دفاع کے ناگزیر تقاضے پکار رہے ہوں تو عورت ان نادر حالات میں وہ خدمات بھی بجا لاسکتی ہے جو قرونِ اولیٰ کی مسلم خواتین نے سرانجام دی تھیں۔ ایسے حالات میں حدود و حجاب میں تخفیف سے بھی کام لیا جاسکتا ہے اسلام کا پردہ کوئی جاہلانہ منجمد رسم نہیں ہے جس میں اقتضاءِ حالات کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔

لیکن یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ ہنگامی حالات کے اندر بھی ہمیں اسی قدر آزادی برتنے کی اجازت ہے جس قدر کہ حضرت مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں صدر اول کی اِن معزز خواتین کے اسوۂ حسنہ سے ثابت ہے ہمارے ہاں کے تجدد پسند اور مغرب زدہ طبقے (ہنگامی حالات کے) انہی واقعات کو بنیاد بنا کر "آزادئ نسواں" کی وہ عمارت تعمیر کرتے ہیں جس کا پورا نقشہ، مقصد، مزاج اور رُخ سب کچھ تہذیبِ مغرب نے طے کیا ہے۔ گویا اسلام جہاں پہنچ کر رک جاتا ہے یہ لوگ وہیں سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں اسلامی اور مغربی تہذیب میں عملاً کوئی حدِ فاصل قائم ہی نہیں رہتی۔

اب "شہادت نسواں" کی اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم مناسب سمجھتے ہیں

**مسئلہ شہادتِ نسواں کا خلاصہ** کہ اس مسئلے کی حدود و قیود کا خلاصہ پیش کر دیں۔

اسلام میں شہادت کے چار درجے ہیں۔

**پہلا درجہ** ــــــ زنا اور بدکاری کے حدود سے متعلق ہے اس میں

چار مردوں کی گواہی قابل قبول ہے عورتوں کی گواہی غیر مقبول ہے۔

دوسرا درجہ ــــــ قتل و قصاص کی حدود سے متعلق ہے اس میں بھی صرف مردوں ہی کی گواہی مطلوبِ شریعت ہے۔

تیسرا درجہ ــــــ نکاح و طلاق اور دیگر مالی معاملات سے متعلق ہے یہاں اگر دو مرد گواہ نہ مل پائیں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت قابلِ قبول ہے۔

چوتھا درجہ ــــــ ان معاملات سے تعلق رکھتا ہے جو :۔

(الف) عورتوں کے مخصوص مسائل پر مشتمل ہو۔

(ب) ان واقعات پر مشتمل ہو جن میں مردوں کو اطلاع نہ ہو پائی ہو اور صرف عورتیں ہی واقعات کا حقیقی علم رکھتی ہوں۔ ایسے تمام معاملات میں عورت گواہ قرار پا سکتی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ آخر میں ہم چودہ سو سالہ فقہی ریکارڈ بھی پیش کریں تاکہ قارئین کرام یہ جان لیں کہ پوری امت کے جید علماء ہر دور میں "شہادت نسواں" کی اسی حیثیت کو تسلیم کرتے رہے ہیں جو ہم نے پیش کی ہے لیکن ہم اس سے صرف اس لئے صرفِ نظر کر رہے ہیں کہ جناب پرویز صاحب ان فتاویٰ کو یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ

"یہ قوانینِ شریعت مردوں کے بنائے ہوئے ہیں اس لئے ان میں مردوں کو ہر حال میں بالا دست رکھا گیا ہے اور عورت بیچاری کو کچل دیا گیا ہے۔"

(طاہرہ کے نام ص۳۱)

اس لئے ہم آخر میں محترم مولانا عثمانی صاحب اور جناب پرویز صاحب ہی کے چند اقتباسات ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ اول الذکر رقمطراز ہیں۔

**اعترافِ حقیقت**

"اسلام نے مردوں اور عورتوں کے دائرہ ہائے کار کا تعین کر دیا ہے مردوں کا کام بیرونِ خانہ اکتسابِ رزق کی تگ و دو اور جد و جہد قرار دیا گیا ہے اور عورتوں کا کام اندرونِ خانہ افزائش نسل، اولاد کی پرورش،

غور و پرداخت ان کی تربیت اور امورِ خانہ کی دیکھ بھال قرار دیا گیا ہے اس کے ذمہ نہ کسی کا نان و نفقہ ہے اور نہ اخراجات زندگی کا حصول ہے یہ کام مردوں کا ہے قرض کا لین دین ظاہر ہے وہی کرے گا جسے نقد رقم کی ضرورت ہوگی عورتوں کو اس کی ضرورت عموماً لاحق نہیں ہوتی اسے تو بیٹھے بٹھائے گھر میں اس کا باپ شوہر رقم مہیا کر کے دیتا ہے اور وہ اس رقم سے گھر کا سارا نظام چلاتی ہے اس کا باپ یا شوہر کما کر لائے یا کسی سے قرض ادھار لے بہرحال قرض کا لین دین عموماً عورت کے دائرہ کار میں آتا ہی نہیں۔

یہ اصول بالکل فطری ہے کہ آدمی کو اپنے دائرۂ کار ہی میں دلچسپی ہوتی ہے اور اسی میں اس کا ذہن چلتا ہے ایک آرٹس کے طالب علم سے جو بی اے کی کلاس پڑھ رہا ہے آپ یہ توقع قائم ہی نہیں کر سکتے کہ وہ بی ایس سی کی فزکس یا کیمسٹری کا کوئی فارمولا آپ کو سمجھا سکے یا ایک بی ایس سی اسٹوڈنٹس سے آپ دیوانِ غالب سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیں تو یہ توقع محض بیجا ہوگی ایک لاگریجویٹ سے آپ کسی عمارت کا نقشہ نہیں بنوا سکتے اور ایک کوالیفائیڈ انجینیئر سے آپ قانونی موشگافیوں کی توقع نہیں کر سکتے ہر آدمی کا ذہن اپنے دائرۂ کار ہی میں چلتا ہے اس کے باہر وہ اور ایک جاہل اجڈ برابر ہی ہوتے ہیں لہٰذا عورتوں کا ذہن مالی لین دین اور قرض و ادھار کے معاملات میں ظاہر ہے کہ مردوں کی طرح نہیں چل سکتا۔ جیسا کہ آپ مردوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ گھریلو معاملات کو بہتر طور پر حل کر سکیں گے اسی طرح عورتوں سے یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ وہ بیرونِ خانہ اقتصادی معاملات کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکتی سمجھا سکتی اور حل کر سکتی ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۵)

مولانا عثمانی صاحب کا یہ طویل اقتباس دو باتوں کو بالکل واضح طور پر بیان کرتا

ہے اولاً یہ کہ عورت کا دائرہ عمل گھر کی چار دیواری ہے اور گھر سے باہر کے معاملات کو نمٹانا مرد کا فریضہ ہے۔

ثانیاً یہ کہ عورتوں کا ذہن مالی لین دین اور قرض و ادھار کے معاملات میں مردوں کی طرح نہیں چل سکتا وہ اس معاملے میں فطرتاً مرد سے کمزور تر واقع ہوئی ہیں۔

جب عورت کے ذہن کا حال یہ ہے تو وہ حدود و قصاص اور زنا و بدکاری کے مقدمات میں تو کجا محض مالی معاملات میں بھی ایک کامیاب گواہ کا کردار ادا کر سکتی ہے؟ محترم عثمانی صاحب کا ارشاد گرامی ہے۔

"عدالتوں کے چکر میں پھنسنا جہاں بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور وکیل صاحبان اپنی جرح قدح سے اچھے اچھوں کے اوسان خطا کر دیتے ہیں قرض اور لین دین کے سلسلہ میں جو عورتوں کے دائرۂ کار سے تعلق بھی نہیں رکھتا ایک عورت کے لئے دردسر ہے وہ تفصیلات میں الجھ سکتی ہے جس سے پورا مقدمہ ہی خراب ہو سکتا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۶)

کیا عورت عدالت میں اپنے شہادتی بیان کی جملہ جزئیات کو پوری صحت اور صراحت کے ساتھ پیش کر سکتی ہے؟ اس کا جواب جناب پرویز صاحب یہ دیتے ہیں۔

"مقدمات میں ہمیشہ جزئیات پر بحث و تنقید اور جرح و تنقیح ہوتی ہے مقدمہ کی جزئیات کو پوری پوری صحت کے ساتھ بیان نہ کرنے سے ہی شہادت خراب ہوتی ہے اور شہادت کی توثیق کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس قسم کے باریک اختلافات کی صحت ہو جائے عورتوں میں ایک تو وہ نفسیاتی کمی ہوگی جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے دوسرے یہ کہ ان فرائض کی انجام دہی کے سبب جو عورتوں سے مخصوص ہیں ان کے لئے مردوں کے مقابلے میں معاملات میں حصہ لینے کے مواقع بھی کم ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ متنازعہ فیہ معاملات (مقدمات وغیرہ) میں جہاں بال کی کھال اتاری جاتی ہے عورت بالعموم جزئیات کی صراحت میں غیر واضح

رہ جائے گی۔" (طاہرہ کے نام ص۶۵)

ان اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ عورت مقدمات میں جزئیات کا کما حقہ استقصا نہیں کر سکتی اس معاملے میں وہ ذہنی طور پر مرد سے کمزور تر واقع ہوئی ہے جس کی بنا پر اس کی شہادت سے مقدمہ خراب ہو سکتا ہے اور عدالت فیصلہ کرتے ہوئے کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے گی لیکن اس حقیقت پر خوب غور فرمائیے کہ عورت اگر ذہنی طور پر مرد سے کمزور تر نہ بھی واقع ہوتی تو بھی اس کا فطری دائرۂ کار گھر ہی ہے جسے چھوڑ کر مرد کے دائرۂ کار میں گھس آنے کا نتیجہ عورت کے اپنے مفاد میں بھی اچھا نہیں ہو گا اور معاشرے کے حق میں بھی سود مند نہیں ہو گا اپنے فطری دائرۂ کار سے خروج کے باعث وہ تمدن کبھی بھی زوال و انحطاط کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جس کی خدمت کے لئے عورت کا مفید کردار صرف اور صرف اس کے فطری میدان عمل ہی میں نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی عورت نے چراغ خانہ بننے کی بجائے شمع انجمن بننے کی کوشش کی تمدن زوال و انحطاط کا شکار ہوا کیوں؟ عثمانی صاحب فرماتے ہیں۔

"عورت کا گھر کی چاردیواری کو چھوڑنا عموماً دو وجوہ سے زوال کا سبب بنتا ہے ایک تو یہ کہ زندگی کا بہت بڑا حصہ معطل ہو جاتا ہے اور اس کے بیشمار مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں کیونکہ ان مسائل کو عورت ہی کا ناخنِ تدبیر حل کر سکتا ہے لیکن عورت جب مردانہ مسائل میں حصہ لینے لگتی ہے تو اس کے گھریلو مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں، عورت کو انہیں حل کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا وہ بھی انسان ہے اس کی صلاحیتیں لامحدود تو نہیں ہیں کہ وہ اپنے فرائض بخیر و خوبی ادا کرنے کے بعد بھی اس قابل رہ جائے کہ وہ مردوں کے حصہ کے فرائض بھی انجام دے سکے جب وہ بیرونِ خانہ مسائل کی طرف رجوع کرتی ہے تو اندرونِ خانہ کے مسائل سے اغماض برتنا ہی پڑتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں مردوں کے قوائے عملیہ میں

اضمحلال پیدا ہو جانا ایک فطری تقاضا ہے کیونکہ جب کسی کو اپنے مسائل میں سہارا دینے والی ہستی میسر آجاتی ہے تو اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ سارا کام مجھے ہی سر انجام دینا ہے وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ میرے کام کو بٹانے والا بھی کوئی ہے اور اس یقین کی وجہ سے اس کے قوائے عملیہ کا سست پڑ جانا لازمی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۲-۶۳)

یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ عورت کے گھر سے نکل جانے کے باعث تمدن بگڑ جاتا ہے مرد کے قوائے عملیہ سست پڑ جاتے ہیں جس سے وہ اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا نہیں کر پاتا۔ درونِ خانہ کے مسائل تو قطعی طور پر محروم توجہ رہ جاتے ہیں عورت پر اس کی فطری ذمہ داریوں کے علاوہ بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور مرد اور عورت عملاً ایک ہی دائرۂ عمل کے کارکن بن کر رہ جاتے ہیں پھر اس صورتحال کا ایک نتیجہ اور بھی برآمد ہوتا ہے جسے عثمانی صاحب یوں بیان فرماتے ہیں۔

"اکتساب رزق کی جدوجہد میں جب مرد اور عورت دونوں لگ جاتے ہیں تو اسبابِ معیشت کی فراہمی کی مقدار لامحالہ بڑھ جاتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان صرف بنیادی اور اہم ضروریات کی فراہمی تک خود کو محدود نہیں رکھتا بلکہ اسبابِ طرب و تفریح تک پاؤں پھیلانے لگتا ہے اور طرب و تفریح میں منہمک ہونے کے بعد محنت مشقت اور جدوجہد کے جذبہ میں فرق آجانا لازمی بات ہے وہ محنتی اور جفاکش نہیں رہتا وہ طاؤس و رباب ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ چیزیں بالآخر پوری قوم کے زوال کا باعث بن جاتی ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۳)

محترم عثمانی صاحب کے ان مبنی بر حقیقت اقتباسات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کا اپنے گھر کو چھوڑنا اور بیرونِ خانہ کی زندگی میں منہمک ہو جانا تمدن اور پوری قوم کے لئے باعث زوال ہے نیز عورت پر ذمہ داریوں کا بوجھ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ

اس کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ مولانا محترم ان امریکی خواتین پر بہت ترس کھاتے ہیں جو بیچاری اپنی فطری ذمہ داریوں کے علاوہ بیرون خانہ کی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہیں۔

"عورت غریب آج اتنی محنت کر رہی ہے جتنی اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی مثلاً امریکی عورت کو لیجئے وہ گھریلو کام کاج کے لئے بیرونی مدد لینے سے محروم ہے اور خود اس کے حالات اسے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ محض خانہ داری کی دیکھ بھال ہی کے لئے اپنا سارا وقت دے سکے نتیجہ یہ ہے کہ وہ بیچاری دُوہری مشقت میں پسی جا رہی ہے گھر میں وہ بیوی اور ماں ہے اور باہر وہ کسی دفتر یا کارخانہ میں ملازمہ ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۶۱)

محترم عثمانی صاحب کے ان حقیقت نما اقتباسات سے کیا واضح ہوتا ہے یہی ناکہ

۱۔ ہمیں امریکی عورت کے دوہری مشقت میں پسے جانے والے المیے سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

۲۔ عورت کے بیرون خانہ امور کی سرانجام دہی سے مرد کے قوائے عملیہ میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔

۳۔ گھر کے وہ مسائل جنہیں عورت ہی کا ناخنِ تدبیر حل کر سکتا ہے عورت کے گھر سے نکل جانے کے باعث لاینحل رہ جاتے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں ایک معقول آدمی اسی نتیجے پر پہنچتا ہے (اور یہ پہنچنا بھی چاہیئے) کہ عورت کا فطری دائرہ عمل گھر کی چاردیواری ہے مولانائے محترم سے تو قارئین یہی توقع کر رہے ہوں گے کہ وہ مسلم خواتین کو یہی مشورہ دیں گے کہ ــــ
"وہ لزومِ بیت اختیار کریں کیونکہ ان کا فطری دائرہ عمل گھر کی زندگی پر محیط ہے"ــــ لیکن

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

افسوس صد افسوس کہ

ع یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

مولانا محترم مغربی عورت کی دوہری ذمہ داریوں کو دیکھتے ہیں تو انہیں اس پر ترس آتا ہے مگر انہیں مسلم خواتین اس رحم و شفقت کی مستحق نظر نہیں آتیں بلکہ وہ اسلام کی بیٹیوں کو انہی دوہری ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا دینا چاہتے ہیں جن کے نیچے مغربی عورت دبی اور پسی جا رہی ہے اور جس "بیچاری" پر انہیں خود بھی بڑا ترس آتا ہے۔

وہ امریکی عورت پر ترس کھاتے ہیں مگر پاکستانی عورت کو اُسی کے راستے پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ گھر میں بیوی اور ماں بن کر رہنے کے ساتھ ساتھ، کسی دفتر یا کارخانے کی ملازمہ بن کر بھی رہے وہ مسلم خواتین کو بڑے ناصحانہ اور مشفقانہ انداز میں سمجھاتے ہیں کہ مرد اور عورت :

"دونوں برابر کے ذمہ دار ہیں اور برابر کے جوابدہ ہیں لہٰذا جب ذمہ داری اور جوابدہی برابر ہے تو ذمہ دارانہ عہدوں اور منصبوں کی اہلیت بھی دونوں میں مساوی ہونی چاہیئے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۹۶)

اس کے بعد اپنے وعظ کی "اگلی خوراک" دیتے ہیں۔

"اگر ذمہ داریوں میں دونوں برابر ہیں تو ان ذمہ داریوں کا جو صلہ اور بدلہ ہو سکتا ہے ضروری ہے کہ دونوں اس میں بھی برابر ہوں لہٰذا اگر ذمہ داری کے مناصب مردوں کو مل سکتے ہیں تو عورتوں کو بھی مل سکتے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۹۷)

تب وہی مولانا عثمانی صاحب جو امریکی خاتون کی دوہری ذمہ داریوں تلے دبی ہوئی زندگی کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں بعض مغرب زدہ مسلم ممالک کی خواتین کو جب بیرون خانہ کے ہر شعبۂ حیات میں مردوں کے شانہ بشانہ "رواں دواں" دیکھتے ہیں تو ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھتا ہے اور وہ اس بات پر بڑے شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں کہ

"آج مسلم خواتین نے اپنے آپ کو گھریلو زندگی کے مشاغل تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ وہ مصاف زندگی میں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک بن چکی ہیں وہ تجارت بھی کر رہی ہیں اور ملازمت بھی کر رہی ہیں مقدمات کی پیروی بھی کر رہی ہیں اور کرسئ عدالت پر بیٹھ کر فیصلے بھی کر رہی ہیں سیاست میں حصہ لے رہی ہیں انتخابات بھی لڑ رہی ہیں پارلیمان کی ممبر بھی بن رہی ہیں سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیمی و تدریسی فرائض بھی ادا کر رہی ہیں، ہسپتالوں میں دکھی مریضوں کے مرض کا مداوا بھی کر رہی ہیں فوجی خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۹۲)

لیکن محترم عثمانی صاحب کا اقوامِ عالم کا گہرا مطالعہ اور وسیع تجربہ کیا ظاہر کرتا ہے؟؟ وہ خود فرماتے ہیں

"ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تنزل کے دور عام طور پر وہی رہے ہیں جب عورت گھر کی چار دیواری کو چھوڑ کر باہر نکلی ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۳)

کس کا یقین کیجئے کس کا یقین نہ کیجئے
لائے ہیں بزم یار سے لوگ خبر الگ الگ

سوال یہ ہے کہ ہم کس سے فائدہ اٹھائیں؟ مولانا محترم کے مواعظ حسنہ سے یا ان کے تجربہ سے؟

ع کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

TRUEMASLAK @ INBOX.COM

# باب

# استدراک شہادت نسواں

## (قرآن کریم کی روشنی میں)

گذشتہ باب کے مضمون کے جواب میں محترم مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کا ایک تردیدی مضمون روزنامہ جسارت کراچی نے ۷ار جولائی ۱۹۸۳ء سے ہفتہ وار نو اقساط میں ان الفاظ کے ساتھ شائع کرنا شروع کیا۔

"جسارت میں چند ماہ قبل "شہادت نسواں" کے موضوع پر جناب خالد اسحٰق ایڈووکیٹ اور مفتی ولی حسن صاحب کے انٹرویو اور پھر پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب کا ۱۱ قسطوں میں ایک طویل مضمون شائع ہوئے تھے، پروفیسر قاسمی صاحب کے اصل مخاطب مولانا عمر احمد عثمانی اور پرویز صاحب تھے مولانا عثمانی نے اس مضمون کے جواب میں ایک مفصل مضمون ہمیں ارسال کیا ہے اور خالد اسحاق نے بھی اسے اپنے موقف کا ترجمان قرار دیا ہے ہم جناب عمر احمد عثمانی صاحب کی تحقیقی کاوش کو جناب خالد اسحاق کی تائیدی خواہش اشاعت کی بناء پر نذر قارئین کر رہے ہیں۔

یہ موضوع اگرچہ صحافتی نقطہ نظر سے ایک "ڈیڈ" موضوع ہے لیکن ہم جناب عمر احمد عثمانی صاحب کے حق دفاع اور حق جواب کے احترام میں اسے قسط وار شائع کر رہے ہیں پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب اگر اپنے موقف کی وضاحت کے سلسلہ میں جواب الجواب ارسال

فرمانا چاہیں تو ہم اس علمی بحث کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے اسے بھی شائع کریں گے تاہم اخبار کے صفحات کی محدود گنجائش اور فوری نوعیت کے سینکڑوں دوسرے موضوعات کی مسلسل یلغار کے باعث اب ہم اس بحث کا دائرہ انہی دو حضرات تک محدود رکھیں گے کسی اور کو اس بحث میں کود پڑنے کا موقع نہ دیں گے ان دونوں حضرات سے ہماری گذارش ہے کہ طنز و تضحیک سے مکمل گریز فرمائیں، عربی متن کی بجائے صرف ترجمہ دیں۔ الا یہ کہ آیات کا حوالہ ناگزیر ہو حتی الامکان اختصار کی کوشش فرمائیں۔

مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کے مضمون کی پہلی قسط آج ادارتی صفحہ پر دی جا رہی ہے آئندہ اسے ہر جمعہ کو دینیات کے صفحہ پہ ملاحظہ فرمائیے مضمون کی طوالت کے پیش نظر طویل عربی آیات اور بعض جملے حذف کر دیئے گئے ہیں۔" (ادارہ) ("جسارت" ۱۹۸۳، ۷، ۱۷)

لیکن اس کے بعد جب محترم عثمانی صاحب کے تمام اعتراضات و اشکالات کا جواب لکھ کر میں نے روزنامہ جسارت کو بھیجا تو ادارۂ جسارت نے وعدۂ اشاعت کے باوجود شاید اس لئے شائع نہ کیا کہ صحافتی نقطۂ نظر سے مضمون مردہ ہو چکا تھا یا پھر ہمارے ساتھ کوئی بھاری بھر کم سفارشی نہیں تھا جو ادارۂ جسارت سے اپنے عہد کو نبھانے کی سفارش کرتا یہ صورت حال نہایت افسوس ناک ہے کہ اسلامی اخبارات بھی اپنے وعدے کا پاس نہیں کرتے۔ ایک چیز خواہ دینی نقطۂ نظر سے کتنی ہی اہم ہو اور اس کی اشاعت کا خواہ پیشگی تحریری وعدہ بھی کیا جا چکا ہو لیکن اگر وہ صحافتی نقطۂ نظر سے مردہ ہو چکی ہو تو اس کی اشاعت نہیں ہو سکتی۔

بہر حال محترم عثمانی صاحب کے جواب میں "میرا جواب الجواب" جو جسارت میں شائع نہ ہو پایا نذرِ قارئین ہے۔

چند ماہ قبل روزنامہ جسارت میں عورتوں کی عدالتی شہادت کے موضوع پر محترم مفتی ولی حسن صاحب اور محترم مولانا محمد عبدالسلام صاحب کے مضامین شائع ہوئے

تھے۔ ان میں جا بجا علمائے امت اور فقہائے ملت کے حوالہ جات تو موجود تھے مگر ان دلائل سے کماحقہٗ تعرض نہیں کیا گیا تھا جو ہر شعبہ حیات میں عورتوں کی مطلق شہادت کے قائل حضرات نے قرآنی بنیاد پر پیش کئے تھے۔ ان دونوں واجب الاحترام بزرگوں نے اپنے مضامین میں سنت نبوی اور علماء و فقہاء کے فتاویٰ و آراء سے استشہاد کرتے ہوئے یہ قطعاً نہ سوچا کہ ان کا فریقِ مخالف جو قرآن کے "مقابلے" میں احادیث نبویہ تک کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتا وہ ان آراء و اقوال کو کیا وزن دے گا؟ بہرحال یہ سوچ کر میں نے ان لوگوں کے مزاج اور رجحان طبع کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک مضمون لکھا اور اپنی بحث کو بالقصد صرف قرآن کریم کی حد تک محدود رکھا، کیونکہ محترم عثمانی صاحب اور جناب پرویز صاحب صرف قرآن پاک ہی کو مبنی بر وحی مأخذِ قانون مانتے ہیں ان دونوں حضرات کا استدلال و استنباط "قرآن و سنت" کی بجائے فقط "قرآن" پر مبنی ہوتا ہے اگر کوئی روایت حدیث ان کی درایت و بصیرت کی روشنی میں قرآن کے مفہوم کی (موافقت میں نہیں بلکہ اُس مفہوم کی) موافقت میں (جسے یہ لوگ منسوب الی القرآن کر دیتے ہیں) مل جائے تو اسے قبول فرما لیتے ہیں اس لئے نہیں کہ سنت نبوی بجائے خود مبنی بر وحی ایک ماخذ قانون ہے بلکہ اس لئے کہ یہ روایت ان کی میزانِ درایت میں پوری اترتی ہے۔ محترم عثمانی صاحب نے اپنی کتاب فقہ القرآن جلد سوم میں "شہادت نسواں" پر تقریباً اکیاون صفحات پر بحث فرمائی ہے مگر اپنے استدلال کی تمام تر بنیاد قرآن پر ہی رکھی ہے صرف ایک مقام پر محض ایک جزئی مسئلے میں صرف ایک حدیث پیش کی ہے مگر وہ بھی کتب احادیث سے نہیں بلکہ احکام القرآن (جصاص) سے لی ہے۔ تفصیل کا رنگ بھرنے کے لئے احادیث سے کام لینے کی بجائے اقوال فقہاء سے کام لیا ہے جن کو تردیدی یا تائیدی نقطۂ نظر سے یا محاکمے کی غرض سے زیر بحث لایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے سابقہ مضمون میں اپنی بحث کو صرف قرآنی حد تک ہی محدود رکھا تھا اور ان حضرات کے دلائل کا صرف قرآن ہی کی بنیاد پر جائزہ لیا تھا اگرچہ محترم عثمانی صاحب کی تردید میں کچھ اور لوگوں نے بھی مضامین قلم بند کئے تھے مگر اسے میری شومئی قسمت سمجھئے یا خوش نصیبی کہ انہوں نے

صرف مجھے ہی قابل جواب اور لائقِ تردید سمجھا۔

میں نے اپنے اس مضمون کی ترتیب تقریباً وہی رکھی ہے جو میرے سابقہ مضمون کی تھی اسی ترتیب پہ اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے، مناظرانہ کج بحثی، عقلی کشتی، ذہنی دنگل اور مجادلانہ ہٹ دھرمی سے کنارہ کش رہتے ہوئے میں محترم عثمانی صاحب کے ہر معقول سوال اور مناسب اشکال کا جواب پیش کرتا جاؤں گا۔ انشاء اللہ العزیز یہ تفصیلی جواب کئی فصلوں پر مشتمل ہے۔

# پہلی فصل۔ تنہا عورتوں کی شہادت پر اجماع کا مسئلہ

**میرا موقف** میں نے اپنے گزشتہ مضمون کی ابتداء محترم مفتی ولی حسن صاحب اور جناب مولانا محمد عبدالسلام صاحب کے ان اقتباسات سے کی تھی جن میں انہوں نے شہادت کے چار درجے قائم کئے تھے چوتھے درجے کے ضمن میں (جو تنہا عورتوں کی شہادت سے متعلق تھا) میں نے یہ نوٹ ثبت کیا تھا کہ

"تنہا عورتوں کی شہادت اس وقت بھی قابل قبول ہے جبکہ جائے وقوعہ پر اتفاق سے کوئی مرد موجود نہ ہو اور محض عورتیں ہی واقعہ کی تنہا گواہ ہوں اس پر امت کا اجماع ہے" (۱) جسارت ۸۳-۴-۲۹)

محترم عثمانی صاحب نے خواتین کی مطلق شہادت کے اثبات کے لئے خلافت راشدہ کے ان واقعات کو پیش کیا تھا جن میں جائے واردات پر صرف خواتین ہی موجود تھیں میں نے ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"یہ دونوں روایات صاف بتاتی ہیں کہ یہاں مرد گواہ سرے سے موجود ہی نہ تھا جو وقوعہ کا عینی شاہد قرار پاتا محض عورتیں ہی عورتیں موجود تھیں اور اس پر امت کا اجماع ہے کہ جس بات پہ مرد مطلع نہ ہو پائے ہوں محض

عورتوں ہی کو اس کا علم ہو تو ایسے معاملات میں خواتین کی شہادت قطعی قابل قبول ہوتی ہے۔" (۱۰) جسارت ۸۳ - ۵ - ۱۰

آگے چل کر میں نے محترم عثمانی صاحب کی ایسی ہی ایک اور دلیل پر یہ عرض کیا تھا کہ

"یہاں بھی معاملہ وہی ہے مرد گواہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ شوہر کے طلاق دینے کا معاملہ صرف عورتوں ہی کو معلوم ہے اس لئے انہوں نے شہادت دیدی، اب ظاہر ہے کہ جہاں حقیقتِ حال کا علم صرف عورتوں ہی کی حد تک محدود ہو وہاں وہی گواہ قرار پا سکتی ہیں۔" (ایضاً)

محترم عثمانی صاحب میری ان عبارتوں پر جس قدر برہم ہوتے ہیں میری کسی دوسری عبارت پر نہیں ہوتے اس لئے میں ان کا نقدہ و تبصرہ انہی کے الفاظ میں بےکم و کاست پیش کئے دیتا ہوں تاکہ ان کے دلائل کے ساتھ ان کا اخلاقی طرز تحریر بھی واضح ہو جائے، موصوف محترم ارشاد فرماتے ہیں:۔

**عثمانی کا نقد و تبصرہ**

۱۔ "قاسمی صاحب کی عبارت پڑھ کر ہمیں بے ساختہ حضرت سعدی کا یہ شعر یاد آ گیا کہ ؎

؎ تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

پروفیسر صاحب نے یہ قسط قلمبند فرما کر فقہی معاملات میں اپنی مہارت کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔ جناب فرماتے ہیں کہ اس پر امت کا اجماع ہے کہ جس بات پر مرد مطلع نہ ہو پائے ہوں محض عورتوں ہی کو اس کا علم ہو تو ایسے معاملات میں عورتوں کی شہادت قطعی قابل قبول ہوتی ہے جناب نے اس کا حوالہ نہیں دیا کہ یہ اجماع کونسی دنیا میں ہوا ہے یا ہوا تھا۔"

(۹) جسارت ۸۳ - ۹ - ۹

۲۔ "قاسمی صاحب کا مزعومہ اجماع معلوم نہیں کہ کس دنیا میں ہوا ہے۔" (ایضاً)

۳ــــــ "ناظرین متجسس ہوں گے کہ میں اس غلطی پر سے پردہ اٹھا دوں جو پروفیسر صاحب سے صادر ہوئی ہے
حقیقت یہ ہے ــــــ (بشرطیکہ قاسمی صاحب نے مفتی ولی حسن صاحب کی اندھی تقلید میں اجماع کی یہ بات نہ کہدی ہو حالانکہ مفتی صاحب نے بھی اس کے متعلق "اجماع" کی بات کبھی نہیں کی بلکہ مناظرانہ انداز میں صرف اس قدر کہا کہ " باقی ایسی صورتوں میں جن میں صرف عورتیں شہادت دینے والی ہوں اگر وہ اتنی کثیر عورتیں ہوں جو تواتر کی حد تک پہنچ جائیں تو قاضی خبر متواتر پر فیصلہ دے سکتا ہے" اور اس کا بھی کوئی ثبوت یا حوالہ نہیں دیا۔ بہر حال قاسمی صاحب نے " نقل را چہ عقل" کے مطابق بلکہ مزید بے احتیاطی کا مظاہرہ فرما کر اگر اسے اجماع کا رنگ نہیں دیدیا تو پھر ــــــ) انہیں کتب فقہ کی ایک عبارت سے دھوکہ ہوا ہے اور انہوں نے اس کا غلط مطلب سمجھ لیا" (ایضاً)

اس کے بعد محترم عثمانی صاحب "ہدایہ" کی ایک عبارت کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

۴ــــــ "اس قسم کی عبارتوں کا مطلب پروفیسر صاحب نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایسے معاملات میں جن پر مرد مطلع نہ ہوئے ہوں ان میں عورتوں کی شہادت قبول کر لی جائے گی جو قطعاً غلط ہے، حالانکہ فقہائے کرام کا مطلب یہ ہے کہ ان معاملات میں جو مردوں کی نظر میں نہ آسکتے ہوں ان کے دائرہ کار سے باہر ہوں مثلاً ولادت، بکارت، زنانہ عیوب جو مستور مقامات میں ہوں ان میں عورتوں کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے " لایطلع علیہ الرجال " کو " لم یطلع علیہ الرجال" سمجھا ہے جو عربیت سے ناواقفیت کی بنا پر ہوا ورنہ اتنی بڑی غلطی کا ارتکاب نہ ہو سکتا تھا" (۹) جسارت ۸۲-۹-۹

محترم عثمانی صاحب کا یہ طویل و عریض نقد و تبصرہ پڑھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی ہوا کہ یا تو وہ اس قدر نسیان و ذہول کا شکار ہیں کہ انہیں مطلق یاد نہیں رہتا کہ وہ خود کیا لکھ چکے ہیں اور یا پھر وہ جان بوجھ کر حقائق کو مستور و مخفی رکھنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

میرا جواب الجواب

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ـــــ "جن واقعات میں حقیقتِ حال کا علم محض خواتین تک محدود ہو وہاں وہی گواہ قرار پائیں گی" ـــــ اس کا اعتراف خود محترم عثمانی صاحب نے اپنی کتاب میں کیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"امت کے تقریباً تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ایسے مخصوص نسوانی مسائل کے فیصلہ کے لئے تنہا عورتوں کی شہادت کافی ہے جن کا علم عموماً مردوں کو نہیں ہوتا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ صـ۱۰۲)

یہاں موصوف محترم صاف لفظوں میں علماء کے "اتفاق" کو بیان کر رہے ہیں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ ان کا بیان کردہ یہ "اتفاق" تو صرف مخصوص نسوانی مسائل" ہی کی حد تک محدود ہے کیونکہ آگے چل کر وہ کھلے اور غیر مبہم الفاظ میں یہ فرماتے ہیں کہ

"حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے عورتوں کی گواہی ان معاملات میں قابلِ قبول قرار دی ہے جن کا علم عموماً عورتوں ہی کو ہو سکتا ہے، ان کے نزدیک اس ضمن میں وہ معاملات بھی آجاتے ہیں جن کا علم صرف عورتوں ہی کو ہو کیونکہ وہاں اس حادثہ کے وقت کوئی مرد گواہ موجود ہی نہ تھا مثلاً شادی بیاہ کے ہنگاموں میں مکانات کے اندر اگر کوئی حادثہ ہو جاتا ہے اور وہاں کوئی مرد اس وقت موجود نہیں ہے تو لامحالہ عورتوں ہی کی شہادت کو قبول کرنا پڑے گا کیونکہ قبول نہ کرنے میں حقوق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ صـ۱۰۳)

محترم عثمانی صاحب کی اس عبارت کی روشنی میں ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جن معاملات میں تنہا عورتیں ہی موقع کی گواہ ہوں وہاں ان کی شہادت پر میراد عوائے

اجماع "بے بنیاد" اور ذاتی "مزعومہ" ہے یا فی الواقع مبنی بر حقیقت دعویٰ ہے۔ نیز یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ کتب فقہ کی عبارتوں کو سمجھنے میں "دھوکہ" صرف مجھے ہی لگا ہے یا خود محترم عثمانی صاحب بھی اس "دھوکے" کا شکار ہو گئے ہیں؟ اب اس بات کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ حضرت سعدی کے جس ارشاد کو جناب عثمانی صاحب نے بیساختہ یاد فرمایا ہے وہ انہیں پڑھ کر مجھے مخاطب کرنا چاہیئے یا مجھے پڑھ کر انہیں مخاطب کرنا چاہیئے؟ کیا ہی اچھا ہوتا اگر محترم عثمانی صاحب میرے "قلت علم" "قصور فہم" "مظاہرۂ بے احتیاطی" "عربیت سے میری ناواقفیت" اور "فقہی معاملات میں میری عدم واقفیت" کا اعلان فرمانے سے قبل اپنی ان عبارات ہی کا مطالعہ فرما لیتے۔

مندرجہ بالا اقتباس پھر پڑھئے محترم عثمانی صاحب کے اس اقتباس میں فعل ماضی کا یہ جملہ ــــ "کیونکہ وہاں اس حادثہ کے وقت کوئی مرد موجود ہی نہ تھا" ــــ لا يطلع عليه الرجال ــــ اور ــــ لو يطلع عليه الرجال کے مفہوم و مراد کو خود واضح کر رہا ہے۔

اپنے اس طویل تنقیدی جائزے میں ایک مقام پر محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

> "یہ درحقیقت ہمارے موقف کی صحت کی دلیل ہے کہ پروفیسر صاحب نے لاشعوری طور پر ہماری تائید فرما دی ہے یہ اگرچہ ان کے قلت فہم اور قصور علم کی وجہ سے ہوا۔" (۹) جسارت ۸۳-۹-۹

یہ دراصل دوسروں کے الفاظ میں اپنے ہی خیالات پڑھنے کی عادت کا کرشمہ ہے ورنہ میرے اور محترم عثمانی کے نقطۂ نظر میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے وہ قارئین پر مخفی نہیں ہے۔

رہی محترم عثمانی صاحب کی یہ بدگمانی کہ "شاید میں نے مفتی ولی حسن صاحب کی اندھی تقلید کی ہے۔" تو اس کے متعلق میں یہ عرض کروں کہ "اندھی تقلید" تو رہی ایک طرف میں تو مطلق تقلید کو بھی صحیح نہیں سمجھتا۔ کیونکہ قرآن خود "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کی ایک خوبی

یہ بیان کرتا ہے کہ

(یہ وہ لوگ ہیں) جن پر اگر تذکیر کے پیش نظر ان کے رب کی آیات پڑھی جائیں تو وہ ان آیات پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے۔"

بہر حال تنہا عورتوں کی شہادت کے اجماع سے متعلق محترم عثمانی صاحب کی یہ عبارتیں اور خود میری عبارتیں ایک ہی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جس حقیقت کو میں نے "اجماع" کے لفظ سے پیش کیا ہے اسی حقیقت کو انہوں نے "اتفاق" کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ اصطلاح شریعت میں "اجماع" اور "اتفاق" حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اجماع لغت میں اتفاق رائے کو کہتے ہیں اور شریعت میں صالح اور نیک علماء کا امت محمدیہ میں سے ایک زمانہ میں کسی امر پر اتفاقِ رائے ہے یہ قولی بھی ہوتا ہے اور فعلی بھی ہوتا ہے۔" (۹) جسارت ۸۳-۹-۹

اس مسئلے پر کہ "جہاں موقع پر مرد گواہ موجود نہ ہوں اور تنہا عورتیں ہی حاضر ہوں وہاں وہی گواہ قرار پائیں گی" اجماع ایک عدالتی فیصلے کی صورت میں خلفائے راشدین کے دور ہی میں ہو گیا تھا۔ خود محترم عثمانی صاحب نے دور فاروقی کا یہ واقعہ اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے۔ اجماع کب ہوا؟

"ایک روایت میں ہے کہ چار عورتوں نے حضرت عمر کے سامنے شہادت دی کہ فلاں شخص نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی چنانچہ آپ نے بیوی کو شوہر سے جدا کر دیا۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۱۰۳)

نکاح و طلاق کے مقدمات میں فقہاء دو گواہوں کی شرط لگاتے ہیں جو مرد ہوں یہاں چونکہ مرد گواہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے اس لئے ایک مرد کے مقابلے میں دو خواتین کی رُو سے چار عورتوں کی گواہی پر فیصلہ کر دیا گیا کیونکہ مرد گواہ سرے سے جائے واردات پر موجود ہی نہ تھا جو واقعہ دور علوی کی ایک نظیر ہے وہ بھی اسی اصل پر قائم ہے، اسے بھی محترم عثمانی صاحب نے اپنی کتاب میں ثبت فرمایا ہے۔

"ہند بنت طلق بیان کرتی ہیں کہ ہم چند عورتیں ایک جگہ جمع تھیں وہیں ایک بچہ کپڑے سے ڈھکا ہوا پڑا تھا ایک عورت نے ادھر سے گزرتے ہوئے اسے پیروں سے روند ڈالا، بچہ کی ماں نے دعویٰ کیا کہ فلاں عورت نے میرے بچہ کو ہلاک کر دیا ہے اس کی گواہی حضرت علی کے سامنے دس عورتوں نے دی جن میں میں بھی شامل تھی تو حضرت علی نے اس عورت کے خلاف دیت کا فیصلہ فرمادیا۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۱۰۳)

علوی دور کا یہ عدالتی فیصلہ بھی اسی اصل پر قائم ہے کہ ـــــ "جس حادثے پر مرد گواہ مفقود ہوں اور تنہا خواتین ہی موقعے کی گواہ ہوں تو وہاں وہی شہادت دیں گی" ـــــ بعد کے علماء بھی اسی اصل کو مانتے رہے ہیں۔ حافظ ابن قیم نے اس کو ایک طے شدہ حقیقت مانتے ہوئے یہاں تک لکھدیا کہ

**اجماع اور ابن قیم**

قد اتفق العلماء ان مواضع الحاجات يقبل فيها من الشهادات ما لا يقبل فی غيرها من حيث الجملة وان تنازعوا فی بعض التفاصيل وقد امر الله سبحانه بالعمل بشهادة شاهدين من غير المسلمين عند الحاجة فی الوصية فی السفر منبها بذالك علی نظيره ما هو اولیٰ منه كقبول شهادة النساء منفردات فی الاعراس و الحمامات والمواضع التی تنفرد النساء بالحضور فيها ولاريب ان قبول شهادتهن هنا اولیٰ من قبول شهادة الكفار علی الوصية فی السفر۔ (اعلام الموقعین جلد اوّل ص۹۷)

"علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ضرورت کے بعض مواقع ایسے بھی ہیں جب ان لوگوں کی شہادت بھی قبول کی جاتی ہے جن کی شہادت دیگر مواقع پر قابل قبول نہیں ہوتی علماء میں اس کی تفصیلات میں اختلاف ہے اللہ تعالیٰ نے وصیت میں دوران سفر دو غیر مسلم گواہوں کی شہادت پر عمل کرنے کا حکم دیا

ہے یہ حکم قبولیت کے اعتبار سے اس اولیٰ اور اقرب نظیر کو واضح کرتا ہے کہ ان مقامات میں جہاں تنہا خواتین ہی موجود ہوں مثلاً شادی بیاہ کے مواقع، حماموں اور اس طرح کے دیگر مقامات وہاں انہی خواتین کی گواہی قبول کی جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مقامات میں عورتوں کی شہادت قبول کرنا، دوران سفر، وصیت میں کفار کی شہادت قبول کرنے کی نسبت اقرب الی الصواب ہے"

حافظ ابن قیم کا یہ اقتباس اسی زیر بحث اصل پر علماء کے اتفاق کو ظاہر کر رہا ہے

**اجماع اور ابن تیمیہ** علاوہ ازیں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی یہ عبارت محترم عثمانی صاحب کی کتاب فقہ القرآن میں بھی موجود ہے۔

"اگر خواتین باراتوں اور غسلخانوں میں جمع ہوں اور وہاں کوئی حد کے قابل سانحہ پیش آجائے تو ایسی صورت میں حدود سے متعلق ان کی گواہی قبول کی جائے گی" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۱۰۴)

فقہاء ملت نے ان واقعات میں، جہاں واردات پر تنہا خواتین ہی موجود ہوں

**اجماع کی بنیادیں** ان کی گواہی کو دو بنیادوں پر قائم کیا ہے۔

اولاً ــــــ نظریۂ ضرورت کی بنیاد پر جو قرآن حکیم کی اس ہدایت پر مبنی ہے کہ ــــــ "وصیت میں، دوران سفر، اگر دو مسلم گواہ میسر نہ ہوں تو غیر مسلم دو گواہوں ہی کو قبول کر لیا جائے" ــــــ اب ظاہر ہے کہ ضرورت پڑنے پر غیر مسلم شہداء کی نسبت عملی ضرورت ہی کے تحت ایسے مقدمات میں مسلم خواتین کی شہادت کو قبول کرنا زیادہ اولیٰ اور اقرب ہے جن میں مرد گواہ ناپید ہوں۔ اس سلسلے میں حافظ ابن تیمیہ کا یہ اقتباس بڑا ہی واضح ہے۔

واذا حضر الموت وليس عنده مسلم فله ان يشهد من حضره من اهل الذمة فى الوصية ويحلفوا اذا شهدوا وهذا قول جمهور السلف وهو قول امام الائمة احمد

الیٰ عبید وعلیہ یدل القرآن والسنة وھذا مبنی علے اصل ـــــ وھو ـــــ ان الشھادة عند الحاجة یجوز فیھا مثل شھادة النساء فیما لا یطلع علیہ الرجال

(مختصر فتاویٰ مصریہ (ابن تیمیہ) ص۶۰۳) "جب کسی مسلمان کو دوران سفر موت آنے لگے اور اس کے پاس کوئی مسلمان موجود نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ ذمی کفار میں سے جو کوئی حاضر ہو اُسے گواہ بنالے اور یہ گواہ بوقت شہادت حلف اٹھائیں۔ یہی جمہور سلف کا قول ہے اور یہی امام الائمہ احمد بن حنبل اور امام ابو عبید کا فرمان ہے اور اسی پر قرآن وسنت دلالت کرتے ہیں اور یہ ایک اصل پر مبنی ہے ـــــ اور وہ یہ کہ ـــــ (کفار کی شہادت) اسی طرح جائز ہے جس طرح خواتین کی شہادت ان معاملات میں (ضرورتاً) جائز ہے جن کی اطلاع مردوں کو نہ ہو پائی ہو۔"

ثانیاً ـــــ رہی دوسری بنیاد، تو یہ دراصل وہ علت اور وجہ ہے جس کی بنیاد پر فقہاء کرام ان معاملات میں عورتوں کی شہادت کے قائل ہیں جو مردوں کی نگاہوں سے بالعموم اوجھل رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں جس علت کی بناء پر وہ عورتوں کی گواہی کو جائز قرار دیتے ہیں وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ عورتوں کے تحت الثیاب امور کا صرف انہیں ہی علم ہوتا ہے مردوں کو ان مخفی امور کی اطلاع نہیں ہوتی اب اگر کسی ایسے مقام پر جہاں محض عورتیں ہی موجود ہوں اور مرد قطعاً موجود نہ ہوں۔ (مثلاً آج کے اس دور میں زنانہ اسکولز اور کالجز، ہسپتالوں میں خواتین کے مخصوص وارڈز، ریل گاڑی میں مستورات کے مخصوص ڈبے، شادی بیاہ وغیرہ کے مواقع پر مکان کے زنانہ حصوں میں خواتین کی محفلیں وغیرہ) اور اگر وہاں کوئی واردات ہو جائے تو اس کا علم بھی عورتوں تک اسی طرح محدود ہوگا جس طرح ولادت، بکارت اور زنانہ عیوب سے متعلقہ علم صرف مستورات تک ہی محدود رہتا ہے اسی علت کی بناء پر شہادت نسواں کا جو حکم عورتوں میں صرف زیر لباس امور تک محدود ہے اسے ان حادثات و

واقعات تک متعدی اور وسیع کر دینا عین قرین قیاس و عقل ہے جن میں حقیقت حال کا علم صرف خواتین تک ہی محدود ہو مولانا عثمانی صاحب کا یہ اقتباس اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے جسے تکرار کی کوفت کے باوجود دوبارہ پیش کیا جا رہا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے عورتوں کی گواہی اُن معاملات میں قابل قبول قرار دی ہے جن کا علم عورتوں ہی کو ہو سکتا ہے ان کے نزدیک اس ضمن میں وہ معاملات بھی آجاتے ہیں جن کا علم صرف عورتوں ہی کو ہو کیونکہ وہاں اس حادثہ کے وقت کوئی مرد موجود ہی نہ تھا۔ مثلاً شادی بیاہ کے ہنگاموں میں مکانات کے اندر اگر کوئی حادثہ ہو جاتا ہے اور وہاں کوئی مرد اس وقت موجود نہیں ہے تو لامحالہ عورتوں کی شہادت کو قبول کرنا پڑے گا کیونکہ قبول نہ کرنے میں حقوق کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۰۳)

## دوسری فصل۔ آیت $\frac{2}{282}$ میں "اصل" اور "متبادل" نصاب شہادت

میں نے گزشتہ مضمون میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ سے چھ استدلال کئے تھے۔

میرا موقف میرے دوسرے استدلال کی عبارت یہ تھی :۔

"قرآن کے الفاظ فان لم یکونا رجلین (اگر دو مرد نہ ہوں تو ---) ـــــ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کتاب اللہ کے نزدیک اول و آخر مطلوب گواہ صرف مرد ہی ہیں لیکن اگر وہ میسر نہ آسکیں تو پھر ـــــ ایک مرد اور دو عورتیں ـــــ آخری چارۂ کار کے طور پر گواہ بنا لئے جائیں قرآن کا یہ انداز صاف طور پر واضح کرتا ہے کہ "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت "دو مردوں" کی عدم موجودگی ہی میں اختیار کی جا سکتی ہے ---شہادت

کا پہلا نصاب (یعنی دو مرد) دوسرے نصاب (یعنی ایک مرد اور دو عورتوں) کا بدل نہیں ہو سکتا لیکن دوسرا نصاب پہلے نصاب کا بدل ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح وضو، تیمم کا متبادل نہیں ہو سکتا البتہ تیمم بصورت عدم موجودگیٔ آب (فان لم تجدوا ماءً[۱]) وضو کا متبادل اور قائم مقام بن سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مجبوری حالات کا نتیجہ ہے۔"

(۱) جسارت ۸۳-۴-۲۹

میرے اس پورے اقتباس کی بجائے ادھورے اقتباس کو نقل کرتے ہوئے

**عثمانی صاحب کا نقد و تبصرہ** محترم عثمانی صاحب نے جو نقد و تبصرہ فرمایا ہے اسے انہی کے الفاظ میں نمبروار درج کیا جاتا ہے، موصوف محترم ارشاد فرماتے ہیں :۔

۱۔ "قاسمی صاحب کو فقہی مسائل کا علم نہیں ہے وہ اپنی فہم کے مطابق عقلی تکے لڑا رہے ہیں۔"

۲۔ "آپ حضرات قرآن کریم کی آیت کا مطلب متعین طور پر نہیں سمجھ سکے ہیں اور اس الجھن میں گرفتار ہیں کہ "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت اصل شہادت ہے یا "دو مردوں" کی شہادت میسر نہ آسکنے کی صورت میں "دو مردوں" کی شہادت کا بدل ہے جیسے نماز کے لئے وضو ضروری ہے لیکن اگر پانی میسر نہ آسکے تو وضو کے بدلے تیمم کر لیا جاتا ہے لیکن تیمم اصل طہارت نہیں ہوتا بلکہ وضو کا بدل ہوتا ہے اگر تیمم کرنے والے کو پانی میسر آجائے تو تیمم ختم ہو جاتا ہے چنانچہ چند علماء نے "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت کو اصل شہادت قرار نہیں دیا۔ بلکہ "دو مردوں" کی شہادت کا بدل قرار دیا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا کہ "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت اسی وقت قبول کی جائے گی جب "دو مرد" شہادت کے لئے میسر نہ آسکیں، لیکن اہل اجماع نے اس کو اختیار نہیں کیا اور انہوں نے کہا کہ نہیں ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت اصل

شہادت ہے ، اگر " دو مرد " یسر آسکتے ہوں تب بھی " ایک مرد اور دو عورتیں " گواہی دے سکتی ہیں اس پر معتبر علماء و فقہاء کا اجماع بھی ہوگیا لیکن پھر بھی وہ اپنے فیصلے پر مطمئن نہیں ہیں ۔ انہیں یہ دغدغہ ، تردد اور اشتباہ باقی ہے کہ ہمارا فیصلہ غلط ہی ہو اور کہیں یہ شہادت بدل ہی نہ ہو ؟ "

(۵) جسارت ۸۳ ـ ۸ ـ ۱۲

**میرا جواب الجواب** رہا محترم عثمانی صاحب کا یہ ارشاد گرامی کہ ـــــ " قاسمی صاحب کو فقہی مسائل کا علم نہیں وہ اپنی فہم کے عقلی تکے لڑا رہے ہیں " ـــــ تو اس سلسلے میں میری گذارش یہ ہے کہ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں " پیغمبر فقہ " ہوں یا یکے از مجتہدین ہوں ۔ میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ادنیٰ طالب علم ہوں ان دونوں چیزوں کو جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور یہ کوشش بھی کسی محقق عالم کی حیثیت سے نہیں بلکہ طالب علم کی حیثیت سے ہے ۔

جہاں تک ان کے اس ارشاد گرامی کا تعلق ہے کہ " ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت بھی اصل شہادت ہے " ـــــ تو میں اپنی اس گذارش کو پھر دہراتا ہوں جو میں پہلے کر چکا ہوں کہ میری یہ تحریریں ان لوگوں کی تردید میں ہیں جو صرف قرآن ہی کو مبنی بر وحی ماخذِ قانون مانتے ہیں ۔ الفاظ قرآن سے جو کچھ میں نے اخذ کیا ہے اگر وہ غلط ہے تو ازراہِ کرم قرآن ہی کی بنیاد پر اس کی تردید فرمائیے کیا قرآن صاف الفاظ میں ( محترم عثمانی صاحب ہی کے ترجمے کے مطابق ـــــ فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۴ ) یہ نہیں کہتا کہ ـــــ " اگر دو مرد نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالو " ـــــ ؟ بالکل اسی طرح جس طرح وضو کے متعلق قرآن غیر مبہم الفاظ میں ( محترم عثمانی صاحب ہی کے ترجمے کے مطابق ـــــ فقہ القرآن جلد اول ص ۱۱۱ ) یہ کہتا ہے کہ ـــــ " اگر تم پانی نہ پاسکو تو پاک مٹی کی طرف قصد کرو " ـــــ ؟ ؟ کیا یہ مقام تعجب نہیں کہ موصوف محترم وضو اور تیمم کے متعلق تو ( آیت مذکورہ کے تحت ) یہ فرماتے ہیں کہ ـــــ " تیمم بذات خود کوئی چیز نہیں وہ نائب اور خلیفہ ہے وضو اور غسل کا " ـــــ ( فقہ القرآن ج ۱ ص ۱۱۱ ) لیکن جب میں ان کے اسی اسلوب استدلال اور

طرزِ استنباط پہ چلتے ہوئے "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت کو "دو مردوں" کی شہادت کا قائم مقام اور بدل قرار دیتا ہوں تو وہ اسے قبول نہیں فرماتے اور وہ بھی کسی قرآنی دلیل کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض اس بنیاد پر کہ ـــــ "اہل اجماع نے اس کو اختیار نہیں کیا"ـــ

**اجماع بمقابلہ قرآن** میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ محترم عثمانی صاحب یہاں جن "اہل اجماع" کے دامن میں پناہ لے رہے ہیں، اُن ہی اہل اجماع کے کس قدر "اجماعی مسائل" کو انہوں نے کہاں کہاں رد کیا ہے بلکہ "اجماع" ہی کے متعلق مستفسر ہوں کہ یہ کیا ہے؟ اس کا انعقاد کیسے ہوتا ہے؟ جناب عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں

"اجماع تو یہ ہے کہ ایک ہی زمانہ کے تمام لوگ (علماء و فقہاء) زبان سے اس بات کا اعلان کریں کہ ہم نے فلاں مسئلہ پر اتفاق کر لیا ہے یا سب کے سب عملاً کسی کام کو شروع کر دیں جیسے مزارعت، مضاربت، شرکت وغیرہ، رہ گئی یہ بات کہ کسی نے یا چند آدمیوں نے کوئی بات کہی یا کوئی کام کیا اور دوسرے لوگوں نے اس پر نکیر نہیں کی تو یہ حقیقی اور اصل اجماع نہیں ہے اسے "اجماع سکوتی" کہتے ہیں جس کا امام شافعی نے انکار کیا ہے کیونکہ دوسروں کی خاموشی جس طرح موافقت کے لئے ہو سکتی ہے رعب اور خوف کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان کی رضامندی کی دلیل ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص۲۳۱)

آگے چل کر "عورت کی دیت" کے مسئلہ پر "اجماع صحابہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے قمطراز ہیں:۔

"جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ تمام صحابہ فلاں مقام پہ جمع ہوئے اور بحث و مباحثہ کر کے انہوں نے یہ اعلان فرما دیا تھا کہ ہم اس بات پر اتفاق کرتے ہیں اس وقت تک حقیقی اجماع کا دعویٰ باطل ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص۲۳۱)

سوال یہ ہے کہ ہمارے قرآنی استدلال کے مقابلے میں جس "اجماع" کو محترم عثمانی

صاحب پیش فرما رہے ہیں وہ "حقیقی اجماع" ہے یا "سکوتی اجماع"؟ اگر "حقیقی اجماع" ہے تو موصوف محترم کی اپنی شرائط کے مطابق، کب، کہاں، کس شہر میں، کس زمانہ کے لوگوں (علماء و فقہاء) نے مل کر مشترکہ اعلان کرتے ہوئے اس "حقیقی اجماع" کا اعلان کیا؟ اگر یہ "سکوتی اجماع" ہے تو قطع نظر اس کے کہ کون اس کا قائل ہے اور کون قائل نہیں ہے، ہم صرف یہ پوچھتے ہیں کہ یہ "سکوتی اجماع" منعقد کیسے ہو گیا؟ جبکہ خود باعتراف جناب عثمانی صاحب مہر سکوت کو توڑتے ہوئے :۔

"چند علماء نے "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت کو اصل شہادت قرار نہیں دیا بلکہ "دو مردوں" کی شہادت کا بدل قرار دیا اور یہ فیصلہ ــــ (غور فرمائیے محض اظہار رائے نہیں بلکہ فیصلہ۔ قاسمی) ــــ صادر کر دیا کہ "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت اسی وقت قبول کی جائے گی جب "دو مرد" شہادت کے لئے میسر نہ آسکیں۔" (۵) جسارت ۸۳-۸-۱۲

حقیقت یہ ہے کہ آیت میں مذکور دوسرے نصاب شہادت کے "اصل نصاب" ہونے کا مسئلہ قطعاً "اجماعی مسئلہ" نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے "اختلافی مسئلہ" رہا ہے۔ اگر ایک گروہ نے "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت کو "اصل نصاب" قرار دیا ہے تو دوسرا گروہ ہمیشہ اس کے متبادل ہونے کا قائل رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اسی گروہ کی رائے مطابق قرآن ہے۔

اگر محترم عثمانی صاحب کے اس نام نہاد اجماع کو مان لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کی واضح شرائط کو "اجماع" کی بنیاد پر چیلنج کیا جا سکتا ہے جبکہ "اجماع" ادلہ شرعیہ میں تیسرے درجے کی چیز ہے اور خود قرآن اول درجے کی؟ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآن بالفاظ صریح یہ کہہ رہا ہے کہ ــــ "اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر تم ایک مرد اور دو عورتوں ــــ کو گواہ بنا لو ــــ" مگر محترم عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ ــــ "اگر دو مرد میسر آ جائیں تب بھی ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لیا جائے" ــــ یہ تو صریح طور پر قرآن سے معارضہ ہے اور کتاب اللہ کی اس

**قرآنی شروط اور اجماع کا چیلنج**

شرط کو باطل کر دینے کی جسارت نہ جسے اللہ تعالیٰ نے " اگر دو مرد نہ ہوں تو ۔۔۔" کے قطعی الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ اس بات کو تو چھوڑیئے کہ موصوف محترم تیسرے درجے کی دلیل سے اول درجے کی دلیل کی شرائط کو منسوخ فرما رہے ہیں ۔ قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ یہاں جس "اجماع" کی بنیاد پر کتاب اللہ پر حکم چلایا جا رہا ہے وہ بجائے خود اس قدر "قوی" اور "ٹھوس" اجماع ہے کہ اس کو منعقد کرنے والے حضرات بھی بقول محترم عثمانی صاحب اپنے اتفاق رائے پر مطمئن نہیں ہیں ۔

"اس پر (یعنی ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کے " اصل نصاب" ہونے پر) معتبر علماء و فقہاء کا اجماع بھی ہو گیا لیکن پھر بھی وہ اپنے فیصلے پر مطمئن نہیں ہیں انہیں یہ دغدغہ، تردد اور اشتباہ باقی ہے کہ ہمارا فیصلہ غلط ہو اور کہیں یہ شہادت بدل ہی نہ ہو ۔"

(۵) جسارت ۸۳-۸-۱۲

یہ ہے وہ "ٹھوس اجماع" جس کی بنیاد پر محترم عثمانی صاحب قرآن کے اس واضح اور قطعی مفہوم کی مخالفت فرما رہے ہیں ۔

شہادت نسواں کی اس زیرِ بحث آیت میں " اگر دو مرد نہ ہوں تو ۔۔۔" کے الفاظ **عثمانی صاحب کی متضاد روش** یہ واضح کرتے ہیں کہ اصل نصاب شہادت "دو مرد گواہ" ہیں جو اگر میسر نہ ہوں تو پھر "ایک مرد اور دو خواتین" کو گواہ بنایا جا سکتا ہے یہ "متبادل نصاب" ہے جو "اصل نصاب" کی عدم موجودگی ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے یہی قرآن کا قطعی اور ظاہری مفہوم ہے ۔ یہاں قرآن کا ظاہری مفہوم چونکہ محترم عثمانی صاحب کے لئے مفید مطلب نہیں ہے اس لئے وہ " اجماع " کا سہارا لے کر اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ پہلے اور دوسرے نصاب شہادت کو بیک وقت " اصل نصاب" قرار دیا جائے چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"چند علماء نے " ایک مرد اور دو عورتوں " کی شہادت کو " اصل شہادت" قرار نہیں دیا بلکہ " دو مردوں " کی شہادت کا بدل قرار دیا ہے اور یہ فیصلہ

کر دیا ہے کہ "ایک مرد اور دو عورتوں" کی شہادت اسی وقت قبول کی جائے گی جب "دو مرد" شہادت کے لئے میسر نہ آسکیں، لیکن اہل اجماع نے اس کو اختیار نہیں کیا اور انہوں نے کہا کہ "نہیں ! ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت "اصل شہادت" ہے اگر "دو مرد" میسر آسکتے ہوں تب بھی "ایک مرد اور دو عورتیں" گواہی دے سکتی ہیں اس پر معتبر علماء و فقہاء کا اجماع بھی ہو گیا۔" (۵) جسارت ۸۳-۸-۱۲

لیکن دوسری طرف دیت کے مسئلہ میں عہد صحابہ سے لے کر اب تک کے تمام علماء و فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ عورت کی دیت، مرد کی دیت کا نصف ہے عثمانی صاحب کے نزدیک قرآن کا ظاہری مفہوم مسلمان مرد، خاتونِ مسلمہ اور ذمّی کا فر تینوں کی دیت مساوی اور پوری دیت ظاہر کرتا ہے یہاں چونکہ آثار و روایات کی بناء پر امت کا اجماع عورت کی نصف دیت پر ہے جو محترم عثمانی صاحب کے نزدیک قرآن کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے اس لئے وہ اجماع منعقد کرنے والے علماء پر برہم ہو کر یہ فرماتے ہیں کہ

"حق تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں (اگر میں غلطی نہیں کر رہا) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصل ماخذ شریعت قرآن کریم نہیں ہے بلکہ روایات و آثار ہیں اور روایات و آثار کی وجہ سے نیز اجماع کی وجہ سے ہم قرآن کریم کی آیات کو ان کے ظاہر مفہوم سے موڑ لینے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۲۸)

اب اگر اجماع کی وجہ سے قرآن کریم کی آیات کو اس کے ظاہر مفہوم سے موڑ لینے کا مرتکب ہونا واقعی اچھی بات نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ اسی اجماع کی بنیاد پر وہ شہادت کی آیت $\frac{2}{282}$ کے ظاہری مفہوم کو کیوں موڑ لینے کے مرتکب ہو رہے ہیں؟

آخر یہ متضاد و متناقض طرز عمل کیوں؟ ایک مقام پر اگر "اجماع" قرآن کے ظاہر مفہوم کے خلاف ہے تو آپ "اجماع" کو قبول کر لیتے ہیں اور قرآن کے ظاہر مفہوم

کو درخود اعتناء نہیں سمجھتے، دوسرے مقام پر ایسی صورتحال میں آپ اجماع کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور قرآن قرآن کی دہائی دینا شروع کر دیتے ہیں آخر یہ کیوں؟ محض اس لئے کہ ایک مقام پر "اجماع" کا وجود آپ کی خواہش کے مطابق ہے اور دوسرے مقام پر خلاف خواہش ہے؟ یہ تو ہوا پرستی ہوئی نہ کہ خدا پرستی۔ اگر آپ واقعی قرآن کے ظاہر مفہوم کے مقابلے میں "اجماع" کو قابل رد و ترک قرار دیتے ہیں تو ازراہِ کرم ہر جگہ ایسا کیجئے۔ کہیں اس اصول کو قبول کر لینا اور کہیں ترک کر دینا۔ ایک خدا ترس اور تحقیق پسند عالم دین کو زیب نہیں دیتا۔ یہ طرز عمل تو مطلب جو شخص ہی کے لئے سزاوار ہے۔

## تیسری فصل۔ عورت کی ذہنی کمزوری اور جدید تحقیقات

سورہ بقرہ کی آیت ۲۸۲ سے میں چھٹا استدلال ان الفاظ میں پیش کیا

میرا موقف تھا۔

"ہمیں اس سے بحث نہیں کہ "تضل" کا معنیٰ "الجھن میں پڑ جانا" ہے یا "بھول جانا" ہے آپ جو بھی ترجمہ کریں بہرحال اس سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔

(۱) عورت کے ذہن میں کوئی ایسی کمزوری (نقص) ضرور ہے جس کی بنا پر اس کے ذہن میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے گفتگو کرتے ہوئے بات غیر واضح اور مبہم سی رہ جاتی ہے یہاں تک کہ عدالت کے کٹہرے میں اس کی تلافی کے لئے "تذکیر" کے پیشِ نظر ایک اور عورت کو اس کے ساتھ گواہ بنایا جا رہا ہے ـــــ تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے ـــــ"

(۲) عورت کے ذہن کی یہ منقصت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک خاص ماحول کی پیدا کردہ ہو کہ اگر اسے بدل کر کوئی دوسرا ماحول طاری کر دیا جائے تو یہ خامی معدوم ہو جائے گی بلکہ یہ عورت کی فطرت، ساخت اور نفسیات میں داخل ہے اگر یہ محض ایک عارضی خامی ہوتی تو قرآن جو قیامت تک کے لئے صحیفۂ قانون اور کتابِ آئین کی حیثیت رکھتا ہے اسے یہ اہمیت ہرگز نہ دیتا کہ رہتی دنیا تک اسے اپنے دامن میں محفوظ کر لیتا۔" (۳) جسارت ۸۳-۵-۱

اس کے بعد عورت کی اس ذہنی کمزوری کو مبرہن کرنے کے لئے میں نے جدید سائنس کی علمی تحقیقات کو تفصیل سے پیش کیا تھا۔ مغربی مفکرین اور ماہرین علم کے ایسے حوالے دیئے تھے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جدید علمی تحقیقات بھی خواتین کی اس ذہنی منقصت کا اثبات کرتی ہیں جن کی بناء پر قرآن نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر قرار دیا ہے۔ محترم عثمانی صاحب نے ان تمام حوالوں کا صرف ایک مگر نہایت ہی "پیارا" جواب دیا ہے۔

**عثمانی صاحب کا موقف** وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"میں ڈاکٹر ہارڈنگ اور دیگر مغربی مفکرین کی تحقیقات سے متفق نہیں ہوں، اہل مغرب کے اذہان پر چونکہ مسیحی تعلیمات کے زیر اثر کہ ــــ "عورت تمام برائیوں اور گناہوں کا سرچشمہ ہے ــــ" اگر عورت کی مفروضہ کمزوریاں سوار ہیں تو وہ اپنے تحت الشعور کے ماتحت اسی قسم کی طفلانہ تحقیقات پیش کریں گے جنہیں میں پرکاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" (۴) جسارت ۸۳-۸-۵

غور فرمایئے موصوف محترم مسیحی مفکرین کی تحقیقات کو تو "پرکاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں"، مگر قرآن کے نام پر انہی مسیحی مفکرین کی پوری ثقافت کا نقشہ اپنا رہے ہیں

ان کے تمدن کا پورا ڈھانچہ اسلام کے نام پر ہتھیا رہے ہیں ان کے کلچر کے جملہ عناصر و لوازمات ـــــ مثلاً مخلوط سوسائٹی، مرد و زن کی کامل مساوات، چہرے کا ترکِ حجاب، تعددِ ازدواج کی مخالفت، مخلوط تعلیم، عورتوں کا مردوں کے مجمع میں خطاب کرنا، عورت کو خانگی وظائف سے منحرف کر کے قاضی و جج بلکہ سربراہِ مملکت تک بنانا، خاتونِ خانہ کو "چراغِ خانہ" کی بجائے "شمعِ انجمن" بنانا وغیرہ ـــــ کو قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد فرما رہے ہیں، ان کی معاشرت کی پوری عمارت کو قبول فرما رہے ہیں تاکہ اس کے فرنٹ پر ـــــ ھذا من فضل ربی ـــــ لکھ کر اسے مشرف باسلام کیا جا سکے مگر ایک جزئی سے مسئلے پر وہ انہی مفکرین کی آراء کو "پرکاہ کے برابر بھی وقعت دینے کو تیار نہیں ہیں" مولائے محترم (بقول سیدنا مسیح علیہ السلام) اونٹوں کو نگل رہے ہیں اور مچھروں کو چھان رہے ہیں، گڑ کھا رہے ہیں مگر گڑ کے بنے ہوئے گلگلوں سے پرہیز فرما رہے ہیں۔

**مسیحی معاشرہ خود عثمانی صاحب کی نظر میں**

پھر یہ طرفہ تماشا بھی دیدنی ہے کہ (بموجب کتاب فقہ القرآن) جن کے قلوب و اذہان تو اس مفروضہ کے کہ ـــــ "عورت تمام برائیوں اور گناہوں کا سرچشمہ ہے" ـــــ کے زیرِ اثر ہیں ان کے معاشرے میں تو عورت اعلیٰ اور برتر مقام پر نظر آتی ہے مگر خود موصوف محترم جس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں عورت کا مقام عیسائی معاشرے کی نسبت پست تر ہے محترم عثمانی صاحب کے رفیقِ کار جناب طاہر المکی صاحب (جن کے علمی تعاون اور زریں مشوروں سے وہ اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں) ارشاد فرماتے ہیں کہ

> "مسلمانوں کے معاشرے کو اگر عمرانی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ عجیب و غریب بات سامنے آئے گی کہ ان کے ہاں بحیثیت مجموعی عورت کی عزت بہت کم ہے ان کے مقابلے میں ایک مسیحی اور ہندو معاشرے میں انہیں زیادہ عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص۱۴۱)

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جو اس مفروضے کے قائل ہیں ان کی عملی معاشرت میں تو اس کے اثرات ناپید ہیں مگر ان کی علمی تحقیقات میں اس کے اثرات در آتے ہیں۔

ع جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

**عورت اور ہندو معاشرہ**

پھر ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے جناب طاہر المکی صاحب صرف یہی نہیں فرما رہے ہیں کہ "عورت کو مسیحی معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے" بلکہ وہ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ "ہندو معاشرے میں بھی عورت کو مسلم معاشرے کی نسبت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے" حالانکہ

"ہندوؤں کی نظریاتی کتابوں میں عورت کے متعلق نہایت پست خیالات پائے جاتے ہیں" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۱۱۴)

اب اسے لطیفہ سمجھئے یا "کثیفہ" کہ مولانا عثمانی صاحب مغربی مفکرین کی تحقیقات کو تو پرکاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں مگر ایک ہندو ڈاکٹر کاشی رام کی علمی تحقیقات سے بھرپور خوشہ چینی کرتے ہیں (ملاحظہ ہو فقہ القرآن ج ۲ ص ۳۹۴)۔

**عثمانی صاحب کا متضاد طرز عمل**

محترم عثمانی صاحب عجیب متضاد طرز عمل اختیار فرماتے ہیں: جب جی چاہتا ہے مغربی مفکرین کی علمی تحقیقات سے یہ کہہ کر دستکش ہو جاتے ہیں کہ

"میں ڈاکٹر ہارڈنگ اور دیگر مغربی مفکرین کی تحقیقات سے متفق نہیں ہوں۔۔۔ اس قسم کی طفلانہ تحقیقات۔۔۔ (کو)۔۔۔ میں پرکاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہوں" (۵) جسارت ۸۳-۸-۵

اور جب دل چاہتا ہے ان ہی مفکرین کی تحقیقی کاوشوں پر خراجِ تحسین یوں پیش فرماتے ہیں

"اس سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے کیونکہ ان کی بیان کردہ تفصیلات اصل (اوریجینل) ماخذ پر مبنی ہوتی ہیں اور اس کے تفصیلات دینے والے خود بھی اپنے

مضامین میں سند (AUTHORITY) ہوتے ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ۴ ص ۳۲۸)

# چوتھی فصل۔ مطلق اور مقید کے فقہی اصول پر بحث

شہادت نسواں اور عثمانی صاحب کا شاذ موقف

محترم عثمانی صاحب نے عورتوں کی عدالتی شہادت کے موضوع پر ایک ایسا موقف اختیار کیا ہے جس کا سلف و خلف میں سے ایک بھی شخص قائل نہیں ہے انہیں خود بھی اپنے اس جدید اور ماڈرن موقف کا اعتراف ہے وہ فرماتے ہیں

"اکتوبر ۱۹۸۲ء میں فقہ القرآن جلد سوم طبع ہو کر آئی تو جناب پرویز صاحب نے دیکھا کہ میں نے اس میں حنفی اصول فقہ کی روشنی میں بالکل ہی ایک نیا تصور پیش کیا ہے جو اب تک ان کے ذہن میں نہ تھا وہ تصور یہ تھا کہ قرآن نے یہ تفصیل کہ (دو مرد گواہ بنائے جائیں اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے) صرف قرض کے لین دین کی دستاویز لکھنے کے سلسلے میں بیان کی ہیں باقی تمام شہادت کی آیات میں گواہ بنا لینے کا حکم مطلق رکھا گیا ہے۔"

(۴) جسارت ۸۳-۸-۵

محترم عثمانی صاحب یہاں خود اپنے تصور کو "نیا" قرار دے رہے ہیں ان کے اپنے اس اعتراف شذوذ کے بعد اب کسی گواہِ چست کے اس بیان کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی جس میں ہمیں یہ باور کروانے کی سعی فرمائی گئی ہے کہ

"انہوں نے کوشش فرمائی ہے کہ اپنی تائید میں سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کی جو آرار مل سکیں انہیں پیش کر دیں تاکہ کوئی شخص یہ نہ

کہہ سکے کہ مولانا نے تجدد پسندی کا سہارا لیا ہے اس سے پہلی دو جلدوں میں بھی مولانا نے یہی کوشش کی تھی کہ جہاں وہ قرآن کی روشنی میں فقہ حنفی کے کسی اجتہاد کو چھوڑنے پر مجبور ہوں تو اپنی رائے کی تائید میں دیگر فقہاء و مجتہدین کی آراء سے اپنی تقویت بہم پہنچائیں مولانا موصوف نے اس جلد میں بھی اپنے اس التزام کو برقرار رکھا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ ہر مسئلے میں جہاں مولانا نے فقہ حنفی کے کسی مسئلے سے اختلاف فرمایا ہے مولانا کو سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین میں کسی نہ کسی کا قول ضرور مل گیا ہے جن سے ان کے استدلال و استنباط کی تائید ہو جاتی ہے۔"

(عرض ناشر۔ فقہ القرآن ج ۳ صلا)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا محترم اپنے اس نئے تصور میں قطعی منفرد ہیں ان کا یہ تصور اسی تجدد پسندی کا کرشمہ ہے جس کی تردید ناشر صاحب فرما رہے ہیں خود مولانا محترم کو اپنے اس ماڈرن اور شاذ تصور کی تائید میں۔ فقہاء و مجتہدین میں سے فقہ کا سارا دفتر گھنگال ڈالنے کے بعد بھی کوئی ہمنوا نہ مل سکا۔

تاہم میرے نزدیک "انفراد" اختیار کرنا حرام نہیں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاذ موقف پر مولانا محترم کی "دلیل" اس کے لئے انتہائی مضبوط دلائل ازحد قوی شواہد اور بہت ہی طاقتور براہین درکار ہیں۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ مولانائے محترم نے اپنی اس "تنہا پرواز" کے لئے کیا دلائل و براہین پیش فرماتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے ان کے پاس صرف ایک ہی "دلیل" ہے اور وہ ہے مطلق اور مقید احکام سے متعلق احناف کا وہ فقہی اصول جسے وہ جگہ جگہ بیان فرماتے ہیں۔

"حنفی اصول فقہ میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ مطلق آیات کے اطلاق کو مقید آیات سے مقید نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا صحیح طریقۂ استنباط یہ ہے کہ مطلق آیات کو مطلق رکھا جائے اور مقید آیات کو مقید رکھا جائے۔ لہٰذا ایک مرد اور دو عورتوں کی تفصیل صرف آیات قرض لین دین کی

دستاویز مرتب کرنے میں جاری ہوگی باقی تمام آیات شہادت اپنے اطلاق پر قائم رہیں گی۔" (۴) جسارت ۸۳ - ۸ - ۵

"اصول فقہ میں یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ قرآن کا کوئی مطلق حکم قرآن ہی کے کسی دوسرے مقید حکم سے مقید نہیں کیا جا سکتا حتٰی کہ اگر ایک ہی واقعہ میں ایک حکم مطلق ہو اور دوسرا مقید ہو تو تب بھی مطلق کو مقید نہیں کیا جا سکتا بلکہ مطلق حکم اپنے اطلاق پر قائم رہے گا اس اصول کے ماتحت سوائے قرض کے لین دین کی دستاویز کی شہادت کے باقی معاملات میں عورتوں کو بھی مردوں ہی کی طرح شہادت کا حق[1] ہونا چاہیئے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص۹۹)

آگے چل کر مولانا محترم اسی اصول کو مثالوں سے واضح فرماتے ہیں۔

"ہمارے (یعنی حنفیہ کے) نزدیک مطلق حکم کو مقید حکم پر محمول نہیں کیا جا سکتا اگرچہ دونوں حکم ایک ہی حادثہ میں صادر ہوئے ہوں کیونکہ دونوں حکموں پر عمل کرنا ممکن ہے دونوں کے درمیان نہ کوئی تضاد ہے اور نہ کوئی تنافی ہے چنانچہ اس اصول کے مطابق ظہار میں کفارہ کے اندر روزے رکھنے اور غلام کو آزاد کرنے میں اس قید کی پابندی ضروری ہوگی کہ دونوں کفارے ایکدوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ادا کئے جائیں لیکن ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا کفارہ ہاتھ لگانے سے پہلے بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور بعد میں بھی۔ (کیونکہ پہلے دونوں کفاروں میں "مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَاسَّا" کی قید لگی ہوئی ہے اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کے حکم کے ساتھ یہ قید نہیں ہے حالانکہ تینوں کفارے ایک ہی واقعہ (یعنی ظہار کے لئے بیان کئے گئے ہیں) اور جب

---

[1] شہادت (گواہی دینا) ایک حق ہے (جس کا حصول کسی سعادت کو پا لینا ہے) یا ایک فرض ہے (جس کی ادائیگی ایک بوجھ اور ذمہ داری ہے)؟ یہ بحث آگے آئیگی۔

ایک ہی حادثہ میں بھی مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جاسکتا تو جب وہ حکم دو حادثوں کے متعلق صادر ہو رہے ہوں اور ان میں ایک مطلق اور دوسرا مقید ہو تو بطریق اولیٰ مطلق کو مقید نہیں کیا جاسکے گا۔ چنانچہ قتل میں ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ضروری ہوگا کیونکہ اس کفارہ میں رقبة مؤمنة کی قید لگی ہوئی ہے لیکن دوسرے کفاروں (مثلاً ظہار اور یمین وغیرہ کے کفاروں میں) صرف غلام کو آزاد کرنا ضروری ہوگا مومن ہو یا کافر ہو"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۹-۱۰۰)

یہ ہے محترم عثمانی صاحب کے دلائل کی کُل کائنات! قبل اس کے کہ میں مطلق اور مقید کی بحث سے متعلق اس فقہی

**عثمانی صاحب کی خدمت میں بنیادی سوال**

اصول پر تفصیل سے عرض کروں۔ محترم عثمانی صاحب سے یہ سوال کرتا ہوں کہ آپ کے اس فرمان کی بنیاد کیا ہے کہ ـــــ "ہمارے نزدیک یہ بات طے ہو چکی ہے یا صاف ہو چکی ہے کہ مطلق آیات کو مقید آیات سے مقید نہیں کیا جاسکتا" ـــــ؟ کیا اللہ جل جلالہ نے قرآن پاک میں وحی کے ذریعے اس کو طے کر دیا ہے؟ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی صحیح حدیث میں اس کو طے کر دیا گیا ہے؟؟ کیا "اجماع صحابہ" نے اس اصول کو دائماً متعین کر دیا ہے۔؟؟؟ جب اس اصول کو نہ اللہ ہی نے طے کیا ہے نہ رسول ہی نے اسے مقرر کیا ہے اور نہ صحابہ ہی نے اسے متعین کیا ہے تو آخر آپ نے اسے کس دلیل شرعی کی بناء پر طے کر کے اختیار کر رکھا ہے؟ اگر فقہائے حنفیہ کی پیروی میں آپ نے اسے اختیار کر لیا ہے تو خود سوچیئے کہ انہی فقہاء کی کتنے مقام پر پیروی واطاعت سے آپ آزاد ہوئے ہیں؟ آخر اس اصول ہی کے ساتھ تمسک کیوں؟ پھر آپ ہی کا ارشاد ہے کہ ـــــ "درایت سے صحیح حدیث بھی رد کی جاسکتی ہے" ـــــ (فقہ القرآن ج ۱ ص ۷۰) اگر "صحیح حدیث" کو درایت کی بنیاد پر رد کیا جاسکتا ہے تو اس فقہی اصول کو کیوں رد نہیں کیا جاسکتا؟ حقیقت یہ ہے کہ محترم عثمانی صاحب نے اپنے موقف کی راہ میں حائل ہونے والی صحیح احادیث کو ہر قدم پر رد کرنے میں جس قسم کی درایت

سے کام لیا ہے اگر اس قسم کی درایت کے عشرِ عشیر کے ساتھ بھی وہ اس فقہی اصول کی جانچ پڑتال کرے تو اس میں کوئی جان اور قوت نہ پاتے۔ کم از کم میرے لئے سخت حیرت کا مقام ہے کہ ایک شخص درایت کی بنیاد پر "صحیح احادیث" تک کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن ایک ایسے فقہی اصول کے سامنے سجدہ ریز ہے جسے نہ تو اللہ نے مقرر کیا ہے اور نہ اس کے رسولؐ نے۔

پھر محترم عثمانی صاحب کی یہ ستم ظریفی بھی قابل داد ہے کہ اگر ہم قواعد صرف و نحو کی بنیاد پر دلیل پیش کریں تو وہ فرماتے ہیں کہ

اصل ۔ قرآن یا اصولِ فقہ ؟

"پروفیسر قاسمی صاحب اتنی بات یاد رکھیں کہ نحو و صرف وغیرہ کے علوم، قرآن کے بعد (دوسری صدی ہجری میں) مرتب ہوئے تھے اور علماءِ نحو و صرف اپنے قواعد و ضوابط کے لئے خود قرآنِ کریم سے استشہاد کرتے ہیں۔ لہٰذا نحو و صرف کے قواعد کو خود قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے قرآن اصل ہے اور وہ قوانین اس کی فرع، لہٰذا آپ قرآن کریم کو ان نحوی و صرفی قواعد و قوانین میں جکڑنے کی غلطی نہ فرمائیں"۔

(۷) جسارت ۸۳-۸-۲۶

لیکن محترم عثمانی صاحب نحو و صرف کے قواعد کے متعلق ہمیں یہ یاد دلاتے ہوئے خود بھول جاتے ہیں کہ فقہی اصول و ضوابط بھی نزولِ قرآن کے بعد ہی مرتب ہوئے تھے میں ان کی خدمت میں اِن ہی کا ارشاد معمولی لفظی تغیر سے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"مولانا عثمانی صاحب محترم اتنی بات یاد رکھیں کہ "فقہی اصول و ضوابط" قرآن کے بعد (دوسری صدی ہجری میں) مرتب ہوئے تھے اور "علماءِ فقہ" اپنے قواعد و ضوابط کے لئے خود قرآن کریم سے استشہاد کرتے ہیں لہٰذا "فقہی قواعد" کو خود قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے قرآن اصل ہے اور فقہی قوانین اس کی فرع ہیں۔ لہٰذا آپ قرآن کریم کو

ان "فقہی قواعد و قوانین" میں جکڑنے کی غلطی نہ فرمائیں۔"

حق تو یہ تھا کہ محترم عثمانی صاحب مطلق اور مقید کی بحث سے متعلقہ اس قرآن اور زیر بحث فقہی قاعدہ / فقہی قاعدے کا قرآن کی روشنی میں بے لاگ جائزہ لیتے مگر وہ الٹا اس فقہی قاعدے کو ایک طے شدہ "اصل" قرار دے بیٹھے ہیں اور خود قرآن کریم کو ایک ایسی فرع جسے وہ "اصل" کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔

ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

آئیے! اب ہم اس فقہی قاعدے کا قرآن کی روشنی میں مطالعہ کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم عربی مبین میں، اہل عرب پر نازل ہوا تھا جو خود اپنے امور حیات میں مطلق احکام کو مقید احکام کی قیود پر محمول کیا کرتے تھے قرآن نے ان کے اس معاشرتی عرف کو شرعی امور میں بھی برقرار رکھا ہے چنانچہ قرآن میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں مثلاً قرآن ایک مقام پر بیان کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ (۳۵/۷) — جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے بخشش اور بڑا اجر ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر قرآن کے الفاظ یہ ہیں

...اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ (۱۱/۱۱) — ...ہاں مگر وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کئے ان کے لئے بخشش اور بڑا اجر ہے۔

پہلی آیت میں "مغفرت" اور "اجر کبیر" کے انعام کو قید ایمان سے مقید کر کے بیان کیا گیا ہے لیکن دوسری آیت میں اسی انعام کو محض "اعمال" پر موقوف قرار دیا گیا ہے یہاں "ایمان" کی قید مفقود ہے۔ اب مطلق کو مطلق اور مقید کو مقید رکھنے کے اصول کی بناء پر کیا یہ طے پائے گا کہ "مغفرت" اور "اجر کبیر" کے لئے "ایمان" کی شرط سرے سے کوئی شرط ہی نہیں ہے؟ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ایمان کی طرف دعوت دینا فعل عبث اور کار لغو قرار پاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی عرف میں نیک اعمال کا نافع اور موجب فلاح ہونا "ایمان" کی قید سے مقید ہے خواہ اس قید کا ذکر موجود ہو یا نہ ہو اگر ایک مقام پر ایمان کی قید موجود ہو اور دوسرے مقام پر یہ قید معدوم ہو تو اس مطلق حکم کو قیدِ ایمان سے مقید ہی تصور کیا جائے گا۔ مثلاً ایک مقام پر قرآن بیان کرتا ہے کہ

لَاخَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ۔

"لوگوں کی باہمی سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہے ماسوا اس صورت کے کہ کسی کو صدقہ بھلی چیز یا اصلاح بین الناس کا حکم دیتے ہوئے ایسا کرے"

یہاں صدقہ و خیرات کے حکم کرنے والے یا لوگوں کی اصلاح کی تلقین کرنے والے شخص کے متعلق مومن ہونے کی قید مذکور نہیں ہے تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ کافر د مشرک، لادین کمیونسٹ دہریہ جو کوئی بھی یہ "نیک اعمال" سرانجام دے وہ اللہ کے ہاں "اجر عظیم" کا حقدار ہے کیونکہ "مَنْ" کلمہ عموم کے لئے ہے؟ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ کہہ دے کہ آیت کے آخری حصے میں "طلب رضاء الٰہی" کی قید موجود ہے۔ جو عامل کے قطعی مومن ہونے کی علامت ہے تو یہ ایک غلط فہمی ہے قرآن میں "طلب رضائے الٰہی" کے حصول کو آیت ۵ میں مشرکین مکہ کا فعل بھی قرار دیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ "طلب رضاءِ الٰہی" محض مومنین ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

بہر حال یہ بات واضح ہے کہ اسلامی معاشرے میں عرف عام کا یہ تقاضا ہے کہ نیک اعمال کے نتیجہ خیز ہونے میں "ایمان" کی قید لازم اور ضروری ہے خواہ اس کا ذکر اعمال کے ساتھ مذکور ہو یا نہ ہو چنانچہ ایسی آیات کے اطلاق کو جہاں نیک اعمال کو بلا قیدِ ایمان نافع اور نتیجہ خیز قرار دیا گیا ہے ایمان سے مقید آیات پر محمول کیا جائے گا۔

محترم عثمانی صاحب سے ہمیں شکایت، یہ ہے کہ وہ فقہی قواعد کو تو "اصل ماخذ شریعت۔ قرآن؟ یا فقہی قواعد؟" کا درجہ دے کر اس کی بالاتری کو قبول فرما لیتے ہیں مگر خود قرآن کو اصل کا درجہ دینے کی بجائے اس "فقہی قانون" کی روشنی

میں ثانوی درجے میں رکھ کر اس کا مطالعہ فرماتے ہیں اگر کوئی شخص (فقہی قواعد کی بنیاد پر نہیں بلکہ) احادیث نبویہ کی بنیاد پر قرآن کے اطلاق کو مقید کرتا ہے تو محترم عثمانی صاحب اور ان کے ہم خیال اصحاب یہ پکار اٹھتے ہیں کہ

"حق تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں (اگر میں غلطی نہیں کر رہا) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل ماخذِ شریعت قرآن کریم نہیں ہے بلکہ روایات و آثار ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۲۸)

کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ روایات و آثار کو "ماخذِ شریعت" نہ مانتے ہوئے صرف اور صرف قرآن ہی کو "ماخذِ شریعت" ماننے کا دعویٰ کرنے والے "فقہی قواعد" کو ایسا "ماخذِ شریعت" تسلیم کر رہے ہیں کہ خود قرآن کا مطالعہ انہی قواعد کی روشنی میں ہو رہا ہے۔

ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

مولانا طاہر مکی صاحب ارشاد فرماتے ہیں

"اگر ہم نے یہاں بجائے روایات کو کلام الٰہی کے ماتحت کرنے کے کلام الٰہی کو روایات کے ماتحت کر دیا تو پھر آفتابِ قرآنی کی روشنی روایات کے کثیف بادلوں کے تحت کہاں نظر آسکتی ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۲ ص ۱۳)

کیا یہ مقامِ تعجب نہیں کہ آفتاب قرآنی کی روشنی روایات حدیث کے کثیف بادلوں کی اوٹ سے تو نظر نہیں آسکتی مگر "فقہی قواعد" کے دھوئیں میں سے صاف نظر آجاتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حقیقت یہ ہے کہ محترم عثمانی صاحب تہذیبِ مغرب سے بری طرح متاثر بلکہ مرعوب ہیں فرنگی تہذیب کا طلسم ان کے حواس و مشاعر اور قلب و ذہن کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا ہے ان کا دل و دماغ وقت کی غالب تہذیب کے اصول و مبادیات پر ایمان لا چکا ہے مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے

عثمانی صاحب کا فکری خمیر

قرآن کو برملا چھوڑ دینے کی ان میں ہمت نہیں ہے اس لئے کتاب اللہ کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان انہوں نے یہ راہ اختیار کی ہے کہ مغربی تہذیب کے زیر اثر جو اصول واقدار انہوں نے اختیار کر رکھے ہیں قرآن کی تاویل بلکہ تحریف کے ذریعے سے انہیں مبنی برحق ثابت کر ڈالا جائے اس حکمت عملی کا انہیں یہ فائدہ بھی رہا کہ

ع رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

میری صاف گوئی اگر انہیں ناگوار خاطر نہ گزرے تو میں عرض کروں کہ وہ نہ تو قرآن ہی کو "اصل" قرار دیتے ہیں اور نہ ہی احناف کے فقہی اصولوں کو۔ ان کے نزدیک "اصل" تو صرف وہ افکار و اقدار ہیں جو تہذیب مغرب کی مرعوبیت میں ان کے قلب و دماغ پر حاوی ہو چکے ہیں اگر ان افکار و نظریات کی حمایت و پاسداری فقہ حنفی کے اصولوں کے تحت ہوتی نظر آئے تو وہ بتکلف حنفی بن جاتے ہیں لیکن اگر ان کے افکار کی تائید و توثیق حنفی اصولوں سے نہ ہو سکے تو پھر وہ مجتہد مطلق بن کر قرآن کے "اصل" ہونے کا راگ الاپتے ہوئے "فری سٹائل" استدلال فرماتے ہیں۔ انہیں نہ قرآن کی فکر ہے اور نہ فقہ حنفی کے قواعد و ضوابط کی۔ انہیں بس اپنے "معتقدات" ہی کی فکر ہے جن کا اولین منبع و مصدر بہرحال قرآن نہیں ہے اگر ایک مقام پر احناف کا کوئی فقہی قاعدہ ان کے لئے مفید مطلب ہوتا ہے تو وہ اسے زور و شور سے حنفی بن کر ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں لیکن اگر وہی اصول کسی وقت فقہی قاعدے سے تمسک ان کے مفاد کے خلاف ہو جائے تو چپکے سے اسے رد کر دیتے ہیں۔ اسی مطلق اور مقید احکام سے متعلقہ فقہی قاعدے کو لیجئے محترم عثمانی صاحب ایک مقام پر تو اس اصول سے تمسک اختیار کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ

> "قتل میں ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ضروری ہوگا (کیونکہ اس کفارہ میں رقبۃ مومنۃ کی قید لگی ہوئی ہے) اور دوسرے کفاروں (مثلاً ظہار اور یمین وغیرہ کے کفاروں میں) صرف غلام کو آزاد کرنا ضروری ہوگا خواہ مومن ہو یا کافر ہو۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۱)

رقبۃ مومنۃ یعنی مومن غلام کی آزادی والے کفارے میں تو محترم عثمانی صاحب مطلق اور مقید احکام والے فقہی قاعدے کی پابندی بڑی سختی سے کرتے ہیں لیکن عدالتی گواہوں کے عادل ہونے کے معاملے میں اس قاعدے کو پشت دے جاتے ہیں اور شہادت کے سلسلے میں عدالت وثقاہت کی قید صرف ان آیات تک ہی محدود نہیں رکھتے جن میں یہ شرط موجود ہے بلکہ مطلق شہادت میں اس کے قائل بن جاتے ہیں چنانچہ ایک مقام پر وہ مجھے بڑے **اسی فقہی قاعدے سے دست بردار** ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

"قاسمی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ شہادت کے لئے جو شرائط آپ نے بیان فرمائی ہیں یعنی (۱) مشاہداتی قوت (۲) قوتِ استحضار (۳) ذہن وزبان کی قوتِ بیان (۴) عدالت وثقاہت۔ یہی اخبار نبویؐ میں بھی ہوتی ہیں دونوں کے اوصاف یکساں ہیں اس کے بعد خبر اور شہادت میں فرق کرنا کسی عالم کو زیب نہیں دیتا[1]" (۳) جسارت ۸۳-۷-۲۹

اگر محترم عثمانی صاحب واقعی اس فقہی قاعدے کی پیروی میں مخلص ہیں تو انہیں عدالتی شہداء کے بارے میں بھی اسی طرح یہ فرمانا چاہیئے جس طرح غلام کی آزادی والے کفارے میں فرما چکے ہیں کہ

"عورت کے امساک ومفارقت کی صورت میں اور وصیت کے سلسلے میں گواہوں کے لئے عدل کی شرط ضروری ہے (کیونکہ ان مقامات پر ذَوَا عَدْلٍ اور ذَوَیْ عَدْلٍ کی قید لگی ہوئی ہے) اور دوسرے مقدمات میں (مثلاً زنا وقذف وغیرہ کے مقدمات میں) مطلق گواہ ضروری ہیں خواہ عادل ہوں یا فاسق، بالغ ہوں یا نابالغ، مومن ہوں یا کافر"

کیا محترم عثمانی صاحب اپنے اس فقہی قاعدے کی پاسداری کرتے ہوئے یہ اعلان فرمائیں گے؟

---

[1] میرے اس اقتباس کو غلط طور پر پیش کر کے محترم عثمانی صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔

خیر چھوڑیئے اس بحث کو! ہم محترم عثمانی صاحب سے ایک اور سیدھا سادا سوال
ایک اور مثال کرتے ہیں کہ ـــــ قرآن نے آیت ۹ میں مستحقین زکوٰۃ کی جو فہرست دی ہے اس میں "ایمان" اور "اسلام"، کی قید کے بغیر مطلق فقراء و مساکین اور غارمین ورقاب وغیرہ کا ذکر ہے سوال یہ ہے کہ اسلامی بیت المال میں جمع شدہ اموالِ زکوٰۃ کو مطلق فقراء و مساکین وغیرہ پر خرچ کیا جائے گا خواہ وہ کافر، دہریہ یا مشرک ہوں؟ یا صرف مومن و مسلم مستحقین پر خرچ کیا جائے گا۔؟؟ اگر آپ یہ جواب دیں کہ "اسلامی بیت المال کی زکوٰۃ صرف مومن و مسلم مستحقین پر ہی خرچ ہوگی" تو آپ کا یہ فقہی اصول ـــــ "کہ مطلق کو مطلق رکھو اور مقید کو مقید رکھو" ـــــ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اگر آپ یہ جواب دیں کہ "مسلمانوں کے اموال زکوٰۃ، کفار کے فقراء و مساکین وغیرہ پر بھی خرچ کیے جائیں" (کیونکہ آپ کے فقہی قاعدے کا یہی تقاضا ہے) تو اس کے نتیجے میں اسلام "کفر شکن" نہیں بلکہ "کفر پرور" بن جاتا ہے اور اسلامی بیت المال کا (نظریاتی اصول نہ سہی لیکن) عملی اصول یہی بن جاتا ہے کہ ـــــ "مسلم اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کرو اور کفار مستحقین کو لوٹا دو" ـــــ اس کے بعد پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کفر کے ساتھ اس فیاضانہ سلوک کے بعد اسلام یہ کیوں کہتا ہے کہ

> "ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ و فساد کا قلع قمع ہو جائے اور دین اللہ ہی کے لئے خالص رہ جائے" (البقرہ )

اب ذرا ان عقلی مصالح پر بھی ایک نظر ہو جائے جو محترم عثمانی صاحب نے اس
عثمانی صاحب کے عقلی مصالح فقہی قاعدے کے حق میں پیش فرمائے ہیں۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

> "ہمارے نزدیک (یعنی حنفیہ کے نزدیک) مطلق حکم کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا اگرچہ دونوں حکم ایک ہی حادثے میں صادر ہوئے ہوں کیونکہ دونوں پر عمل کرنا ممکن ہے دونوں کے درمیان نہ کوئی تضاد ہے اور نہ کوئی تنافی ہے" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۹)

محترم عثمانی صاحب اس فقہی قاعدے کو شرف قبولیت بخشتے وقت صرف یہی مصلحت دیکھتے ہیں کہ ــــ "دونوں پر عمل کرنا ممکن ہے" ــــ اور یہ کہ ــــ "دونوں کے درمیان نہ کوئی تضاد ہے اور نہ کوئی تنافی ہے" ــــ اگر یہی بات ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ یہ دلیل کم نظری ہے "تضاد" اور "تنافی" کی معدومیت اور "امکانِ عمل" سے بھی پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کہیں ہمارا امتثالِ امر شریعت اسلامیہ کے بنیادی اصولوں اور اولین مقاصد کے تو خلاف نہیں ہوگا؟ اور اگر ایسا ہو تو اس طرح کے "فقہی قواعد" کو چپکے سے لپیٹ کر رکھا جا سکتا ہے۔ مگر دین و شریعت کے بنیادی مقاصد کی خلاف ورزی کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کی جا سکتی ہے۔

آیئے اب ہم یہ جائزہ لیں کہ "تحریر رقبۃ" کے سلسلے میں مطلق کو

**اس فقہی قاعدے کی پابندی کا نتیجہ ۔ مقاصد شرعیہ کی خلاف ورزی**

مطلق اور مقید کو مقید رکھنے کا نتیجہ کس طرح مقاصد شرعیہ کے خلاف نکلتا ہے۔

اسلامی شریعت کے اولین مقصد کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ

اِخْرَاجُ النَّاسِ مِنْ عُبُوْدِيَّةِ الْمَخْلُوْقِ اِلٰى عِبَادَةِ الْخَالِقِ — لوگوں کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر خالق کی غلامی میں سونپ دینا۔

اب اگر آپ نے کفارے میں "مطلق غلام" کی آزادی کے حکم کی پیروی میں ایک

**فقہی قاعدہ اور مومن غلام کی آزادی**

"مومن" غلام کو آزاد کر دیا تو آپ نے شریعت اسلامیہ کے اس اولین مقصد کو پورا کر دیا "مومن" غلام کو مخلوق کی غلامی سے نجات دی اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدائے واحد کی پرستش اور بندگی و طاعت کے لئے فارغ کر دیا۔

لیکن اگر آپ نے مطلق حکم کو مطلق رکھتے ہوئے ایک "کافر" غلام کو آزاد کر دیا تو نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نا کہ آپ نے اُسے شجر و حجر شمس و قمر، صلیب و وثن اور اکابر و مقابر کی پرستش اور بندگی کے لئے فارغ کر دیا تاکہ آپ کی غلامی سے فارغ ہو کر وہ خوب بت پرستی کرے، باطل کی دل کھول کر حمایت کرے برائی کو جی بھر کر فروغ دے

نیکی کا ہر ممکن سد باب کرے یہاں تک کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں ایک دن وہ آپ ہی کا سر کاٹنے کے لئے معرکۂ قتال میں آپ کا مد مقابل ہو جائے اور آپ اپنے نمک خوار کی تیغِ ستم کا شکار ہو جائیں، اس سے قبل کہ آپ کی زبان پر یہ حسرت بھرے الفاظ آئیں کہ ؎

جنہیں آغوش میں پالا وہی تیغِ ستم نکلے
کیا بے درد موجوں نے کلیجہ چاک ساحل کا

یہ نتیجہ ہے مقاصد شریعت کو پسِ پشت ڈال کر قرآن کو فقہی قواعد و ضوابط میں جکڑ دینے کا۔ لیکن ہمارے بزرگ بڑی سطحی فکر کے ساتھ اور بڑی سادگی کے ساتھ بس یہ دیکھ کر وعظ فرما رہے ہیں کہ ــــ "مطلق حکم کو مقید حکم پر محمول نہیں کیا جا سکتا ........ کیونکہ دونوں پر عمل کرنا ممکن ہے دونوں کے درمیان نہ کوئی تضاد ہے اور نہ کوئی تنافی ہے" ــــ

آئیے اب اس بات کا جائزہ لیں کہ ظہار کے کفارے میں "مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا"

**فقہی قاعدہ اور کفارۂ ظہار**

کی قید کی کیا حیثیت ہے۔

قرآن نے ظہار کے لئے تین کفارے بیان کئے ہیں۔

۱۔ تَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا — غلام کو آزاد کرنا قبل اس کے کہ زوجین ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔

۲۔ صِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا — دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔

۳۔ اِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا — ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا۔

محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"اس اصول کے مطابق (یعنی مطلق کو مطلق اور مقید کو مقید رکھنے کے اصول کے مطابق) ظہار میں کفارہ کے روزے رکھنے اور غلام کو آزاد کرنے میں اس قید کی پابندی ضروری ہوگی کہ دونوں کفارے

ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ادا کئے جائیں لیکن ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا کفارہ ہاتھ لگانے سے پہلے ادا کیا جا سکتا ہے اور بعد میں بھی۔ (کیونکہ پہلے دونوں کفاروں میں "من قبل ان یتماسا" کی قید لگی ہوئی ہے اور ساتھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کے حکم میں یہ قید نہیں ہے حالانکہ تینوں کفارے ایک ہی واقعہ یعنی ظہار میں واقع ہوتے ہیں)۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۹)

عربی ادب سے واقف حضرات اس امر سے شناسا ہیں کہ قرآن نے قانونی احکام کو بیان کرتے ہوئے فصاحت و بلاغت کے ادبی معیار کو بھی برقرار رکھا ہے اور کسی مقام پر ایسی بیجا تکرار سے کام نہیں لیا جو اصولِ فصاحت و بلاغت کے منافی ہو چنانچہ اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنی عبارت جس قدر افصح، اوجز اور ابلغ واقع ہوئی ہے اس سے زائد ممکن ہی نہیں ہے۔ قرآن نے پہلے اور دوسرے کفارے کا ذکر کرتے ہوئے "مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَاسَّا" کی قید لگائی اگر تیسرے کفارے میں بھی اس قید کا اضافہ کر دیا جاتا تو کلام میں بے جا تکرار عبارت کے حسن کو غارت کر دیتا اگر صرف پہلے کفارے ہی کے ساتھ یہ قید لگائی جاتی تو یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید یہ قید پہلے کفارے ہی کے ساتھ خاص ہے اگر صرف دوسرے کفارے ہی کے ساتھ یہ شرط مذکور ہوتی تو اسی کے ساتھ اس شرط کے مخصوص ہونے کا احتمال پیدا ہو سکتا تھا اور اگر یہ قید فقط تیسرے کفارے ہی کے ساتھ لگتی تو اس کا گمان ہو سکتا تھا کہ شاید اس کا تعلق آخری کفارے ہی کے ساتھ ہے اب قرآن نے کیا یہ کہ پہلے دونوں کفاروں کے ساتھ یہ شرط لگا دی اور تیسرے کفارے کے معاملے میں (جو اپنی خصوصیت کے اعتبار سے پہلے کفارے کے ساتھ مشابہ ہے) سکوت اختیار کیا تاکہ اسے اول الذکر دونوں کفاروں میں سے اس کے مشابہ کفارے کے بیان کے حوالے کیا جا سکے۔

اب یہ بات بادنیٰ تامل ظاہر ہے کہ پہلا کفارہ (یعنی غلام کو آزاد کرنا) ایک

قلیل المدت کفارہ ہے، ظہار کے بعد اس کفارے کو ادا کرنے میں کوئی زیادہ مدت نہیں لگتی۔ اگر غلام کسی کے پاس نہ بھی ہو تو ایک دن میں اسے خرید کر آزاد کیا جا سکتا ہے جبکہ دوسرا کفارہ طویل المدت کفارہ ہے جو مکمل ادائیگی کے لئے دو ماہ تک کی مدت چاہتا ہے رہا تیسرا کفارہ تو وہ پہلے کفارے ہی کی طرح قلیل المدت کفارہ ہے جسے (پہلے کفارے کی طرح) ایک دن میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اب قرآن پہلے (قلیل المدت) کفارے کے بیان میں اور دوسرے (طویل المدت) کفارے کے بیان میں "مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَاسَّا" کی قید لگا کر تیسرے کفارے میں (جو قلیل المدت کفارہ ہونے میں پہلے کفارے ہی کے مشابہ ہے) سکوت اختیار کر لیتا ہے تاکہ اسے پہلے کفارے کے بیان پر محمول کر لیا جائے بالکل اسی طرح جس طرح قرآن، زیر طلاق عورت کے امساک یا مفارقت (اور وصیت) کے معاملہ میں گواہوں کے "عادل" ہونے کی شرط لگا کر قذف و زنا کے گواہوں کے اوصاف کے بارے میں سکوت اختیار کر لیتا ہے تاکہ اسے اول الذکر مقدمات کے گواہوں کے اوصاف پر محمول کر لیا جائے۔

یہ ہے "مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَاسَّا" کی قید کی حقیقت!

## عثمانی صاحب کے فکر کی ایک بنیادی خامی

محترم عثمانی صاحب کے فکر کی ایک بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم کے تعین کے لئے حاملِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کی بجائے فقہاء کی طرف رجوع کرتے ہیں، میں نے ان کی کتب میں اکثر و بیشتر یہ محسوس کیا ہے کہ وہ الفاظِ قرآن کا مفہوم متعین کرنے کے لئے احادیث نبوی سے گریزاں ہوتے ہوئے، سیدھے فقہی قواعد و ضوابط میں آن الجھتے ہیں۔

## مستحقینِ زکوٰۃ۔ کفار یا مسلم؟

مستحقین زکوٰۃ کی فہرست میں مطلق فقراء و مساکین وغیرہ کا ذکر ہے محترم عثمانی صاحب کے فقہی قاعدے کی بنیاد پر تو اس مطلق حکم کو مطلق رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے مستحق کافر فقراء اور مشرک مساکین وغیرہ

بھی ہو سکتے ہیں لیکن اگر صاحب قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں وہ اس آیت کا مطالعہ فرماتے تو انہیں محسوس ہو جاتا کہ مسلم اغنیاء کی طرف سے جمع شدہ زکوٰۃ کے مستحق (مطلق فقراء و مساکین وغیرہ نہیں ہیں بلکہ) صرف اور صرف مومن و مسلم فقراء و مساکین وغیرہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی تقریباً تمام کتب احادیث میں موجود ہے میں صرف دو کتابوں کے حوالے سے یہ حدیث پیش کر رہا ہوں کہ

"حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو آپ نے انہیں یہ ہدایات دیں کہ اہل یمن کو توحید (لا الٰہ الا اللہ) اور رسالت (محمد رسول اللہ) کی دعوت دیں اگر وہ یہ مان لیں تو انہیں یہ بتائیں کہ اللہ نے ان پر پانچ نمازیں دن رات میں فرض کی ہیں اگر وہ یہ مان لیں تو انہیں یہ بتائیں کہ اللہ نے ان کے اموال میں صدقہ متعین کیا ہے (یعنی زکوٰۃ) جو ان کے اغنیاء سے لے کر ان ہی کے فقراء پر تقسیم کیا جائے گا (تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَاءِهِمْ)

(صحیح بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ، کتاب استتابۃ المرتدین۔ کتاب المغازی، باب بعث ابی موسیٰ و معاذ۔ صحیح مسلم۔ کتاب الجہاد، باب الامر بالتیسیر۔ کتاب الایمان، باب الامر بالاللہ ورسولہ)

یہ ارشاد نبوت آیت کے مطلق حکم کو مومن مستحقین تک محدود و مقید کر رہا ہے۔

اس طرح اگر قرآن کے آزادیٔ غلام کے مطلق حکم کو تعلیمات نبوی کی روشنی میں دیکھا جائے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق "رَقَبَة" کو ایمان و اسلام کی قید سے مقید فرمایا ہے۔ چنانچہ کتب حدیث میں

**آزادیٔ غلام۔ غلام مسلم یا کافر؟**

یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاویہ بن الحکم رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک کنیز کو اس کی کسی کوتاہی پر تھپڑ دے مارا تو وہ ندامت کے ساتھ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور اس واقعے کا ذکر کیا اور ساتھ ہی استفسار

یہ بھی عرض کیا کہ

"اے اللہ کے رسول! میں اسے آزاد کر دوں؟ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسے میرے پاس لے آؤ" وہ اسے لے کر آئے تو آپ نے اس کنیز سے پوچھا "اللہ کہاں ہے؟" اس نے جواب دیا "آسمان میں" پھر آپ نے پوچھا "میں کون ہوں؟" اس نے کہا "آپ اللہ کے رسول ہیں" تب آپ نے فرمایا "اس کو آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے"

(مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ۔ باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ)

یہاں یہ واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کنیز کو اس وقت تک آزاد کرنے کا حکم نہیں دیا جب تک کہ آپ نے خود بنفسِ نفیس اس کے مومنہ و مسلمہ ہونے کی تحقیق نہیں فرمالی حالانکہ معاویہ بن الحکم نے جب اس کی آزادی کا ارادہ فرمایا تھا تو آپ کنیز کے مومنہ ہونے کی تحقیق کے بغیر ہی اس کی آزادی کی اجازت مرحمت فرما سکتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غلاموں کی آزادی میں خود آپ نے "مطلق رقبہ" کو شرطِ ایمان سے مقید فرمایا ہے۔

اب غلام کی آزادی کے حکم کے اطلاق میں تقیید کی قرآنی دلیل بھی ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن نے کافر بے ایمان اور مشرک لوگوں کو رِجس (فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ اِنَّهُمْ رِجْسٌ۔ ۹/۹۵) کہا ہے۔ ایک مقام پر نجس بھی کہا گیا ہے (اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ۔ ۹/۲۸) کہیں نفاق و کفر کا شکار ہونے والوں کو خبیث بھی قرار دیا گیا ہے (لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ..... فَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا۔ ۸/۳۷) اب جب کہ کافر، منافق، غیر مسلم اور مشرک سب نجس، رجس اور خبیث قرار پائے اور اہل ایمان اور مسلمان طیب قرار پائے تو بہر حال یہ واضح ہے کہ ناپاک و پلید اشیاء، پاکیزہ و طیب اشیاء کے برابر نہیں ہو سکتیں (لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ۔ ۵/۱۰۰) لہٰذا ایک کافر مشرک (خواہ وہ آزاد ہی ہو) سے ایک غلام آدمی جو صاحب ایمان ہو، بہر حال بہتر ہے

تقیید مطلق پر قرآنی دلیل

(وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ ۔ ۲۲۱/۲) جب مومن غلام آزاد کافر سے بہتر ٹھہرا تو مومن غلام، کافر غلام سے بدرجۂ اولیٰ بہتر قرار پایا۔ اس لئے کہ کافر بہرحال پلید و ناپاک ہے۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ (تم بُری چیز کا ارادہ بھی نہ کرو۔ ۲/۲) پس قرآن خود یہ ترغیب دیتا ہے کہ مطلق اشیاء میں سے چھانٹ کر اچھی اشیاء کو وقف للہ کیا کرو اور یہ ظاہر ہے کہ کافر غلام کی نسبت مومن غلام کو آزاد کرنے میں شرعی مقاصد کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے اس طرح قرآن کی روح خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مطلق غلام کو آزاد کرنے کے حکم میں بھی مومن غلام کو آزاد کرنا ہی اقرب الی الصواب ہے۔

بہرحال ہماری یہ بحث واضح کرتی ہے کہ مطلق اور مقید سے متعلق محترم عثمانی صاحب زیر بحث فقہی اصول کی صحیح پوزیشن! جس فقہی اصول کی پابندی کو اختیار فرما رہے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ

(۱) اسلام کے بنیادی مقصد کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔

(۲) قرآن کی میزان میں بھی یہ اصول پورا نہیں اترتا بلکہ

(۳) جمہور فقہاء بھی اس کے خلاف ہیں مثلاً ائمہ اربعہ میں سے صرف امام ابوحنیفہؒ اسے مانتے ہیں باقی ائمہ قطعاً اس کے قائل نہیں ہیں اب جبکہ تین ائمہ (امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ) ایک طرف ہیں اور صرف احناف ایک طرف ہیں اور خود محترم عثمانی صاحب بھی یہ اعلان کرنے میں وسیع القلب ہیں کہ

"دیگر ائمہ کے مسالک کو بھی ہم غلط نہیں سمجھتے ہم اس امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حنفی مسلک غلط ہو اور دیگر ائمہ کا مسلک صحیح ہو۔"

(فقہ القرآن ج ۱ ص ۵۱)

تو پھر اس فقہی قاعدے کی پابندی کیسی؟ جس کو وہ خود کئی مقامات پر ترک کرنے پر مجبور ہوئے ہیں؟ اس فقہی ضابطے کو مان کر عملاً اس کی پابندی نہ کر پا سکنے کی نسبت کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس سے مالکیہ، حنابلہ اور شوافع کی طرح انکار ہی کر ڈالا

جائے ؟ ؟ لیکن نہیں ! محترم عثمانی صاحب یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس (فقہی قاعدے) کا انکار نہیں کریں گے۔ سہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کیوں ؟ اس لئے کہ مغربی تہذیب کی مرعوبیت کے زیر اثر "فقہ القرآن" کے تقریباً آدھے مسائل کے لاشے تو اسی فقہی قاعدے کی بیساکھیوں کے سہارے کھڑے کئے گئے ہیں اس سے ان کا انکار کرنا گویا اپنے ہاتھوں اپنی کتاب کی تردید و تغلیط کے مترادف ہے، لہٰذا موصوف محترم اپنی زبان وقلم سے تو اس فقہی قاعدے کا انکار نہیں فرمائیں گے لیکن عملاً جہاں دل چاہے گا اسے مسترد کرتے ہوئے مقید پر مطلق کو محمول فرمالیں گے، چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے،

ترکِ قاعدہ کی پہلی مثال | سورہ احزاب کی آیت ۳۵ میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے لئے اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے ان میں لْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ کے الفاظ ہیں یہاں زیر بحث فقہی ضابطے کے اعتبار سے مردوں کے فعل حفاظت کو فُرُوْجَهُمْ کے مفعول سے مقید کیا گیا ہے لیکن خواتین کے فعل حفاظت کو مطلق رکھا گیا ہے جس کا مطلب (زیر بحث فقہی ضابطے کی روشنی میں) یہ ہے کہ مردوں کے لئے تو یہ اجرِ عظیم ان کی شرمگاہوں کی حفاظت کے ساتھ مشروط ہے مگر خواتین کے لئے شرمگاہوں کی حفاظت ضروری نہیں وہ جس چیز کی بھی حفاظت کرلیں (مثلاً شوہر کے رازوں کی حفاظت، اثاث البیت کی حفاظت اپنی قسموں کی حفاظت وغیرہ) ان کے لئے اجرِ عظیم کھرا ہے۔ لیکن مردوں کے لئے بہرحال شرمگاہوں کی حفاظت لازم ہے کیونکہ ان کا ذکر مشروط و مقید انداز میں کیا گیا ہے مگر خواتین کا ذکر کسی مفعول کی قید سے مقید نہیں ہے لیکن جناب عثمانی صاحب اس آیت کا مفہوم جب بیان کرتے ہیں تو عورتوں کے مطلق فعلِ حفاظت کو مردوں کے مشروط و مقید فعل پر محمول کرتے ہوئے وہی قید یہاں بھی لگا دیتے ہیں۔

" اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کا پابند رکھ سکتے ہیں تو عورتیں (

اس ضمن میں مردوں سے کچھ آگے ہی ہیں (والحافظین فروجھم والحافظات)۔ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۹۵)

اسی آیت میں دوسری مثال جس میں موصوف محترم نے اپنے اس فقہی ضابطے

دوسری مثال | کو پسِ پشت ڈال دیا ہے وَالذَّاكِرِينَ اللهَ كَثِيرًا وَّالذَّاكِرَاتِ کے الفاظ میں واقع ہے۔ مردوں کے فعلِ ذکر کو بلحاظ مفعول "اللہ تعالیٰ" کی ذات کے ساتھ اور بلحاظ مقدار "کثرت" کی قید کے ساتھ بیان کیا ہے اور خواتین کے فعلِ ذکر کو کسی بھی قید کے بغیر مطلق بیان کیا گیا ہے لیکن محترم عثمانی صاحب جب آیت کا مفہوم و مطلب بیان فرماتے ہیں تو خواتین کے فعلِ ذکر کو بھی اُن قیود سے مقید فرما ڈالتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں صرف مردوں کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

"اگر مردوں میں یہ قدرت پائی جاتی ہے کہ وہ ہر وقت قانونِ الٰہی کو پیش نظر رکھیں اور کبھی اسے نظر انداز نہ کریں تو یہی قدرت عورتوں میں بھی ہے (وَالذَّاكِرِينَ اللهَ كَثِيرًا وَّالذَّاكِرَاتِ) (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۹۶)

"اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے مرد اور بکثرت یاد کرنے والی عورتیں"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۵۵)

یہ دونوں جملے جن میں موصوف محترم بیساختہ اور لاشعوری طور پر مطلق کو مقید پر محمول کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اگرچہ اپنی ساخت کے اعتبار سے خبریہ جملے ہیں لیکن اصل مقصود کے لحاظ سے ان جملوں میں حکم کا پہلو پایا جاتا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ لوگ اس پر مامور ہیں کہ وہ ان صفات کو اختیار کریں جو آیت میں موجود ہیں۔

اب تیسری مثال ملاحظہ فرمایئے جس میں محترم عثمانی صاحب نے ایک مطلق

تیسری مثال | حکم کو دوسرے مقید حکم پر محمول فرمایا ہے۔

قرآن جب وضو کا حکم دیتا ہے تو غُسْلِ يَدَيْنِ کو اِلَى الْمَرَافِقِ (یعنی کہنیوں تک) کی قید سے مقید کرتا ہے اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (جب تم نماز کے لئے کھڑے ہوا کرو تو اپنے چہروں کو

اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں کو دھو لیا کرو) لیکن جب قرآن تیمم کا ذکر کرتا ہے تو اِلَی الْمَرَافِقِ (یعنی کہنیوں تک) کی قید کا ذکر نہیں کرتا ہے، بلکہ صرف یہ کہتا ہے کہ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ (اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر مسح کر لو) اس میں اختلاف ہوا کہ مسح میں ہاتھوں کی حد کیا ہے؟ ایک گروہ نے کہا کہ چونکہ تیمم میں ہاتھ کے کسی حصے کو مخصوص نہیں کیا گیا اس لئے جس حصۂ ہاتھ پر مسح کر لینے کے بعد عرف عام میں ہاتھ پر مسح کر لینے کا اطلاق ہو سکے اسی حصہ پر مسح کر لیا جائے دوسرے گروہ نے وضو کی قید (اِلَی الْمَرَافِقِ) کو تیمم پر بھی عائد کر دیا۔ محترم عثمانی صاحب خود اسی گروہ کے موقف کو اقرب الی القرآن قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"اس میں اختلاف ہے کہ ہاتھوں پر مسح کہاں تک کیا جائے مشہور مذہب تو یہی ہے کہ ہاتھوں پر مسح کی حد وہی ہے جو دھونے کی حد وضو میں بیان فرمائی گئی ہے ہمارے نزدیک یہی قول قرآن کریم سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۱ ص ۱۳۲)

صرف یہی نہیں کہ موصوف محترم نے مطلق کو مطلق اور مقید کو مقید رکھنے والے اپنے فقہی اصول کو یہاں عملاً ترک کر دیا ہے بلکہ اس کے لئے دلیل بھی وہ پیش کی ہے جو اس فقہی ضابطے کو نہ ماننے والے علماء حضرات پیش کیا کرتے ہیں ——— اب یہ ستم ظریفی بھی ملاحظہ فرمایئے کہ جس فقہی قاعدے کو وہ خود حسب ضرورت پشت دکھا دیتے ہیں اسی سے تمسک اختیار کرنے پر وہ یہاں تک زور دیتے ہیں کہ

"جب ایک ہی حادثہ میں بھی مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا تو جب دو حکم دو حادثوں کے متعلق صادر ہو رہے ہوں اور ان میں ایک مطلق اور دوسرا مقید ہو تو بطریق اولیٰ مطلق کو مقید نہیں کیا جائے گا۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۰)

اور زیر بحث مثال میں یہی صورت ہے کہ وضو الگ چیز ہے اور تیمم الگ چیز ہے لیکن وہ تیمم میں مسح الیدین کے لئے حد وضو سے لیتے ہیں۔

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ محترم عثمانی صاحب اپنے اس فقہی قاعدے کو پس پشت ڈالتے ہوئے شہادت کے تمام مقدمات میں گواہوں کو "عادل" قرار دینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اب میں ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جس میں انہوں نے **عثمانی صاحب کا متضاد طرز عمل** اپنے اس فقہی ضابطے کو بالخصوص مذکر کے صیغوں میں بھی ترک کر دیا ہے جبکہ وہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ

"قرآن میں تمام مسلمانوں کو جس میں مرد اور عورتیں دونوں داخل ہیں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ مذکر ہی کے صیغوں میں دیئے گئے ہیں اور مشترک مجمع کو جب خطاب کیا جاتا ہے تو مذکر ہی کے صیغوں میں خطاب کیا جاتا ہے۔" (۷) جسارت ۸۳ - ۸ - ۲۶

"قرآن کریم مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کرتا ہے اور جب مشترک مجمع کو خطاب کیا جاتا ہے تو مذکر کے صیغے ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ صفحہ ۲۰۴)

الغرض ہر مقام پر مذکر کے صیغوں کو مردوں اور خواتین دونوں کے لئے **اور اب یہ بھی** بڑے زور سے مشترک قرار دینے کے بعد ایک مقام پر خود محترم عثمانی صاحب اپنے اسی قاعدے کی مخالفت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

"واضح رہے کہ حلقِ رأس (یعنی حج کے موقع پر سر منڈانے کا حکم) صرف مردوں کے لئے ہے۔" (فقہ القرآن ج ۱ صفحہ ۴۰۹)

سوال یہ ہے کہ کیا حلق رأس کا یہ حکم مذکر کے صیغوں میں نہیں دیا گیا ہے؟ کیا یہاں قرآن مشترک مجمع کو خطاب نہیں کر رہا ہے۔؟؟ پھر نہ معلوم محترم عثمانی صاحب نے مشترک مجمع کے حکم کو عورتوں سے غیر متعلق قرار دیتے ہوئے محض مردوں کے لئے کس "قرآنی دلیل" سے خاص کر دیا ہے۔؟؟؟ آخر یہاں مطلق کو مقید کن براہین سے کیا جا رہا ہے۔؟؟ کیا قرآن نے یہ قید لگائی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو حوالہ دیجئے کیا کسی صحیح حدیث میں یہ قید لگائی گئی ہے۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو سوال یہ ہے کہ حدیث نے قرآن کے مطلق حکم کو مقید کیسے کر دیا جبکہ آپ ہی کا ارشاد گرامی

ہے کہ

"قرآن کا کوئی مطلق حکم قرآن ہی کے کسی مقید حکم سے مقید نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ کسی ایک ہی واقعہ میں اگر ایک حکم مطلق ہو اور دوسرا مقید ہو تب بھی مطلق کو مقید نہیں کیا جا سکتا بلکہ مطلق اپنے اطلاق پر قائم رہے گا۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۹)

کیا آپ "اجماع" سے قرآن کے اس مطلق حکم کو مقید فرما رہے ہیں۔؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو میں آپ ہی کا اقتباس آئینے کے طور پر پیش کئے دیتا ہوں

"رہ گیا اجماع تو اول تو وہ تیسرے درجے کی دلیل ہے کیونکہ دلائل شرعیہ کی ترتیب یوں ہے اول کتاب اللہ، دوم سنت رسول اللہ سوم اجماع، چہارم قیاس۔ تو جب سنت سے کتاب اللہ کے عام کو خاص اور مطلق کو مقید نہیں کیا جا سکتا تو تیسرے درجے کی دلیل یعنی اجماع سے یہ کیسے ممکن ہو سکے گا۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۳۰)

پھر یہ بوالعجبی بھی ملاحظہ فرمائیے کہ حلقِ رأس کی آیات میں محترم عثمانی صاحب مذکر کے مطلق (اور مرد و زن کے لئے مشترک) صیغوں کو فقط مردوں کے لئے مخصوص اور مقید بھی کر رہے ہیں تو قرآن کی بنیاد پر نہیں —— حدیث کی بنیاد پر بھی نہیں —— اجماع کی بنیاد پر نہیں —— بلکہ محض قیاس کی بنیاد پر یعنی چوتھے درجے کی دلیل سے جناب عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"عورتوں کے لئے سر منڈانا مکروہ ہے سر کے بال عورت کی زینت ہوتے ہیں ان کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے وہ اپنے بالوں کی ذرا ذرا سی پھنگلیں کتر دیں ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۱ ص ۴۰۹)

محترم عثمانی صاحب کو شاید اس بات کا خیال نہیں رہا کہ زینت (یعنی بالوں کی زینت) ایک اضافی اور تغیر پذیر قدر (RELATIVE AND VARIABLE VALUE) ہے جو زمان و مکان کے تغیر سے بدل جاتی ہے۔ ممکن ہے ایک شہر

اور ایک دہر میں سر کے پورے بال زینت سمجھے جاتے ہوں اور دوسرے مصر اور عصر میں کٹے ہوئے بال ہی زینت متصور ہوں۔ اب کیا آپ قرآن کے احکام کی تعبیر ان تغیر آشنا اقدار کی بنیاد پر کریں گے ــــــ؟

حقیقت یہ ہے کہ کسی اصول کو ماننا اور پھر ماننے کے باوجود عملاً اسے ترک کر دینا زندگی کو تناقضات اور تضادات کا شکار بنا دینے والا عمل ہے۔ محترم عثمانی صاحب تو تضادات کے بادشاہ ہیں۔ ایک مقام پر جو کچھ فرماتے ہیں دوسرے مقام پر اس کی تردید کر ڈالتے ہیں ایک جگہ کسی اصول کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں تو دوسری جگہ اسے پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ایک مقام پر ایک شخص کی طرف بدعقیدہ ہونے کی نسبت کرتے ہیں دوسرے مقام پر ان کی مدحت و توصیف پر اتر آتے ہیں تیسرے مقام پر پھر اس کی مذمت کرتے ہیں چوتھے مقام پر اس کی تقلید و پیروی پر فخر کرتے ہیں صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

**تضاد کی بنیادی وجہ**

**ابن جریر طبری کے متعلق محترم عثمانی صاحب کے متضاد اقوال**

ابن جریر طبریؒ کے متعلق ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں

"ابن جریر طبری کے متعلق تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ عقیدتاً شیعہ تھے۔"

(فقہ القرآن ج ۱ ص ۹۷)

پھر اسی ابن جریر طبری کا ایک حوالہ محترم عثمانی صاحب کے ہاں ایسا مل جاتا ہے جو ان کے لئے مفید مطلب ہوتا ہے۔ اب اسی عقیدتاً شیعہ شخص کے متعلق "مشہور مورخ" "مفسر" اور "علامہ" جیسے مدح آمیز القاب استعمال فرماتے ہیں۔

"قدیم دور کی مشہور شخصیات میں سے مشہور مورخ و مفسر علامہ ابن جریر طبری (جن کی تاریخ و تفسیر عموماً تمام مورخین و مفسرین کا ماخذ اول مانی جاتی ہے) عورت کے قاضی اور سربراہِ ریاست ہونے کے جواز کے قائل ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۷۴)

پھر ایک تیسرے مقام پر اسی ابن جریر طبری کی ایک تاریخی روایت جب

عثمانی صاحب محترم کے مفاد و مقصد کے خلاف پڑتی ہے تو اسے "دشمنِ صحابہ" اور "سبائیت زدہ مورخ" قرار دیتے ہیں

"ان حضرات نے صرف اس (جنگ جمل) کے ایک ہی پہلو پر نظر کی اور وہ بھی ایسی فضاء میں جو طبری، ابن اسحاق اور واقدی وغیرہ ایسے دشمنانِ صحابہ اور سبائیت زدہ مورخوں کے اڑائے ہوئے غبار سے کثیف ہو رہی تھی۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۲۹۸)

تب چوتھے مقام پر اسی "دشمن صحابہ" اور "سبائیت زدہ مورخ" کی تقلید و پیروی پر بڑا فخر اور ناز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"عثمانی تو امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور جناب طبری اور حضرت اشرف علی تھانوی کی تقلید کر رہا ہے۔"

(۷) جسارت ۸۳-۸-۲۶

یہ ہے محترم عثمانی صاحب کا معیار تحقیق اور اسی معیار تحقیق کا شاہکار ہے "فقہ القرآن" نامی کتاب جو تضادات و تناقضات اور اکاذیب و اباطیل سے اٹی پڑی ہے اور جس کے متعلق کتاب کے ناشر جناب ڈاکٹر حبیب الرحمان خان صاحب بڑے فخر و انبساط اور تحدّی آمیز الفاظ میں یہ بلند بانگ دعویٰ فرما رہے ہیں کہ

"یہ (کتاب فقہ القرآن جلد سوم) وقت کی پکار کا موزوں ترین جواب ہے اور بر وقت جواب ہے یقیناً یہ کتاب ----- عورت کے حقوق کو تسلیم نہ کرنے والوں کے لئے مسکت جواب ثابت ہو گی۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص۱۱)

ع جوبات کی خدا کی قسم لاجواب کی

# پانچویں فصل ۔ انتظامی مناصب، خواتین اور غیر قریشی حضرات

**میرا موقف** اپنے سابقہ مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاشرہ وحی کی روشنی میں تعمیر فرمایا تھا اس میں پورے جزیرہ عرب پر پھیلی ہوئی وسیع سلطنت میں کسی مقام پر بھی عورت کو عہدۂ قضاء عطا نہیں کیا گیا خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اب کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ خدا ورسول اور خلفائے راشدین سب غاصب تھے (معاذ اللہ) جنہوں نے عورت کے اس حق کو سلب کیے رکھا؟ ایک مسلم کے لئے نمونے کے اعتبار سے مثالی ریاست (                    ) وہ تھی جسے حضورؐ نے قائم فرمایا تھا یا وہ مغربی ریاستیں جن کی عملی روایات خود ان کی اپنی علمی تحقیقات کے خلاف ہیں۔"

(۲) جسارت ۸۳-۴-۳۰

**عثمانی صاحب کا جواب** اس کے جواب میں محترم عثمانی صاحب رقمطراز ہیں کہ

"گستاخی معاف! کسی بات کا عہد خلافت اور عہد رسالت میں نہ پایا جانا اس کے ناجائز ہونے کی دلیل نہیں ہزاروں کام ایسے ہیں جو عہد رسالت اور عہد خلافت میں نہیں ہوئے اصل مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے اگر اس پر قدغن نہیں لگائی تو اصولی طور پر خواتین کو سربراہِ مملکت تک بننے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ ہم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے فتوے کی روشنی میں ملکۂ سبا کے قرآنی تذکرے کے حوالے سے لکھ چکے ہیں۔"

(۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹

محترم عثمانی صاحب اگر ان "ہزاروں کاموں" کی فہرست دیدیتے تو ہم پر
میرا جواب الجواب | بڑا احسان فرماتے لیکن انہوں نے ان "ہزاروں کاموں" میں سے
صرف ایک کام کا ذکر کیا ہے۔ جس پر بحث آگے آرہی ہے۔

رہا عورت کے سربراہِ مملکت ہونے کا مسئلہ تو اس پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے یہاں آپ صرف ایک کام پر توجہ فرمائیے جو ان "ہزاروں کاموں" میں سے ایک ہے جو عہدِ رسالت و عہدِ خلافت میں نہیں ہوئے۔ موصوف محترم ارشاد فرماتے ہیں کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لے کر پورے سات سو سال تک مسلمانوں نے کسی غیر قریشی کو بھی خلیفہ یا سربراہِ مملکت نہیں بنایا تو کیا غیر قریشی کی سربراہی کو ناجائز اور حرام قرار دیا جائے گا؟

(۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹

پھر مزید ارشاد فرماتے ہیں

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جن حالات کے تحت غیر قریشی حضرات سربراہِ مملکت نظر نہیں آتے اُن ہی حالات کے ماتحت خواتین بھی سربراہِ مملکت یا کسی انتظامی عہدے پر نظر نہیں آتیں"۔ (۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹

محترم عثمانی صاحب کو یہاں غلط فہمی لاحق ہوگئی ہے وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ۔
عثمانی صاحب کی غلط فہمی | "جن حالات کے تحت غیر قریشی حضرات سربراہِ مملکت نظر نہیں آتے انہی حالات کے تحت خواتین بھی سربراہِ مملکت یا کسی انتظامی عہدے پر نظر نہیں آتیں"۔۔۔۔ حالانکہ ہر دو فریق میں ان کی وجوہ علیحدہ ہیں اول الذکر گروہ کو اگر مملکت کی سربراہی سے دور رکھا گیا ہے تو یہ ایک انتظامی مصلحت تھی کیونکہ
غیر قریشی حضرات کی عدمِ امارت کی وجوہ | عرب کا معاشرتی اور سیاسی ماحول اس وقت ایسا تھا کہ قریش کی موجودگی میں اگر کسی غیر قریشی کو ملک کی باگ ڈور دے جاتی تو وہ کامیابی سے حکومت نہ چلا سکتے تھے عامۃ الناس نیکی اور بدی

میں قریش ہی کی اطاعت کے خوگر تھے۔ مسند احمد بن حنبل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ موجود ہیں کہ

سمعت اذنای ووعاہ قلبی عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم النَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَیْشٍ صالحھم تبعٌ لصالحِھِمْ وشرارُھم تبعٌ لشرارِھِمْ۔ (مسند احمد۔ مرویات علی)

میرے کانوں نے حضورؐ سے یہ بات سنی اور دل نے یاد رکھی کہ لوگ قریش کے تابع ہیں اچھے لوگ اچھائی میں بھی قریش کے اچھے لوگوں کے تابع ہیں اور برے لوگ برائی میں بھی ان کے تابع ہیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھری مجلس میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

لقد علمتَ یا سعدُ انّ رسولَ اللّٰہ صلے اللہ علیہ وسلم قال وانت قاعِدٌ قُرَیْشٌ وُلَاۃُ ھٰذا الامرِ فَبَرُّ النَّاسِ تَبَعٌ لِبَرِّھِمْ وفاجِرُھُمْ تَبَعٌ لِفَاجِرِھِمْ۔ فقال سعد "صَدَقْتَ"۔ (مسند احمد، روایات ابی بکر)

اے سعد! تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ "قریش اس امر (خلافت) کے والی ہیں لوگوں میں نیک افراد قریش کے نیکوں کے پیچھے اور برے افراد قریش کے برے لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں"۔ تب سعد نے کہا "آپ نے سچ فرمایا"۔

بہرحال قریش کی قیادت و سیادت اس دور کا ایک فطری تقاضا بن چکی تھی اس لئے وقت کی سیاسی حکمت عملی کے تحت یہ حکم دیا گیا تھا کہ "جب تک قریش اس دین (اسلام) پر قائم رہیں اس وقت تک انہیں ہی اس معاملے میں غیر قریشی حضرات پر ترجیح دی جائے گی"۔ اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی واضح فرما دیا تھا۔ طبرانی، بیہقی اور شافعی نے مختلف اسناد سے حضورؐ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ

قَدِّمُوا قُرَیْشًا وَلَا تَقَدَّمُوْھَا — قریش ہی کو آگے بڑھائیے ان پر سبقت نہ کیجئے۔

مسند احمد بن حنبل میں حضرت عمرو بن العاصؓ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ

قُرَیْشٌ قَادَۃُ النَّاسِ — قریش عامۃ الناس کے لیڈر ہیں۔

مسند احمد اور مسند ابوداؤد طیالسی میں حضرت ابو برزہؓ کی اس روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بھی اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ مَا عَمِلُوْا بِثَلٰثٍ مَا حَکَمُوْا فَعَدَلُوْا وَاسْتُرْحِمُوْا فَرَحِمُوْا وَعَاھَدُوْا فَوَفُوْا فَمَنْ لَّمْ یَفْعَلْ بِذٰلِكَ مِنْھُمْ فَعَلَیْہِ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ | ائمہ قریش میں سے ہوں گے جب تک وہ تین باتوں پر عمل کرتے رہیں گے حکم کریں تو عدل کے ساتھ، جب اُن سے رحم طلب کیا جائے تو وہ رحم کریں، جب معاہدہ کریں تو وفا کریں پھر جو ان میں سے ایسا نہ کرے تو اس پر خدا، ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ |

مسند احمد ہی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس تقریر کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں قریش کو خطاب کرتے ہوئے آپؐ کے یہ الفاظ موجود ہیں۔

| | |
|---|---|
| اما بعد، یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ فانکم اَھْلُ ھٰذا الامر مَا لَمْ تعصُوا اللہَ فَاِذا عَصَیْتُمُوْہُ بَعَثَ الیکم مَن یلحاکم کما یلحی ھذا القضیب۔ (مسند احمد، روایات ابن مسعود) | اما بعد، اے قریش تم اس امر (حکومت) کے اہل ہو جب تک خدا کی نافرمانی نہ کرو اگر تم نافرمانی پر اتر آئے تو وہ تم پر ایسے لوگ مسلط کرے گا جو تمہاری کھال اس طرح اتاریں گے جس طرح ٹہنی کی چھال اتاری جاتی ہے۔ |

بخاری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت موجود ہے کہ

| | |
|---|---|
| سمعتُ رسول اللہ علیہ وسلم یقول ان ھٰذا الاَمْرَ فی قریشٍ لَا یُعَادِیْھِمْ اَحَدٌ اِلَّا اَکَبَّہُ اللّٰہُ فی النارِ علٰی وَجْھِہٖ مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ۔ | میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ یہ کام قریش میں رہے گا جو شخص بھی اس میں ان کی مخالفت کرے گا اسے اللہ اوندھے منہ آگ میں پھینک دے گا جب تک کہ قریش دین کو قائم کئے رکھیں گے۔ |

یہ تھے وہ حالات جن میں ایک انتظامی اور سیاسی مصلحت کے تحت قریش کو غیر قریش پر، اقتدار و حکومت کے معاملے میں ترجیح دی گئی تھی اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ "ما اقاموا الدین"۔ (جب تک وہ دین کو قائم رکھے رہیں)۔ اب ظاہر ہے کہ ان حالات میں اور ان فرموداتِ نبوی کی روشنی میں قریش کو سربراہِ مملکت بنانے کے یہ معنیٰ ہی نہیں بنتے کہ انہیں ابداً اور دائماً امر خلافت کا حق حاصل ہو گیا ہے بلکہ اس کے صرف یہ معنیٰ ہیں کہ جب تک یہ مذکورہ سیاسی مصلحت برقرار رہے اس وقت تک قریش امر حکومت میں دیگر غیر قریشی لوگوں پر قابلِ ترجیح ہیں بشرطیکہ قریش اقامت دین کے فریضے میں کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں۔

**ایک قابل غور پہلو**

پھر اس کے علاوہ ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر قریشی حضرات کے بارے میں کوئی ایسی خامی بھی بیان نہیں فرمائی جس کی بنیاد پر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حکومت و ریاست کے لئے نااہل قرار دیدیا جاتا اور قریشی حضرات کے لئے یہ امر دائماً مخصوص ہو کر رہ جاتا بلکہ اس کے علی الرغم آپ نے تمام امت کو جس میں قریشی حضرات بھی شامل ہیں یہ ہدایت جاری فرمائی کہ

| | |
|---|---|
| اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبْشِیٌّ۔ (مسلم) | اپنے سربراہوں کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو اگرچہ ایک حبشی غلام ہی کو تمہارا حاکم بنا دیا جائے۔ |

**خواتین کی انتظامی مناصب سے علیحدگی کی وجوہ !!**

رہا فریق ثانی (یعنی خواتین) کا معاملہ تو حقیقت یہ ہے کہ ان کو انتظامی عہدوں سے علیحدہ رکھے جانے کی وجہ قطعی مختلف ہے قرآن انہیں ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے واضح طور پر مردوں سے فروتر قرار دیتا ہے حتیٰ کہ ایک مقام پر تو محترم عثمانی صاحب کو بھی یہ کہتے ہی بنی کہ

"میں عورتوں کے صرف اس طبعی الجھاؤ کو تسلیم کرتا ہوں جو مالی لین دین کے معاملات میں انہیں پیش آ سکتی ہیں۔" (۴) جسارت ۸۳-۸-۵

اب ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایک طرف عورتوں کو انتظامی اور عدالتی مناصب سے علیحدہ بھی رکھتے ہیں اور دوسری طرف خود قرآنی اور نبوی تصریحات خواتین کو ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے کمتر بھی قرار دیتی ہیں تو اس کی وجہ ان کا یہی طبعی اور فطری نقص ہی ہوسکتا ہے نہ کہ وہ وجہ جس کے باعث، غیر قریشی حضرات کو ایسے مناصب سے دُور رکھا گیا ہے کیا قرآن و سنت میں کسی ایسے طبعی نقص کی نشاندہی، غیر قریشی حضرات میں بھی کی گئی ہے، اگر نہیں گئی (اور بالیقین نہیں کی گئی) تو پھر محترم عثمانی صاحب کے اس فرمان کی لغویت بالکل واضح ہے کہ

"آنحضرت اور خلفائے راشدین کے عہد میں جن حالات کے ماتحت غیر قریشی حضرات سربراہِ مملکت نظر نہیں آتے، انہی حالات کے ماتحت خواتین بھی سربراہِ مملکت یا کسی انتظامی عہدے پر نظر نہیں آتیں"

(۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹

بہر حال عہد رسالت اور دورِ خلافت راشدہ میں اگر عورتوں کو قضاءۃ اور سربراہئ مملکت یا دیگر مناصب سے دُور رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ وہ نہیں ہے جو غیر قریشی حضرات کے اُمورِ سلطنت سے جدا رہنے کی ہے دونوں فریقوں کی وجوہ جدا جدا ہیں، اس لئے دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

رہا ملکہ سبا کے قرآنی بیان سے استدلال تو اس پر تفصیلی بحث اسی کتاب میں موجود ہے۔

# چھٹی فصل، عورت کی ذہنی کمزوری اور ایک قرآنی آیت

میرے ایک استدلال پر جس کی حقیقت محترم عثمانی صاحب کے نقد و تبصرہ ہی سے عثمانی صاحب کا نقد و تبصرہ کسی حد تک واضح ہے وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"قاسمی صاحب نے سورہ زخرف کی آیت کریمہ ــــ اَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ــــ کا بار بار ذکر فرمایا ہے اور اس سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ عورت فطرتاً آرائش پسند اور نزاعی امور میں اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے میں غیر واضح اور مبہم رہ جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی شہادت قبول کی جائے۔"

(۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹ء

موصوف محترم یہاں قدرے سہو کا شکار ہو گئے ہیں میرا موقف یہ نہیں ہے کہ عورت کو گواہ تو بنا لیا جائے مگر اس کی شہادت قبول نہ کی جائے بلکہ میرا موقف یہ ہے کہ عورت کی اس فطری کمزوری کی بنیاد پر اسے گواہ بنایا ہی نہ جائے پھر اس کا فطری دائرہ عمل بھی گھر کی زندگی تک محدود و مخصوص ہے اگر وہ اپنے آخری جملے میں یوں لکھ دیتے کہ ــــ لہٰذا وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے گواہ بنایا جائے تو میرے مفہوم کی صحیح ترجمانی ہوتی۔

بہر حال محترم عثمانی صاحب میرے اس استدلال پر ارشاد فرماتے ہیں کہ "تعجب ہے کہ قاسمی صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس آیت میں مشرکینِ جاہلیت کو خطاب کیا جا رہا ہے کہ "کمبختو! تم فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بناتے ہو حالانکہ تمہارا اپنا یہ حال ہے کہ جب لڑکی کی پیدائش کی بشارت دی جاتی ہے تو تمہارے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے اور بڑی مشکل سے اپنے رنج و غم پر قابو پاتے ہو تم اپنے لئے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اللہ کے لئے تم نے لڑکیاں پسند کر رکھی ہیں جن کی نشو و نما زیورات میں ہوتی ہے اور جھگڑے کے وقت فصاحت سے بات بھی نہیں کر سکتی۔"

(۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹

پھر اس کے بعد قرآن کی دو آیات ۱۸/۵۴ اور ۱۱/۳۶ پیش کرتے ہوئے "انسانی فطرت" یہ بتاتے ہیں کہ ــــ انسان تو بڑا جھگڑالو ہے ــــ چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"ان دونوں آیات میں پوری نوعِ انسانیت کو صاحب خصومت یعنی جھگڑا کرنے والا بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی مبین (ظاہر واضح) بھی بتایا گیا ہے۔" (۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹

میرا جواب الجواب: اب محترم عثمانی صاحب کو یہ کون سمجھائے کہ میری پیش کردہ سورہ زخرف کی آیت، اگر مشرکینِ جاہلیت سے متعلق ہے تو ان کی پیش کردہ سورۂ نحل اور سورہ یٰسین کی دونوں آیات بھی مشرکینِ جاہلیت ہی سے تعلق رکھتی ہیں جو اپنے رب کے "خالق" ہونے کے متعلق جھگڑا کرتے تھے اسی لئے قرآن خدا کی صفت خلق کے ساتھ ان کی اس خامی کا ذکر کر رہا ہے جیسا کہ الفاظ آیات سے ظاہر ہے۔

| | |
|---|---|
| اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ | کیا انسان نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اسے ایک نطفہ سے پیدا کیا اب وہ واضح طور پر جھگڑالو بن بیٹھا ہے۔ |

سوال یہ ہے جب میری اور آپ کی بیان کردہ دونوں قسم کی آیات، مشرکینِ جاہلیت ہی سے تعلق رکھتی ہیں تو آپ اپنی پیش کردہ آیات میں بیان کردہ حقیقت کو مشرکین جاہلیت تک محدود رکھنے کی بجائے پوری نوعِ انسانی تک کس طرح وسیع کر رہے ہیں جبکہ میری پیش کردہ آیت میں مذکورہ حقیقت کو آپ صرف اور صرف "مشرکین جاہلیت" کی بیٹیوں تک محدود رکھتے ہیں ــــ؟ حقیقت یہ ہے کہ دونوں قسم کی آیات اگرچہ مشرکین جاہلیت ہی کے متعلق نازل ہوئی تھیں مگر ان میں مذکورہ حقائق پوری نوعِ انسانی میں پائے جاتے ہیں۔ بہرحال

جملہ آیات میں عدم معارضہ، سب کے جداگانہ محامل

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ محترم عثمانی صاحب نے سورہ نحل اور سورہ یٰسین کی دونوں آیات کو میری پیش کردہ آیت کی تردید میں کیسے پیش فرما دیا جبکہ دونوں قسم کی آیات کے محامل قطعی مختلف ہیں عثمانی صاحب کی پیش کردہ آیات میں جو حقیقت مذکور ہے وہ آیتِ زخرف کی بیان کردہ حقیقت سے قطعی جدا چیز ہے ہر آیت اپنے محمل پر ایک جداگانہ حقیقت کا اظہار کر رہی ہے۔ سورہ نحل ویٰسین

کی آیات میں یہ حقیقت مذکور ہے کہ جھگڑا کرنے میں بنی نوعِ انسان (ہر صنفِ بشر) یکساں ہیں دونوں صاحب خصومت ہیں اس لئے یہاں اسم فاعل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جبکہ آیتِ سورہ زخرف میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ خصیم بنتے ہوئے عین حالتِ خصام و مخاصمت میں عورت (یعنی نوع انسان کی دونوں اصناف نہیں بلکہ صرف ایک صنف) اپنے مدعا کے اظہار میں غیر واضح اور مبہم رہ جاتی ہے اس لئے قرآن نے یہاں اسم فاعل کا صیغہ استعمال کرنے کی بجائے باب مفاعلہ کے وزن پر مصدرِ فعل کو استعمال کیا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ عین حالت مخاصمت میں (جبکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مدمقابل شریکِ فعل ہوتے ہیں) عورت (خصیم بنتے ہوئے بھی) اپنے مدعا کے بیان میں غیر واضح رہ جاتی ہے۔ کسی شخص کا جھگڑا کرنے پہ اتر آنا (خصیم بن جانا) ایک علیحدہ حقیقت ہے لیکن اس کا عین دوران نزاع و مخاصمت اپنے مفہوم و مراد کو واضح نہ کر پانا (فی الخصام غیر مبین ہو جانا) ایک دوسری حقیقت ہے دونوں حقیقتوں میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہے کہ ایک ہی وجود میں ان کا اجتماع محال ہو۔ اس لئے سورہ نحل اور سورہ یٰسین کی متذکرہ آیات کی بنیاد پہ مرد کے ساتھ اگر عورت کو خصیم بھی مان لیا جائے اور پھر عین حالت خصام میں آیت زخرف کی روشنی میں اُسے اپنے مفہوم و مدعا کے اظہار میں غیر واضح اور مبہم بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس میں کوئی قطعی قباحت نہیں پائی جاتی۔

محترم عثمانی صاحب نے غالباً یہ گمان کیا کہ آیت ۴۳/۱۸ میں اگر عورت کو "فی الخصام غیر مبین" کہا گیا ہے تو اس کی تردید میں دو آیات ایسی نقل کر دی جائیں جس میں عورت اور مرد دونوں کو "کھلا جھگڑالو" قرار دیا گیا ہو۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ اس صورت میں کم از کم عورت کی حد تک تو قرآن کا بیان تعارض و تضاد کا شکار ہو جائے گا۔

**عورت اور دورِ جدید** | اس ضمن میں محترم عثمانی صاحب مزید ارشاد فرماتے ہیں

"حیرت ہے کہ قاسمی صاحب آج اس حالت میں یہ فرما رہے ہیں جبکہ کئی ممالک میں عورتیں سربراہِ مملکت ہوکر کاروبارِ حکومت نہایت کامیابی سے چلا رہی ہیں اور ہر شعبۂ زندگی میں وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔" (۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹

محترم عثمانی صاحب یہاں پر "ہر شعبۂ زندگی" کا ذکر فرما رہے ہیں جس میں ظاہر ہے کہ اکتسابِ رزق اور معاشی لین دین کا شعبہ بھی شامل ہے پھر اسی شعبۂ زندگی میں وہ عورت کے ایک طبعی اور فطری نقص کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"میں عورتوں کے صرف اس طبعی الجھاؤ کو تسلیم کرتا ہوں جو مالی لین دین کے معاملات میں انہیں پیش آسکتی ہیں۔" (۴) جسارت ۸۳-۸-۵

اب کیا میں بھی ان کی خدمتِ اقدس میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ

"حیرت ہے کہ عثمانی صاحب آج اس حالت میں یہ فرما رہے ہیں جبکہ کئی ملکوں میں اکتسابِ رزق اور مالی لین دین کے معاملات میں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔"

لیکن ٹھہریئے! یہ مقام ایسا نہیں ہے کہ یہاں سے سرسری طور پر گزرا جائے،

**ایک نفسیاتی تجزیہ** | محترم عثمانی صاحب کا مندرجہ بالا اقتباس پھر پڑھیئے، ان کے الفاظ ان کے ذہن کا نفسیاتی تجزیہ کر کے ان کے فکر کی اس بنیادی خامی کو بے نقاب کر رہے ہیں کہ وہ مغربی تہذیب سے انتہائی مغلوب و مرعوب ہیں وہ اسلامی زندگی کا نقشہ بنانے کے لئے قرآن اور صاحبِ قرآن کی طرف دیکھنے کی بجائے صرف اور صرف یہ دیکھتے ہیں کہ

"کئی ممالک میں عورتیں سربراہِ مملکت ہوکر کاروبارِ حکومت نہایت کامیابی سے چلا رہی ہیں اور ہر شعبۂ زندگی میں مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔" (۶) جسارت ۸۳-۸-۱۹

پھر مغرب کی اس فکری یلغار کے سامنے پسپائی کے نتیجے میں ان کا جو ذہن بنتا ہے وہ سربراہی مملکت کے مسئلے میں، نہ تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین کا طرزِ عمل دیکھتا ہے اور نہ ہی انبیائے سابقین میں سے حضرت یوسف، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرف دیکھتا ہے جو سب کے سب مرد فرمانروا تھے، بلکہ ان کی نظروں میں دلیل کے قابل کوئی "اسوۂ حسنہ" ہے تو قومِ سبا، کی بت پرست ملکہ کا ہے۔

ع ایسا بلند سب کا "ذوقِ نظر" کہاں!

## ساتویں فصل۔ مرد و زن کے دائرۂ عمل کی بحث

**بحث کا پس منظر** محترم عثمانی صاحب نے اپنی کتاب فقہ القرآن میں مذکر کے صیغوں کے متعلق یہ فرمایا تھا کہ

"قرآن کریم کے الفاظ مردوں اور عورتوں دونوں کا احتمال رکھتے ہیں ..... قرآن کریم میں عموماً مذکر ہی کے صیغوں سے مردوں اور عورتوں کو خطاب کیا گیا ہے ورنہ عورتوں کو تمام مسائل سے سبکدوش کرنا پڑے گا، اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) جمع مذکر ہی کے صیغے ہیں تو کیا یہ کہہ دیا جائے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ صرف مردوں پر فرض ہے اور عورتیں اس خطاب میں داخل نہیں ہیں کیونکہ جمع مذکر ہی کے صیغوں سے خطاب کیا گیا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۸۹)

میں نے جواباً یہ عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و زن میں سے ہر ایک (صنف) **میرا موقف** کو جداگانہ خصوصیات سے بھی نوازا ہے (جو اگر ایک صنف بشر میں موجود ہیں تو دوسری صنف اس سے محروم ہے) اور ایسی خصوصیات سے بھی نوازا ہے جو مشترک طور پر دونوں اصنافِ بشر کو عطا کی گئی ہیں خود محترم عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ

"مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں ان کی صلاحیتوں اور خصوصیتوں میں فرق ضرور ہے کچھ خصوصیات مردوں میں ایسی ہیں جو عورتوں میں نہیں ہیں اور کچھ خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں نہیں ہیں اور بیشتر خصوصیات دونوں میں مشترک اور مساوی ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۵۰)

پھر میں نے یہ لکھا تھا کہ

"اس حقیقت کی بناء پر حیات انسانی تین میدان ہائے عمل میں منقسم ہے۔

اول، مردوں کا دائرۂ عمل جس میں مرد کی منفرد خصوصیات کی رعایت کرتے ہوئے اسے بیرون خانہ کے واجبات کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

دوم، عورتوں کا دائرۂ عمل جس میں عورتوں کی منفرد خصوصیات کی رعایت کرتے ہوئے اسے درونِ خانہ کے امور کو سرانجام دینے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

سوم، مشترک دائرۂ عمل جس میں دونوں کی مشترک خصوصیات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ایمان، اعتقاد، عبادات اور اخلاقیات کی جملہ تعلیمات اسی مشترک میدان کار سے متعلق ہیں۔"

اس کے بعد میں نے لکھا تھا کہ

"اس حقیقت کو جان لینے کے بعد اب یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ مذکر کے صیغوں میں عورتیں صرف اس وقت مردوں کے ساتھ شامل ہوں گی جب ان صیغوں میں دیا جانے والا حکم مرد اور عورت کے مشترک دائرۂ عمل سے تعلق رکھتا ہو جہاں حکم کا تعلق صرف مرد کے دائرۂ عمل سے ہو وہاں خواتین یقیناً اس حکم سے خارج ہوں گی۔"

**عثمانی صاحب کا نقد و تبصرہ** اِس پر محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"کیا میں محترم قاسمی صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ حیات انسانی کے دوائرِ حیات

کی جو تقسیم آپ نے فرمائی ہے اس کی ان کے پاس کون سی قرآنی دلیل ہے؟ ہمارے نزدیک قرآن کی رو سے مرد کا دائرۂ کار صرف "بما انفقوا من اموالھم" تک محدود ہے اور یہی ایک شعبہ ایسا ہے جو عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے باقی تمام دائرۂ عمل، مرد اور عورت دونوں میں مشترک ہے ہم نے اپنے موقف کے لئے قرآنی دلیل پیش کر دی ہے آپ نے اپنے دائرۂ عمل کی جو تفصیل پیش کی ہے اس کی کوئی قرآنی دلیل نہیں دی اگر آپ کے پاس اپنے مزعومہ دوائر کی کوئی دلیل ہے تو پیش فرمائیے" (۴) جسارت ۸۳-۸-۵

**تفصیلی جواب الجواب** قبل اس کے کہ میں مرد و زن کے دو جداگانہ دائرہ ہائے عمل اور ایک مشترک دائرہ عمل پر تفصیل سے اظہارِ خیال کروں میں چاہتا ہوں کہ محترم عثمانی صاحب کی دلیل کا جائزہ لے لیا جائے۔

(۱) ــــــ محترم عثمانی صاحب کی اس تحریر کی روشنی میں حیاتِ انسانی صرف دو دوائر حیات میں منقسم ہے۔

(ا) مرد کا دائرۂ عمل جو بما انفقوا من اموالھم تک محدود ہے۔

(ب) مرد و زن کا مشترک دائرۂ عمل جو اول الذکر دائرۂ عمل کو خارج کر کے باقی جملہ امورِ حیات پر مشتمل ہے۔

**عثمانی صاحب کا تضاد** رہا عورت کا منفرد دائرۂ عمل تو محترم عثمانی صاحب کی اس تازہ ترین عبارت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے ان کا یہ جدید ترین نقطہ نظر اس نقطۂ نظر سے متصادم اور متناقض ہے جو وہ اب تک اپنی کتاب میں پیش کرتے رہے ہیں اور جس کی رو سے مرد و زن میں سے ہر ایک کا علیحدہ اور منفرد دائرۂ عمل وجود پذیر ہوتا ہے۔

ا ــــ "مردوں کا دائرۂ عمل گھر سے باہر ہے اور عورتوں کا دائرۂ عمل گھر کے اندر ہے" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۵۳)

۲۔۔۔۔" فطری طور پر عورتوں اور مردوں کے دائرہ ہائے کار الگ الگ ہیں عورتوں کا کام گھریلو زندگی کی دیکھ بھال خانگی انتظام و انصرام اولاد کی پرورش اور تربیت وغیرہ ہے اور مردوں کا کام باہر کی دنیا میں اکتساب رزق کے لئے جدوجہد اور پر مشقت کاموں کی انجام دہی ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۹-۷۰)

۳۔۔۔۔" اسلام نے مردوں اور عورتوں کے دائرہ ہائے کار کا تعین کر دیا ہے مردوں کا کام بیرونِ خانہ اکتساب رزق کی تگ و دو اور جدوجہد قرار دیا گیا ہے اور عورتوں کا کام اندرون خانہ افزائش نسل اولاد کی پرورش غور و پرداخت ان کی تربیت اور امور خانہ کی دیکھ بھال قرار دیا گیا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۵)

محترم عثمانی صاحب کے اس ماڈرن نقطۂ نظر سے وہ امور جو عورت کے منفرد اور جداگانہ دائرۂ عمل سے متعلق تھے اب سمٹ کر مشترک دائرۂ عمل میں آگئے ہیں لہٰذا اب اس ترقی یافتہ دور میں ولادتِ اطفال اور ارضاعِ اولاد وغیرہ کے کام "اسلامی معاشرت" میں مرد بھی سرانجام دیا کریں گے۔

(۲) ۔۔۔۔ محترم عثمانی صاحب کی اس تازہ ترین عبارت میں خواتین کا منفرد دائرۂ عمل تو معدوم ہو گیا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کی منفرد صلاحیتوں عورت کا منفرد دائرۂ عمل نہیں تو اس کی منفرد خصوصیات کا جواز کیا؟ کے بروئے کار آنے کا مصرف کیا رہ گیا؟ اگر اس کا کوئی مصرف ہی نہیں ہے تو خواتین کو یہ خصوصیات اور صلاحیتیں عطا کیوں کی گئیں؟؟

(۳) ۔۔۔۔ موصوف محترم سے ایک دریافت طلب امر یہ ہے کہ ۔۔۔ بِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ کے دائرۂ عمل سے مراد کیا ہے؟ اکتساب رزق کی جدوجہد کا "بِمَا أَنفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ" کے دائرۂ عمل کا مرادی مفہوم؟ دائرۂ عمل؟ یا انفاقِ اموال کا دائرۂ عمل؟ اگر آپ کا جواب سوال کی پہلی شق کے اثبات میں ہے تو پھر یہ دائرۂ عمل

مردوں کے لئے خاص نہیں رہتا بلکہ مرد و زن کا مشترک دائرۂ عمل قرار پاتا ہے کیونکہ عثمانی صاحب خود یہ فرماتے ہیں کہ

"اس آیت کریمہ (۴ـــ۳۲) میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ مرد بھی اکتساب رزق کریں اور عورتیں بھی اکتساب رزق کریں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۶۲)

اب جبکہ دونوں اصناف بشر کو یہ حکم ہے کہ وہ اکتساب رزق کریں تو یہ شعبہ مردوں کے لئے مخصوص نہ رہا اور محترم عثمانی صاحب کا یہ فرمان لغو قرار پا گیا کہ "یہی ایک شعبہ ہے جو عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے"

لیکن اگر محترم عثمانی صاحب یہ فرمائیں کہ ـــــ بما انفقوا من اموالھم" کے دائرۂ کار کا مطلب انفاق اموال کا دائرۂ کار ہے تو یہ بھی ایک نہایت کمزور بات ہے کیونکہ مردوں کے اپنی بیوی بچوں پر خرچ کے علاوہ باقی جتنے بھی انفاقِ اموال کے مواقع اور مصارف ہیں ان سب میں مرد و زن یکساں شامل ہیں ظاہر ہے کہ جب (بقول عثمانی صاحب) اکتساب رزق کا حکم دونوں اصناف بشر کے لئے ہے تو انفاق اموال کا حکم بھی دونوں ہی کے لئے ہونا چاہیئے کیونکہ دونوں اصناف بشر کو اکتساب رزق کا حکم دے کر صرف ایک صنف بشر کو انفاق کا حکم دینا اور دوسری صنف کو یہ حکم نہ دینا معاشرے میں اقتصادی ناہمواریوں کا موجب ہوگا پھر قرآن خود بھی (بیوی پر میاں کے انفاقِ مال کے علاوہ) باقی تمام نیکی کے راستوں پر خرچ کرنے والے مردوں اور عورتوں دونوں کو انعامِ خداوندی کا مستحق ٹھہراتا ہے چنانچہ وہ جہاں صدقہ و خیرات کرنے والے مردوں (مُتَصَدِّقِيْنَ ۳۳/۳۵ اور مُصَّدِّقِيْنَ ۵۷/۱۸) کا ذکر کرتا ہے وہیں ان صفات کی خواتین (مُتَصَدِّقَاتِ ۳۳/۳۵ اور مُصَّدِّقَاتِ ۵۷/۱۸) کا ذکر کرتا ہے۔

اس صورتحال میں مرد کا دائرۂ عمل (جو بما انفقوا من اموالھم تک بقول عثمانی صاحب محدود ہے) صرف اور صرف ایک حکم پر مشتمل قرار پاتا ہے جس کے مطابق شوہر اپنی بیوی بچوں پر خرچ کرتا ہے اب قطع نظر اس کے کہ صرف ایک حکم

پر مشتمل "دائرۂ عمل" دائرۂ عمل کہلا بھی سکتا ہے یا نہیں سوال یہ ہے کہ محض اتنی سی بات پر کہ ـــــ مرد اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرتا ہے" ـــــ اور جواباً ـــــ "بیوی شوہر پر خرچ کرنے کی ذمہ داری سے شرعاً آزاد ہے" ـــــ عورت پورے معاشی شعبے میں کیا اتنی ناتجربہ کار قرار پاتی ہے؟ کہ محترم عثمانی صاحب کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ

"عورتوں کا ذہن مالی لین دین اور قرض و ادھار کے معاملے میں ظاہر ہے کہ مردوں کی طرح نہیں چل سکتا" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۶)

اور کیا محض اتنی سی بات پر کہ ـــــ "وہ شوہر سے اپنے اخراجات وصول کرتی ہے" ـــــ پورا معاشی شعبہ اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہو جاتا ہے اور مالیات میں اس کا ذہن اس قدر الجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے کہ قرآن کو دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر قرار دینا پڑا؟ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ

**عثمانی صاحب کا مطالبہ** رہا عثمانی صاحب کا یہ مطالبہ کہ

"اگر آپ کے پاس اپنے مزعومہ دوائر کی کوئی دلیل ہے تو اسے پیش کیجئے"

**سیدھا سادا جواب** تو اس مطالبہ کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ آپ جو اس بات کے قائل ہیں کہ (۱) کچھ خصوصیات مردوں میں ایسی ہیں جو عورتوں میں نہیں ہیں (۲) اور کچھ خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں نہیں ہیں اور (۳) بیشتر خصوصیات دونوں میں مشترک ہیں ـــــ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۵) تو اس کی قرآنی دلیل کیا ہے؟ قرآن کے جس مقام سے آپ مرد اور عورت کی یہ منفرد دوجداگانہ اور مشترک و مساوی خصوصیات ثابت فرمائیں گے میں اسی مقام سے منفرد اور مشترک تین دوائر حیات کو قرآنی دلیل سے ثابت کر دوں گا انشاء اللہ۔

تاہم میں اپنی گفتگو کو محض الزامی جواب تک محدود نہیں رکھنا چاہتا بلکہ قدرے تفصیل سے جواب دینا چاہتا ہوں۔

**تین دوائر حیات** میرے پیش کردہ تین دوائر حیات میں ایک وہ دائرۂ حیات ہے جو مرد و زن میں مشترک ہے ایمان و اعتقاد، عبادت و بندگی اور اخلاقیات اور ان

مشترک دائرۂ کار | کے جملہ لوازمات کی تعلیم اسی مشترک شعبۂ حیات سے متعلق ہے[1]
یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان تمام شعبوں سے متعلقہ امور میں مرد و زن دونوں کا ذکر
کیا ہے مثلاً قرآن ایک مقام پر یہ کہتا ہے کہ

"بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیعِ فرمان ہیں
راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے
ہیں، روزے رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے
ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں اللہ نے ان کے لئے مغفرت اور
بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔" (۳۳/۳۵)

سورہ نور کی آیت (۱۲) جس میں اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں دونوں کو حسنِ ظن
کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ اور سورہ حجرات کی وہ آیت (۱۱-۱۲) جس میں تمام اہلِ
ایمان کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں چند آدابِ معاشرت کی تعلیم دی گئی ہے، الغرض
وہ تمام آیات (جن میں مومنوں یا مومنات کو ان امور سے متعلق تعلیم دی گئی ہے)
اپنے احکام کا مخاطب ہر مسلم مرد اور عورت کو بناتی ہیں کیونکہ یہ احکام مشترک دائرۂ
عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرۂ عمل سے متعلقہ احکام خواہ صیغہ مذکر میں دیئے جائیں
(جیسا کہ عام اسلوب ہے) اور خواہ صیغۂ مؤنث میں (جیسا کہ آیت ۶۰/۱۲ میں ہے) دونوں
کج بحثی کی مثال | اصنافِ بشر کے لئے مشترک ہیں اس لئے محترم عثمانی صاحب کا یہ فرمان کہ

"قرآن نے "الذین امنوا" اور "الذین امنوا" کی تکرار پورے
دو سو انچاس مرتبہ فرمائی ہے لیکن ایک موقعہ پر بھی "یا ایھا اللاتی امن"
نہیں فرمایا حق تعالیٰ کا منشاء اگر عورتوں سے بھی ایمان کا مطالبہ ہوتا تو
حق تعالیٰ کے لئے اس میں کیا مشکل تھی کہ وہ کہیں ایک مرتبہ ہی "یا ایھا
اللاتی امن" کہہ دیتا۔" (۷) جسارت ۸۳-۸-۲۶

—— تو یہ ایک مجادلانہ کج بحثی کی دلیل ہے جو مخاطب کی بات سمجھے بغیر بول دینے

---

[1] الا یہ کہ ان میں بھی کوئی حکم کسی ایک صنفِ بشر کے لئے کلی طور پر یا جزئی طور پر مخصوص ہو جائے۔

کی عادت پر مبنی ہے ـــــ محترم عثمانی صاحب اگر اپنے مخالفین کو "شکست" دینے کی غرض سے قرآنی آیات کو کھنگالنے کی بجائے صاف اور سیدھے ذہن کے ساتھ قرآن کا مطالعہ فرماتے تو وہ مردوں کے ایمان کے ساتھ خواتین کے ایمان کا ذکر بھی موجود پاتے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔ جو کوئی بھی خواہ مرد ہو یا عورت ایمان لاکر نیک عمل کرے تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔

**ایک اور کج بحثی** اس کے بعد مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

"قرآن کریم نے متقین کا لفظ پورے قرآن میں بیالیس مرتبہ دہرایا ہے لیکن ایک جگہ بھی متقیات کا لفظ استعمال نہیں فرمایا لہٰذا کیا حق تعالٰی کا منشا یہی نہیں ہے کہ عورتیں بھی تقویٰ اختیار کریں اور کیا اس لئے انہیں تقویٰ کی پابندیوں سے بھی آزادی دے دی جائے؟ کیا فرماتے ہیں پروفیسر قاسمی صاحب بیچ اس مسئلہ کے" (۷) جسارت ۸۳-۸-۲۶

اگر محترم عثمانی صاحب کی نگاہیں قرآنی الفاظ پر مشتمل "المعجم المفہرس" میں "متقین" اور "متقیات" کے الفاظ ڈھونڈنے تک ہی محدود نہ رہتیں تو انہیں تمام اہل ایمان عورتوں کو ازواج مطہرات کے توسط سے تقویٰ کے متعلق دیئے جانیوالا یہ حکم صریح وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ (اللہ سے تم ڈرتی رہو ۳۳/۵۵) اور اِنِ اتَّقَيْتُنَّ (اگر تم اللہ سے ڈرتی ہو تو ... ۳۳/۳۲) کے واضح الفاظ بھی نظر آجاتے۔ لیکن کیا کیا جائے محترم عثمانی صاحب ایک محقق عالم کے مقام سے اتر کر ایک کج بحث مجادل کے مقام پر آگئے ہیں اور اپنے مخاطب کی بات کو پوری طرح سمجھے بغیر کچھ نہ کچھ لکھ دینے ہی کو "دلیل" اور مخالف کے لئے "جوابِ دلیل" سمجھ رہے ہیں ورنہ اگر مولانا محترم اپنے دماغ کو ذرا بھی سوچنے کی زحمت دیتے تو وہ "ایمان" اور "تقویٰ" کو مشترک میدان عمل ہی میں شامل سمجھتے اور انہیں یہ بھی محسوس ہو جاتا کہ جس طرح ایمان کا مقام و مرکز قلب بشر ہے (وَلَمَّا

يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ۔ [1] (۴۹/۱۴) بالکل اسی طرح تقویٰ کا مقام و مرکز بھی قلب انسان ہے (فانها من تقوى القلوب [2] ۲۲/۳۲) اسی طرح تقویٰ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایمان ہی کا لازمہ ہے جو مرد و زن کے مشترک میدانِ عمل میں شامل ہے۔

**عورت کا منفرد دائرۂ عمل**

رہا عورت کا دائرۂ عمل تو وہ گھر کی چار دیواری تک محدود ہے۔ قرآن عورت کے میدان کار کو یہ کہہ کر خانگی وظائف کی انجام دہی تک محصور کر دیتا ہے کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (اپنے گھروں میں وقار سے ٹکی رہو ۳۳/۳۳)

محترم عثمانی صاحب کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ عورت کا دائرۂ عمل گھر کی زندگی تک محدود ہے ان کی ایک نہیں بلکہ کئی عبارتیں اس پر شاہد ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ ایک مرتبہ گھر کو عورت کا دائرۂ کار قرار دے دینے کے بعد وہ اسے بیرون در کر دینے میں غلطاں و پیچاں ہیں۔

**حرمِ خانہ اور عورت**

گھر کی چار دیواری عورت کے لئے "حرم" کا درجہ رکھتی ہے۔ بیرون خانہ کے ہنگاموں سے عورت کو قطعی آزاد کر کے اسے صرف اور صرف اس حرم کی خدمت کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ گھر عورت کے لئے تو محض "حرم" ہی ہے لیکن اسی کی اولاد کے لئے ایک "تربیت گاہ" ہے بلکہ ایک "تربیتی قلعہ" (حصن) ہے جو مرد و زن کے باہم نکاح (احصان) میں آنے کا نتیجہ ہے۔ اس قلعے میں بچے بیرونی فاسد اثرات سے محفوظ رہ کر اپنی ماں کے فیضِ تربیت سے مسلم مجاہد بنتے ہیں، اسلام نے اول روز سے ہی اولاد آدم کی سیرت سازی کے لئے (مغرب کی طرز پر) نرسری گھر (NURSURY HOMES) نہیں بلکہ یہ قلعے اور حرم تعمیر کیے ہیں جہاں ان کی تربیت اور تشکیل ذات کے لئے مصنوعی ماؤں کا نہیں بلکہ حقیقی ماؤں کا دستِ شفقت مہیا ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کو جیتے جاگتے انسانی پیکروں میں ڈھالنا کوئی آسان کام نہیں ہے یہ انتہائی مشکل کام ہے جو فطرت اور اسلام نے عورت کے سپرد کیا ہے اور اسے سرانجام دینے کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ صرف

---

[1] اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ [2] تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔

عورت ہی کو دی گئی ہیں۔

دین اسلام "ایمان" پیش کرتا ہے عورت اس ایمان کو انسانی سراپے میں تبدیل کرتی ہے قرآن "الفاظ" پیش کرتا ہے عورت ان الفاظ کو صحیفۂ قرطاس سے صحیفۂ قلب تک منتقل کرتی ہے ہم مسجد و منبر سے ایک "فکر" پیش کرتے ہیں۔ عورت اسی فکر کو ایک چلتے پھرتے وجود میں متشکل کرتی ہے ہم محض "قول" پیش کرتے ہیں عورت اسے سراپا "عمل" بناتی ہے ـــــ یہ ساری محنت و جانفشانی کہاں اور کس جگہ ہوتی ہے؟ اسی گھر کے حرم اور تربیتی قلعے میں! یہ عملِ تربیت کب شروع ہوتا ہے؟ عورت کے بطن میں وجود انسانی کی بناء پڑتے ہی! ابھی معصوم جان شکم مادر میں خلقاً بعد خلقٍ کے مراحل ہی طے کر رہی ہوتی ہے کہ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا کی حسین تمناؤں سے تعمیر سیرت کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے اس سینے سے غذا ملتی ہے جو نور ایمان سے منور ہے۔ بین الاقوامی فاسد ماحول کے باوجود اُسے پرورش کے لئے وہ گود میسر آتی ہے جو حجاب شرعی کے طفیل اس کفر و ضلالت اور فساد اخلاق و اعمال سے محفوظ ہے جو آج ہر گھر کے دروازے تک پہنچ چکا ہے گھر کی دنیا میں اسے وہ اسلامی فضاء میسر آتی ہے جس میں ایک مسلمان نسل اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں سے گزرتی ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کے حکیمانہ حکم کے نتیجہ میں مسلم بچے کو بیرونی فاسد ماحول سے محفوظ وہ ماحول ملتا ہے جس میں سادہ دل و دماغ پر تعلیم و تربیت اور مشاہدات کے اولین نقوش ثبت ہوتے ہیں۔

اس اعتبار سے "حرم" کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ اسلامی تہذیب کا وہ آخری دفاعی مورچہ ہے جہاں (باہر کے میدان میں اگر یہ تہذیب کبھی پسپا بھی ہو جائے تو) یہاں پناہ لے سکے لیکن افسوس کہ اب یہ مورچے اور قلعے بھی ٹوٹتے نظر آرہے ہیں۔ اسلام کے نادان دوست ان کو منہدم کرنے کے لئے وہ کچھ کر رہے ہیں جو خطرناک دشمن تک نہ کر پائے۔ ہمارے مغرب زدہ مترفین اپنی خواتین کو کھینچ کھینچ کر اپنے گھروں سے باہر لا رہے ہیں اور اسلام کے یہ نادان دوست ان کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک

کر یہ کہہ رہے ہیں کہ "شاباش، تم قابلِ ستائش ہو کہ تم نے خواتین کو گھر کی "قید" سے نجات دی کیونکہ

"عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دینا ایک سزا ہے"

(طاہرہ کے نام ص۱۹۷)

"ہمارا مروجہ پردہ جس میں عورتوں کو گھر کے اندر "قید" رکھا جاتا ہے۔۔

۔جرم ہے کیونکہ بے گناہ کا حبس بے جا میں رکھنا عرفاً و شرعاً جرم ہے"

(طاہرہ کے نام ص۱۹۷)

بہرحال قرآن نے عورت کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری تک سمیٹ دیا ہے تاکہ وہ بیرونی مکروہات سے دستکش ہو کر نسلِ نو کو اپنے نورِ تربیت سے اس قابل بنائے کہ پرچم اسلام چار دانگ عالم میں لہرا اٹھے، ایسی تربیت کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے اگر مسلمان مائیں اس کام کو لگن، تندہی اور محنت سے کماحقہ کرنے کی کوشش کریں تو انہیں سر کھجانے کی فرصت نہ ملے کجا یہ کہ بیرونِ خانہ امور کو سرانجام دینے کا خیال بھی ان کے دلوں میں آئے۔

جو عورت اپنی ان طبعی اور فطری ذمہ داریوں اور اپنے اسلامی فرائض سے منہ موڑ کر "قومی فلاح و بہبود" کے کاموں میں حصہ لیتی ہے وہ "مادرِ قوم" تو بن جاتی ہے مگر اپنے بچوں کی "ماں" نہیں بن پاتی۔

بہرحال اسلام نے ان گرانبار ذمہ داریوں کے باعث عورت کے دائرۂ عمل کو گھر کی دنیا تک محدود کر دیا ہے۔

رہا مرد کا دائرۂ عمل تو وہ بیرونِ خانہ امور پر مشتمل ہے۔ محترم عثمانی صاحب کا یہ

**مرد کا دائرۂ عمل** اقتباس اس سلسلے میں بڑا ہی واضح ہے۔

"مردوں اور عورتوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے اس لئے دونوں کی صلاحیتوں میں بھی فرق ہے مردوں کو قوت و صلابت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انہیں جگر پاش محنت و مشقت سے سابقہ پڑتا ہے اور عورتوں

کو نرمی لچک نزاکت رحمدلی اور شفقت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش، نگہداشت اور ان کی تیمارداری کرنی پڑتی ہے اس لئے دونوں کے دائرۂ کار کے مطابق صلاحیتوں میں بھی قدرت نے فرق رکھا ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ صـ۵۲)

مولانا محترم کا یہ اقتباس نہ صرف یہ کہ مرد و زن کے جداگانہ دائرۂ عمل کو متعین کر دیتا ہے بلکہ ہر دائرۂ عمل کے لئے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے انہیں بھی واضح کر دیتا ہے گھر کی چار دیواری سے باہر کے جتنے بھی معاملات ہیں خواہ وہ معیشت سے متعلق ہوں یا سیاست سے انتظامیہ سے متعلق ہوں یا عدلیہ و قضاءۃ سے ان سب کا تعلق مرد ہی کے دائرۂ عمل سے ہے اس لئے قرآن جب بیرون خانہ کی زندگی کے متعلق احکام دیتا ہے تو ان کے مخاطب صرف مرد ہی ہیں، عورتیں قرآنی احکام کے خطاب میں صرف اسی وقت شامل سمجھی جائیں گی جب ان احکام کا تعلق مشترک دائرۂ عمل سے ہو۔

**مذکر کے صیغے** رہا محترم عثمانی صاحب کا یہ ارشاد گرامی کہ

۱۔۔۔ "قرآن کریم مردوں اور عورتوں دونوں کو خطاب کرتا ہے اور جب مشترک مجمع کو خطاب کیا جاتا ہے تو مذکر کے صیغے ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ صـ۲۰۴)

۲۔۔۔ "قرآن کریم کا عام اسلوب یہی ہے کہ وہ عورتوں کے لئے الگ الگ مسائل بیان نہیں کرتا بلکہ مذکر کے صیغے استعمال کرتا ہے اور مرد و عورت دونوں مراد ہوتے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۱ صـ۴۰۹)

۳۔۔۔ "جب مشترک مجمع کو خطاب کیا جاتا ہے جس میں مرد عورتیں بچے سب شامل ہوں تو مذکر ہی کے صیغوں سے خطاب کیا جاتا ہے یہی قاعدہ ہے یہی اسلوب تخاطب ہے یہی رسم و رواج ہے اس میں نہ مذکر کے صیغے مذکر کے لئے حقیقت ہوتے ہیں اور نہ مؤنث کے لئے مجاز۔ بلکہ دونوں کے لئے مشترک ہوتے ہیں۔ اور یہی حقیقت ہے ورنہ "اقیموا الصلوٰۃ

وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ" مذکر کے صیغے ہیں کیا عورتوں کو نماز اور روزے سے چھٹی دے دی جاتی ہے" (۷) جسارت ۸۳ ـ ۸ ـ ۲۶

محترم عثمانی صاحب کے اس استدلال کے جواب میں میری یہ گذارش ہے کہ مجھے **مذکر کے صیغوں کے متعلق فیصلہ کن بات** ان سے سو فیصد اتفاق ہے کہ ـــــ

"جب مشترک مجمع کو خطاب کیا جاتا ہے تو مذکر کے صیغے ہی استعمال کئے جاتے ہیں اور ایسے مشترک نوعیت کی محافل و مجالس میں صیغۂ مذکر کے خطاب میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں" ـــــ لیکن جب مردوں کا منفرد اور مخصوص مجمع ہو تو یہ بدیہی بات ہے کہ اب مذکر کے صیغوں میں عورتیں شامل نہیں ہوں گی اب صرف مرد ہی ان صیغوں کے مخاطب ہوں گے ۔

اب یہ سوال طے ہو جانا چاہیئے کہ زندگی کے جمیع گوشوں میں بیرونِ خانہ کے معاملات مرد کے دائرۂ کار میں آتے ہیں یا عورت کے دائرۂ کار میں؟ نیز یہ کہ عورت کا دائرۂ کار کیا ہے؟ آیا اسلام نے اس پر گھر کی ذمہ داریاں عائد کی ہیں یا باہر کی ان تمام باتوں کا جواب محترم عثمانی صاحب یہ دیتے ہیں کہ

۱ ـــــ "اسلام نے اندرونِ خانہ انتظام و انصرام کا فریضہ عورت کے سپرد کیا ہے" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۷۶)

۲ ـــــ "فطری طور پر مردوں اور عورتوں کے دائرۂ کار الگ الگ ہیں عورتوں کا کام گھریلو زندگی کی دیکھ بھال خانگی انتظام و انصرام اولاد کی پرورش اور تربیت وغیرہ ہے" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۶۹)

۳ ـــــ "معاشی ذمہ داری چونکہ مرد (شوہر) کی ذمہ داری ہے اس طرح بیرونی معاملات کو سلجھانا بھی اسی کا فریضہ ہوگا اسے خاندان کا سرپرست ہونا چاہیئے اور عورت گھر کے اندرونی معاملات کی ذمہ دار ہے۔ لہٰذا اس کو سربراہِ خانہ ہونا چاہیئے اس تقسیمِ عمل سے تمام کام بسہولت انجام پائیں گے" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۷۷)

محترم عثمانی صاحب کے اقتباسات دو باتوں کو واضح کرتے ہیں

اولاً یہ کہ عورت کا دائرۂ عمل گھر کی چار دیواری پر محیط ہے خانگی انتظام وانصرام اولاد کی پرورش وتربیت وغیرہ اسی کے فرائض میں شامل ہیں۔

ثانیاً یہ کہ معاشی ذمہ داری مرد کی ذمہ داری ہے ـــــ اور ـــــ اسی طرح بیرونی معاملات کو سلجھانا بھی اسی کا فریضہ ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جب بیرونی معاملات مرد کے فرائض میں شامل ہیں تو گھر کے باہر کے تمام معاملات میں (خواہ وہ عدالت سے متعلق ہوں یا معیشت سے عدالت وگواہی سے متعلق ہوں یا انتظامیہ وحکومت سے) جب مرد ہی کو شریعت نے ذمہ دار بنایا ہے تو ان امور سے متعلقہ احکام اگر مذکر کے صیغوں میں ہیں تو بدیہی بات ہے کہ ان کے مخاطب صرف مرد ہی ہیں کیونکہ عورت کا دائرۂ عمل گھر ہے اور وہ گھریلو امور کی ذمہ دار ہے بیرون از خانہ امور اس کے دائرۂ کار سے خارج اور مرد کے دائرۂ عمل میں داخل ہیں۔

باقی رہیں نماز اور زکوٰۃ وغیرہ احکام کی آیات تو ظاہر ہے کہ ان میں مذکور احکام کا تعلق مشترک دائرۂ عمل سے ہے۔ مرد اگر بیرونِ خانہ امور میں مشغولِ جدوجہد ہے تب بھی وہ ان احکام کا مخاطب ہے عورت اگر درونِ خانہ مصروف تگ وتاز ہے تب بھی وہ ان احکام کی مخاطب ہے کیونکہ ایمان واعتقاد، عبادت وبندگی اور اخلاقیات اور ان کے لوازم سے متعلقہ احکام، مشترک دائرۂ عمل کے احکام ہونے کے باعث مردوزن دونوں کے لئے ہیں۔ الا یہ کہ ان میں بھی کوئی قرینہ کسی حکم کو کسی ایک صنف کے لئے خاص کر دے۔

اس شخص کا معاملہ کس قدر مغالطہ انگیز ہے جو مشترک احکام میں سے ایک حکم (مثلاً نماز قائم کرو زکوٰۃ دو) کی مثال بیان کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ـــــ "اگر اس حکم کو مذکر کے صیغوں کی بنیاد پر مردوزن دونوں کے لئے مشترک مانتے ہو تو پھر جملہ بیرون خانہ امور حیات میں انہی صیغوں میں دیئے جانے والے احکام کا مخاطب دونوں

اصنافِ بشر کیوں نہیں سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ خود بھی تسلیم کرتا ہے کہ ــــــ "معاشی ذمہ داری کی طرح بیرونِ خانہ معاملات صرف مرد ہی کے دائرۂ عمل سے متعلق ہیں"

(فقہ القرآن ج ۳ صـ۶۷ـ)

میں پھر یہ گذارش کرتا ہوں کہ اقیموا الصلوٰۃ واٰتو الزکوٰۃ کا مخاطب ہم مرد اور عورت دونوں کو اس لئے نہیں سمجھتے کہ ان میں مذکر کے صیغے مستعمل ہیں بلکہ اس لئے سمجھتے ہیں کہ قرآن ان الفاظ میں دیئے جانے والے حکم کو دونوں اصنافِ بشر کے لئے مشترک حکم قرار دیتا ہے یہ مشترک حکم اگر صیغۂ مؤنث میں بھی دیا جاتا تب بھی اس کے مخاطب دونوں اصناف بشر ہوتے۔ جیساکہ آیت ۶۰/۱۲ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ | اے نبی جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی۔ چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ |

اس آیت میں مذکور جملہ احکام چونکہ مرد وزن کے مشترک دائرۂ عمل سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان امور پر خواتین و حضرات دونوں سے بیعت لیا کرتے تھے باوجود اس کے کہ الفاظِ احکام صیغہ مؤنث میں دیئے گئے ہیں۔

بہرحال اس بحث سے یہ واضح ہے کہ بیرونِ خانہ جملہ امور کے متعلق مذکر کے صیغوں میں دیئے جانے والے احکام کے مخاطب صرف اور صرف مرد ہیں یا عورتیں !!

احکام کی مخاطب اسی وقت قرار پائیں گی جب یہ احکام مشترک دائرۂ عمل سے متعلق ہوں قطع نظر اس کے کہ صیغے مؤنث کے ہوں یا مذکر کے۔

## آٹھویں فصل ۔ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی

**میرا موقف** میں نے اپنے سابقہ مضمون میں لکھا تھا کہ

"آپ سے دریافت طلب یہ امر ہے کہ دور نبوی اور پورے خلافت راشدہ کے دور میں کبھی عورتیں گواہ بن کر (حدود و قصاص کے معاملات میں) نمودار ہوئی ہیں۔ زیادہ نہیں صرف ایک ہی مثال پیش فرمائیں جس میں یہ مذکور ہو کہ ــــ فلاں مقدمہ میں ــــ فلاں عدالت میں ــــ فلاں قاضی کے سامنے ــــ فلاں عورت ــــ فلاں مردوں کے ساتھ بطور گواہ پیش ہوئی ــــ یاد رہے کہ عدالت سے باہر کسی کے اظہار رائے کو عدالتی شہادت نہیں کہتے ایسی اظہار رائے کی آزادی ہر مرد و زن کو حاصل ہے زیر بحث عورت کی "عدالتی شہادت" کا مسئلہ ہے اظہار رائے یا اطلاع و اخبار کا مسئلہ نہیں۔"

**عثمانی صاحب کا جواب** میرے اس مطالبہ پر محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"قاسمی صاحب سے بڑے ادب کے ساتھ عرض یہ ہے کہ میرے اس مضمون میں نواں واقعہ ملاحظہ فرمالیں جس میں ایک عورت کے زنا اور زانی کے فرار کا ذکر ہے۔

اس واقعہ میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو غلط طور پر پکڑ لیا تھا محض ایک عورت کے بیان پر کہ ــــ "یہ جھوٹ بول رہا ہے اس نے میرے ساتھ زنا کیا ہے" ــــ رجم کر دینے کا حکم صادر فرمایا تھا مرد انکار کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ ــــ "میں نے قطعاً زنا نہیں کیا

ہیں تو اس عورت کی فریاد پر زانی کو پکڑنے کے لئے بھاگ رہا تھا"۔۔۔
دوسرے لوگوں نے یہ بیان کیا کہ۔۔۔ "یہ عورت فریاد کر رہی تھی ہم اس کی فریاد پر بھاگے تو اس شخص کو ہم نے بھاگتے ہوئے پایا اور پکڑ لیا"۔۔۔
یعنی ان میں سے کوئی ایک بھی زنا کا عینی شاہد نہیں تھا مدار صرف ایک عورت کے بیان پر تھا اور اس پر آپ نے فیصلہ صادر فرما دیا یہ مقدمہ قطعی حدود کا مقدمہ تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا اور آپ ہی نے فیصلہ فرمایا۔" (۸) جسارت ۸۳-۹-۲

قصاص کے مقدمہ سے متعلقہ دوسرا واقعہ محترم عثمانی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے۔
"ایک لڑکی چند زیورات پہنے ہوئے تھی لڑکی کو ایک یہودی نے پتھر سے کچل کر مار دیا اور زیور اتار لئے اس لڑکی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا ابھی اس میں جان تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکی سے پوچھا "تجھے فلاں آدمی نے قتل کیا ہے؟" اس نے سر کے اشارے سے انکار کیا آپ نے پھر پوچھا "تجھے فلاں آدمی نے قتل کیا ہے؟" لڑکی نے پھر سر کی جنبش سے انکار کیا آپ نے تیسری مرتبہ پھر پوچھا "تجھے فلاں آدمی نے قتل کیا ہے؟" لڑکی نے اپنا سر اٹھایا اور اثبات کے لئے سر کو جنبش دی چنانچہ اس قاتل کو پکڑ کر لایا گیا اور آپ نے دو پتھروں کے درمیان اس کے سر کو کچلوا کر اسے مروا دیا۔ (بخاری ۱۰۱۶ ج دوم)

امام بخاری نے اس صفحہ پر روایت کو دو سندوں سے بیان کیا ہے واضح رہے کہ یہ قتل کا مقدمہ ہے اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ایک لڑکی کے بیان پر قاتل یہودی کو اس طرح قتل کروایا جس طرح اس نے قتل کیا تھا جبکہ ہمارے فقہائے کرام حدود و قصاص میں عورتوں کی شہادت ہی کے منکر ہیں۔" (۲) جسارت ۸۳-۷-۲۲

ان دو واقعات کو پیش کرنے کے بعد جناب عثمانی صاحب بڑے فاخرانہ تحکم اور

فاتحانہ لب ولہجے کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"قاسمی صاحب فرمائیں انہوں نے صرف ایک حدیث ہی کا مطالبہ کیا تھا میں نے دو حدیثیں پیش کر دی ہیں وہ ان حدیثوں کو مانتے ہیں یا کہ نہیں؟ اگر نہیں مانتے تو منکر حدیث آپ ہوئے یا غریب عثمانی؟"

(۸) جسارت ۸۳-۹-۲

مجھے افسوس ہے کہ محترم عثمانی صاحب نے ان واقعات کو تلاش کرنے اور شائع کرنے میں جو محنتِ شاقہ فرمائی ہے وہ بیکار اور لاحاصل ہے اور صاف محسوس ہو رہا ہے کہ محض میری تردید کے جوش میں وہ ہوش سے بھی عاری ہوتے جا رہے ہیں۔

میرا جواب الجواب

بندۂ خدا! ان دونوں واقعات میں عورت کی حیثیت گواہ کی نہیں بلکہ فریقِ مقدمہ کی ہے وہ عدالتِ نبوی میں "شاہدہ" کی حیثیت سے نہیں بلکہ "مدعیہ" کی حیثیت سے پیش ہو رہی ہے پہلے مقدمہ میں زانی کے فعل زنا کا وہ خود شکار ہوئی ہے، دوسرے مقدمہ میں وہ قاتل کے فعل قتل کا خود نشانہ بنی ہے ہمارے زیرِ بحث مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عورت کسی مقدمہ میں "مدعیہ" یا "فریقِ مقدمہ" بن سکتی ہے یا نہیں۔ بلکہ موضوعِ سخن یہ مسئلہ ہے کہ "شاہدہ" کی حیثیت سے عورت پر "عدالتی شہادت" کا فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں امرِ اول کے متعلق علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے جبکہ امرِ ثانی بدقسمتی سے میرے اور آپ کے درمیان اختلافی مسئلہ بن کر زیرِ بحث آ رہا ہے۔ آپ کا جو دعویٰ ہے یہ دونوں واقعات اس کی دلیل نہیں بنتے اور جس چیز کی یہ دونوں واقعات دلیل بنتے ہیں وہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہونے کی بنا پر خارج از بحث ہے اس کے بعد آپ خود سوچئے کہ آپ کی اس طنز میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ "ہمارے فقہائے کرام حدود و قصاص میں عورتوں کی شہادت کے منکر ہیں" ــــ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں دلیلیں آپ کے اس مقام و مرتبہ سے بہت فروتر ہیں جس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

"ان کی استعداد یوں تو تمام علوم میں بہتر ہے مگر فنون حدیث میں تو

انہیں تخصص حاصل ہے۔" (فقہ القرآن ج ۱ ص۲۲)

# نویں فصل۔ لعان کے بیانات، شہادتیں ہیں یا حلف؟

مردوزن کی عدالتی شہادت میں مساوات کے قائلین حضرات ایک دلیل یہ

**مسئلے کا پس منظر** بھی پیش کیا کرتے ہیں کہ

"لعان میں مردوں اور عورتوں دونوں کو ایک ہی درجہ میں رکھا گیا ہے مرد کے لئے بھی اربع شہادات ہیں اور عورت کے لئے بھی۔ دونوں صنفوں کو مساوات کا درجہ دیا گیا ہے یہ نہیں کہا گیا ہے کہ عورت مرد سے دگنی یا مرد عورت سے آدھی قسمیں کھائے۔" (خلاصہ عبارت فقہ القرآن ج ۳ ص۹۳)

**میرا موقف** اس استدلال کے جواب میں میں نے یہ عرض کیا تھا

"سوال یہ ہے کہ چار مرتبہ کے یہ حلف اور پانچویں مرتبہ خدا کے غضب و لعنت کی یہ استدعا، کیا فی الواقعہ "شہادت" ہے اگر میاں بیوی ہی شاہد ہیں تو پھر مدعی اور مدعا علیہ کون ہیں؟

ہر مقدمہ چار ارکان پر مشتمل ہوتا ہے ۱۔ مدعی ۲۔ مدعا علیہ ۳۔ دعویٰ ۴۔ گواہ ــــ اب اگر میاں بیوی میں لعان کی یہ کارروائی شاہد اور شاہدہ کی حیثیت سے ہے تو پھر مدعی اور مدعا علیہ کون ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ لعان میں گواہ ہوتے ہی نہیں لعان میں میاں بیوی شاہد اور شاہدہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوتے ہیں اسی لئے تو اسے زنا اور قذف کے عام مقدمات سے علیحدہ پوزیشن دی گئی ہے یہاں میاں اور بیوی مدعی اور مدعا علیہ کی حیثیت سے آتے ہیں اور ان کی طرف سے اس کارروائی میں

جو بیانات دیئے جاتے ہیں وہ حقیقتاً شہادتیں نہیں بلکہ حلف اور قسمیں ہیں (لہٰذا ان شہادتوں کو دوسرے مقدمات کی شہادتوں پر قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا ہے)۔

**عثمانی صاحب کا موقف**

محترم عثمانی صاحب نے میرے اس موقف کی تردید میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے میں چار اجزاء میں تقسیم کرتے ہوئے اُنہی کے الفاظ میں پیش کئے دیتا ہوں تاکہ ہر جزو کا علیحدہ علیحدہ جواب پیش خدمت کر سکوں جناب عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

۱۔۔۔ "قرآن کریم نے مرد اور عورت دونوں کے بیان کو شہادت یعنی گواہی سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ قرآن کا یہ ارشاد کہ ۔۔۔ "اور ان کے پاس اپنی ذات کے سوا کوئی گواہ نہ ہو" ۔۔۔ خود انہیں گواہ قرار دے رہا ہے"

۲۔۔۔ "اس کے بعد آگے چل کر قرآن کریم فرما رہا ہے ۔۔۔ "تو ان میں سے ایک کی شہادت یہ ہوگی" ۔۔۔ یہاں قرآن شوہر اور بیوی کے بیان کو "شہادت" قرار دے رہا ہے۔

۳۔۔۔ "شہادت کی اس مخصوص صورت میں مرد اور عورت کا بیان دو اجزاء پر مشتمل ہے پہلا جزو وہ ہے جس میں ہر گواہ قاضی کے سامنے حلف اٹھاتا ہے یہ تو قسم کا حلف ہے دوسرا جزو وہ ہے جس میں مخصوص الفاظ میں امر واقعہ کو بیان کر رہا ہے یہ دوسرا جز شہادت ہے لعان کے اس مخصوص طریقے میں گواہوں کا یہ بیان موجودہ قانون کی رو سے بھی شہادت (ORAL EVIDENCE) کے ذیل میں آتا ہے۔"

۴۔۔۔ "لیکن میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اسے شہادت فرمایا ہے تو کسی کو کیا اختیار ہے کہ اسے شہادت نہ مانے۔" (۲) جسارت ۸۳-۷-۲۲

اب محترم عثمانی صاحب کے چاروں اجزائے دلیل کا تفصیل سے جواب عرضِ خدمت ہے۔

جہاں تک ان کے استدلال کے پہلے جز کا تعلق ہے وہ قرآن کریم کے ان الفاظ

جزوِ اوّل کا جواب | پر مبنی ہے وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ

محترم عثمانی صاحب کے نزدیک انفسھم سے مراد وہی شھداء ہیں جن میں سے اِلَّا کے لفظ سے استثناء کر لیا گیا ہے گویا ان کے نزدیک آیت میں واقع استثناء استثنائے متصل ہے جس میں مستثنیٰ (جس کو مستثنیٰ کر لیا گیا ہو یا جس کا استثناء کر لیا گیا ہو) مستثنیٰ منہ (جن میں سے استثناء کر لیا گیا ہو) کی جنس میں سے ہوتا ہے۔ محترم عثمانی صاحب کی غلط فہمی کا سبب یہی چیز ہے۔ اگر وہ غور فرمائیں تو انہیں خود بھی اس غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں واقع استثناء استثنائے متصل نہیں بلکہ استثنائے منقطع ہے جس میں "مستثنیٰ"، "مستثنیٰ منہ" کی جنس میں شامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ اِلَّا کے بعد جس مستثنیٰ (انفسھم) کا ذکر ہے وہ مستثنیٰ منہ (شھداء) کی جنس میں سے قطعاً نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ انفسھم سے مراد کون لوگ ہیں؟ وہی لوگ تو ہیں جن کا ذکر اسی آیت کے ابتداء میں وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ (جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمتِ زنا لگاتے ہیں) کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ یہ تہمت لگانے والے "مدعی" ہیں "شاہد" نہیں ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت میں "وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ" کے الفاظ سے جن لوگوں کی نفی کی جا رہی ہے وہ "شہداء" ہیں اور اِلَّا کے بعد جن لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے وہ "مدعی" ہیں۔

"خود قرآن میں اس کی کئی نظیریں ہیں۔ میں توضیح مدعا کے لئے صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ قرآن پاک آیت ۱۹/۱۲ میں جنت کی ایک خوبی ان الفاظ میں بیان کرتا ہے لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا۔ استثنائے متصل کے اعتبار سے اس آیت کا ترجمہ یہ ہو گا کہ۔ (وہ (لوگ) کوئی لغو بات نہیں سنیں گے ماسوا سلام کے) گویا سلام بھی لغو باتوں میں داخل ہے جسے وہ سنیں گے۔ لیکن استثنائے منقطع کے لحاظ سے ترجمہ یہ ہو گا کہ۔ (وہاں کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے ہاں البتہ سلام کی صدائیں سنیں

گے) یعنی اس ترجمہ کے اعتبار سے سلام لغو باتوں میں داخل نہیں ہے بلکہ سلام الگ جنس ہے جس کا استثناء کیا گیا ہے اور لغو الگ جنس ہے جس کی نفی کی گئی ہے بالکل یہی چیز ولم یکن لھم شھداء الا انفسھم میں پائی جاتی ہے یعنی جس چیز کی نفی کی گئی ہے وہ الگ چیز ہے یعنی شہداء اور جن کا استثناء کیا گیا ہے وہ الگ جنس ہیں یعنی تہمت لگانے والے "مدعی" حضرات۔

بہرحال اس آیت میں ازواج کو (نہیں بلکہ زوجین کو) شہداء میں داخل کرتے ہوئے انہیں گواہ قرار دینا ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جزوِ ثانی پر بحث | محترم عثمانی صاحب کے استدلال کا جزو ثانی یہ ہے کہ ـــــ "قرآن میاں اور بیوی کے لعان کے بیانات کو شہادت کہہ رہا ہے لہٰذا میاں بیوی "شاہد" کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے بیانات "شہادت" کی" ـــــ موصوف مکرم کا یہ جزوِ استدلال پھر ایک غلط فہمی پر مبنی ہے ان کے ذہنِ مبارک میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ مقدمہ لعان میں جو فریق بھی "شہادت" ادا کرے وہ لازماً شہداء ہی میں شامل ہوگا حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے قرآن نے اگر یہاں میاں بیوی کے بیانات کو "شہادت" کہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ زوجین "شاہد" ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون میں اصطلاحی گواہوں کی عدم موجودگی میں فریق مقدمہ کا حلف بجائے خود ایک "شہادت" ہے (اسلام کا قانون شہادت مرتبہ سید محمد متین ہاشمی صاحب ص۳۶)۔

پھر یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے قرآن بیوی کے بیان کو بھی "شہادت" قرار دیتا ہے اور خود موصوفِ محترم نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ بیوی کو تو کسی قانون کے تحت بھی "گواہ" یہاں نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو قطعی طور پر شوہر کی موردِ الزام ہے لیکن قرآن اگر اس کے بیان کو بھی "شہادت" کہہ رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس مقدمہ میں "شاہدہ" کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس کی صرف اور صرف یہی وجہ ہے کہ در نگاہِ ایزدی اصطلاحی شہداء کی غیر حاضری (نایابی) میں فریق مقدمہ کا حلف بجائے خود ایک "شہادت" ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی

ہے کہ مقدمہ لعان کی "شہادات" حقیقتاً نہیں بلکہ مجازاً ہی "شہادات" ہیں کیونکہ ان کے پیش کرنے والے "اصطلاحی شہداء" نہیں ہیں بلکہ وہ فریقین مقدمہ ہیں جبکہ عام اور اصطلاحی "شہادات" شہداء کی جانب سے پیش کی جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے قرآن یہاں میاں بیوی کے بیان کو فقط "شہادات" ہی نہیں کہتا ہے بلکہ "باللہ" کے لفظ کے اضافے کے ساتھ "شہادات باللہ" کہتا ہے یہ اضافی کلمہ قطعی طور پر ان بیاناتِ لعان کو حلف اور قسمیں قرار دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ خود صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انہیں حلف یا قسمیں ہی قرار دیا ہے لعان ہی کے مقدمہ میں ایک عورت کے متعلق جس کے جھوٹی ہونے کے لئے قرائن بھی موجود تھے آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے (لولا الایمان ۔۔۔) "اگر قسمیں واقع نہ ہو چکی ہوتیں تو میں اس عورت کے ساتھ کسی اور ہی طرح نمٹتا۔" (احمد، ابوداؤد بحوالہ نیل الاوطار ج ۷ ص ۷)

اب چونکہ یہ حقیقتاً شہادتیں نہیں بلکہ مجازاً شہادتیں ہیں اس لئے ان کا حکم عام شہادتوں والا حکم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی دونوں قسم کی شہادتوں کو (یعنی حقیقی یا اصطلاحی اور مجازی شہادتوں کو) ایک دوسرے پر قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ میں محترم عثمانی صاحب کے استدلال کے تیسرے جزو کی طرف بڑھوں یہاں اس تناقض اور تضاد کو واضح کر دوں جو انہوں نے اپنے استدلال اور استنتاج میں اختیار کیا ہے۔

## عثمانی صاحب کا تضاد

مولانائے محترم نے اپنے پہلے دونوں اجزائے دلیل میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کی رو سے میاں بیوی "شاہد" ہیں اور ان کے بیانات "شہادات" ہیں لیکن جب نتیجہ بحث کو پیش کرتے ہیں تو زوجین کو "فریقین مقدمہ" بنا ڈالتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

> "ان کو شہادت کہنے سے حق تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بعض اوقات مدعی اور مدعا علیہ کے بیانات بھی شہادت ہوتے ہیں۔"

(۹) جسارت ۸۳-۹-۹

؎ الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

درست فرمایا موصوفِ محترم نے! اسی لئے فقہاء ان شہادتوں میں (جو فریقین مقدمہ کی طرف سے ادا ہوں) اور ان اصطلاحی شہادتوں میں (جو شہداء کی طرف سے ادا ہوں) فرق وامتیاز کرتے ہیں۔

جزوِ ثالث پر بحث | محترم عثمانی صاحب کے استدلال کا تیسرا جزو یہ ہے کہ ___ لعان کی شہادت دو حصوں پر مشتمل ہے ایک حصہ "حلف" ہے اور دوسرا "امرِ واقعہ" کا بیان ہے۔

بخدا مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آسکی کہ محترم عثمانی صاحب نے یہ جزو بندی کیوں اور کس مقصد کے تحت کی اور اس سے کیا ثابت کرنا چاہا ہے؟ نظری طور پر (THEORATICALLY) تو حلف (قسم) اور محلوف علیہ (امر واقعہ جس پر حلف اٹھایا جائے) میں فرق کیا جا سکتا ہے لیکن عدالت میں عملاً ان دونوں میں فرق کرنا ایک بے معنیٰ چیز ہے۔ آپ عدالت میں مجرد قسم یا حلف (بغیر محلوف علیہ یا امر واقعہ کے بیان کے) ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ اٹھاتے ہوئے "اللہ کی قسم" کے الفاظ دہرائیے اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے پھر آپ اس مقدمہ میں محلوف علیہ (یعنی امرِ واقعہ) کو ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ بغیر حلف کے بیان کیجئے اس کی بھی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے لیکن اگر آپ حلف (اللہ کی قسم کے الفاظ) اور محلوف علیہ (بیانِ امر واقعہ) کو جمع کرتے ہوئے قرآن کی مقررہ تعداد میں پیش کریں تو یہ ایک با معنیٰ اور قدر وقیمت رکھنے والی "شہادت" ہوگی کیونکہ یہاں قرآن نے جس چیز کو "شہادت" کہا ہے وہ مجرد حلف ("اللہ کی قسم" کا تلفظ) یا صرف محلوف علیہ (یعنی امر واقعہ کا بیان کر دینا) نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں چیزیں مل کر ہی ایک شہادت بنتی ہیں ان دونوں میں عملاً انقطاع وافتراق ممکن ہی نہیں ہے خواہ آپ دونوں کے اس مجموعے کو حلف کے نام سے موسوم کریں یا شہادت کے نام سے۔ جس طرح کرنسی نوٹ کے

ایک رخ کو دوسرے رخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا بالکل اسی طرح "شہادت" کے ایک جزو (حلف) کو دوسرے جزو (محلوف علیہ) سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مجرد "حلف" کے لفظ سے بھی قسم اور مقسم علیہ دونوں ہی (عرف عام میں) مراد لئے جاتے ہیں مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ ــــ "فلاں شخص عدالت میں حلف اٹھا کر آیا ہے" ــــ تو اس سے یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ وہ عدالت میں صرف "اللہ کی قسم" کے الفاظ کا تلفظ ادا کر کے لوٹ آیا ہے بلکہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ وہ کسی محلوف علیہ (امر واقعہ) کو بیان کرتے ہوئے اس پر حلف اٹھا کر واپس آیا ہے۔

بہر حال مجھے اس بات کی سمجھ نہ آسکی کہ اس جزو بندی یا تقسیم اجزاء سے محترم عثمانی صاحب کا مقصود کیا ہے؟ اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ حلف بجائے خود ایک "شہادت" ہے اور محلوف علیہ (یعنی امر واقعہ کا بیان) بھی بجائے خود ایک "شہادت" ہے جسے وہ ( ) قرار دیتے ہیں تو یہ بات یہاں عقلاً بھی غلط ہے اور نقلاً بھی۔ عقلاً تو اس لئے کہ ہر جزو کو علیحدہ شہادت قرار دینے سے "شہادات" کی تعداد اصل تعداد سے دوگنی ہو جاتی ہے اور نقلاً اس لئے غلط ہے کہ قرآن حلف اور محلوف علیہ دونوں کے مجموعے کو ایک "شہادت" قرار دیا ہے اور اسی کو (یعنی دونوں اجزاء کے مجموعے کو) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمین کہا ہے۔

اپنے استدلال کے آخری حصے میں محترم عثمانی صاحب بڑے تحکمانہ انداز میں <u>دلیل کا آخری جزو</u> ارشاد فرماتے ہیں کہ

> "۔۔۔۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اسے "شہادت" فرمایا ہے تو کسی کو کیا اختیار ہے کہ وہ اسے "شہادت" نہ مانے۔"

(۲) جسارت ۸۳-۷-۲۲

اسی مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں

> "حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں انہیں "شہادتیں" ہی کہا ہے اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انہیں "شہادتیں" قرار نہ دے۔"

(۹) جسارت ۸۳-۹-۹

محترم عثمانی صاحب کے اس تحکمانہ فرمان کے جواب میں، میں بغیر کسی نقد و تبصرہ عثمانی صاحب کے متضاد بیانات کے انہی کی نگارشات پیش کئے دیتا ہوں۔

۱۔ "لعان اور وصیت کے سلسلہ میں تو انہیں "شہادت" سے تعبیر فرمانا محض مجاز ہے ورنہ حقیقت میں وہ "شہادتیں" نہیں بلکہ قسمیں ہیں۔"
(فقہ القرآن ج ۳ ص ۷۸)

۲۔ "امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ نقل کیا گیا ہے کہ لعان "شہادتیں" نہیں ہیں بلکہ وہ پانچ قسموں کا نام ہے

-----

امام ابوحنیفہ قرآن پاک کے الفاظ سے استدلال فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نے ان قسموں کو شہادت ہی فرمایا ہے (فشهادة احدهم اربع شهادات) لہٰذا ان پر شہادت ہی کے احکام نافذ ہوں گے۔

ہمارے نزدیک امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب زیادہ صحیح ہے کیونکہ لعان کی قسمیں اس معنیٰ میں شہادت ہیں کہ مدعی اپنے دعویٰ کی صداقت میں اپنے خدا کو گواہ بنا رہا ہے ایسے ہی مدعا علیہا (بیوی) بھی شوہر کے کذب پر خدا کو گواہ بنا رہی ہے (قسم کی حقیقت یہی ہوتی ہے) لہٰذا یہ لفظاً تو واقعی "شہادت" ہیں لیکن حقیقتاً اصطلاحی "شہادت" نہیں ہیں لہٰذا ان پر اصطلاحی "شہادات" کے احکام نافذ نہیں کئے جا سکتے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۲ ص ۳۵۷)

۳۔ "یہ شہادتیں نہیں بلکہ قسمیں ہیں مگر قرآن نے ان کو بھی "شہادتیں" ہی کہا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۹۳)

کل تک تو محترم عثمانی صاحب یہ فرما رہے تھے مگر آج میری تردید کے شوق میں وہ یہ فرما رہے ہیں کہ

"لیکن میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے جب اسے "شہادت" فرمایا ہے تو

کسی کو کیا اختیار ہے کہ وہ اسے "شہادت" نہ مانے۔"

(۲) جسارت ۸۳-۷-۲۲

جناب پرویز[1] صاحب، محمد علی لاہوری[2] صاحب، مولانا عمر احمد عثمانی صاحب

**تعبیر کی ایک بنیادی غلطی** اور ان کے ہمنواؤں کی ایک غلطی یہ بھی ہے کہ وہ آیت سے بطور نتیجہ جو کچھ اخذ کرتے ہیں اسے اس طرح بیان کرنے کی بجائے کہ "یہاں قرآن نے فریقینِ مقدمہ کی حیثیت سے میاں اور بیوی دونوں کو مساوی مقام پر رکھا ہے" — الٹا یوں بیان کرتے ہیں کہ "قرآن نے لعان کی شہادت میں مرد اور عورت کو مساوی حیثیت دی ہے" — یہ حقیقتِ حال کی قطعی غلط تعبیر ہے ایک جاہل سے جاہل آدمی بھی یہ سمجھتا ہے کہ "ہر بیوی تو عورت ہوتی ہے مگر ہر عورت ضروری نہیں کہ بیوی ہی ہو اسی طرح ہر شوہر تو مرد ہوتا ہے مگر ہر مرد ضروری نہیں کہ شوہر ہی ہو" — پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر شوہر کو مطلق مرد اور ہر بیوی کو مطلق عورت کس "قرآنی دلیل" کی بنیاد پر قرار دیا جاتا ہے۔ اسی اسلوب پر "شوہر" کی جگہ "مطلق مرد" اور "بیوی" کی جگہ "مطلق عورت" مراد لے کر اگر قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو کتاب اللہ بازیچۂ اطفال اور خدائی احکام اضحوکہ بن کر رہ جائیں۔ شاید ان کے پیشِ نظر یہی کچھ ہو۔

# دسویں فصل۔ "خبر و روایت" یا "عدالتی شہادت" میں فرق

**بحث کا پس منظر** میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں یہ عرض کیا تھا کہ

"جناب پرویز صاحب اور مولانا عثمانی صاحب جب "شہادت نسواں" پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ "خبر" اور "شہادت" کے درمیان جو نازک فرق ہے

---

[1] پرویز صاحب کی تفسیر مطالب الفرقان ج ۳ ص ۳۶۸ [2] قادیانیوں میں سے محمد علی لاہوری کی بیان القرآن ص ۲۵۸

اسے ملحوظ خاطر نہیں رکھتے جس کے باعث وہ خود بھی الجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی الجھاتے ہیں۔

احاطۂ عدالت سے باہر کسی صنف بشر کا کسی واقعہ کی اطلاع دینا "خبر" کہلاتا ہے جبکہ عدالت میں کسی جج یا قاضی کے سامنے کسی چشم دید واقعہ کی گواہی کی نیت سے اطلاع دینا "شہادت" کہلاتا ہے خبر دینے میں نصاب خبر (تعداد مخبرین اور جنس مخبرین) کی کوئی قید نہیں ہے جبکہ ادائے شہادت میں ہر معاملہ و مقدمہ میں باقاعدہ نصاب مقرر ہے۔ خبر کے سلسلے میں بعض کے نزدیک کوئی اوصاف مقرر نہیں ہیں فاسق و فاجر یا عادل و صادق آدمی بھی مخبر بن کر کوئی اطلاع دے سکتا ہے جبکہ گواہوں کے لئے باقاعدہ اوصاف مقرر ہیں بعض لوگ اسلام، عقل، عدالت، ضبط الخبر اور ذاتی مشاہدہ کے اوصاف کو مخبرین کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں جبکہ وہ "شہادت" کو "خبر" سے خاص تر کرتے ہوئے شہدار کے لئے حریت، ذکوریت اور تعداد شاہدین کو اضافی اوصاف قرار دیتے ہیں۔"

(۱۰) جسارت ۸۳-۵-۱۰

محترم عثمانی صاحب نے "شہادت" اور "خبر" کے موضوع پر اپنی گفتگو کا آغاز بڑے برہم انداز میں بایں الفاظ کیا ہے۔

**عثمانی صاحب کا نقد و تبصرہ**

"ہمارے علماء کرام نے ایک لفظ سیکھ لیا ہے کہ ـــــ "شہادت، شہادت ہوتی ہے اور خبر، خبر ہوتی ہے دونوں میں بڑا فرق ہے"ـــــ لیکن وہ ان دونوں میں کوئی فرق بتانے سے قاصر رہتے ہیں ایک مفتی صاحب قبلہ نے اس سلسلہ میں کوئی فرق بتلانے کی بجائے یہ فرمانے پر اکتفا کیا کہ ہمیں مشورہ دیا کہ ہم ان دونوں کا فرق اصول حدیث کی کتابوں سے معلوم کریں اور بڑے طمطراق سے طنز فرما کر گزر گئے کہ ـــــ "عورتوں کی شہادت کو صحیح سمجھنے والے اتنے جاہل ہیں کہ "خبر" اور "شہادت" کا فرق بھی نہیں

جانتے۔ محترم قاسمی صاحب نے خبر اور شہادت کا فرق بیان کرنے کے لئے خامہ فرسائی فرمائی لیکن انہوں نے بڑی مغالطہ آفرینی سے کام لیا تاکہ عام قارئین کو مغالطہ دے سکیں۔" (۳) جسارت ۸۳-۷-۲۹

اس کے بعد محترم عثمانی صاحب نے میرا وہ اقتباس پیش کیا ہے جس میں میں نے

**میرا جواب الجواب** | اصطلاحی "شہادت" اور "حلف یا قسم" کا فرق بیان کیا ہے لیکن انہوں نے میرے بیان کردہ "حلف" کے مقابلے میں "شہادت" کے فرق کو اصل سیاق وسباق سے کاٹ کر "خبر" اور "شہادت" کے فرق والے اقتباس سے جوڑ دیا۔ نہ معلوم موصوف محترم کے نزدیک یہ کارروائی بھی "مغالطہ آفرینی" کی تعریف میں آتی ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ ایک زیادتی ہے کہ ایک شخص "شہادت" کے فرق کو "حلف" کے مقابلے میں بیان کرتا ہے مگر دوسرا شخص اسے "خبر" کے مقابلے میں رکھ کر پیش کر دیتا ہے حالانکہ میں نے "شہادت" اور "خبر" کا فرق علیحدہ بیان کیا تھا اور "شہادت" اور "حلف" کا فرق علیحدہ بیان کیا تھا۔[1] تاہم "خبر" اور

**ایک بے جا الزام** | "شہادت" کے ضمن میں، میں نے جو کچھ عرض کیا تھا اس پر موصوف مکرم نے یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ

"ملاحظہ فرمائیے! بات تو تھی احادیثِ نبوی کی! اور قاسمی صاحب "خبر" سے مراد "خبرِ نبوی" کی بجائے "عام خبر" لے کر عام ناظرین کو کیسا مغالطہ دے رہے ہیں۔" (۳) جسارت ۸۳-۷-۲۲

خیر! یہ بحث تو آگے آ رہی ہے کہ میں نے "خبر" سے مراد "خبر نبوی" کی بجائے "عام خبر"

**حقیقتِ الزام** | لے کر عام ناظرین کو کیسا مغالطہ دیا ہے۔ فی الحال آپ یہ ارشاد فرمائیں کہ کہاں بات "احادیث نبوی" کی ہو رہی تھی جہاں میں نے لوگوں کو یہ مغالطہ دیا ہے؟ فقہ القرآن جلد سوم میں جہاں آپ نے تقریباً اکیاون صفحات پر "شہادت نسواں" پر بحث فرمائی ہے۔ کہاں "احادیث نبوی" کا آپ نے ذکر کیا ہے؟ جس کے جواب میں، میں نے "خبر" پر بحث کرتے ہوئے "خبر نبوی" کی بجائے "عام خبر" مراد لے کر ناظرین کو مغالطہ دیا ہے؟ آپ نے اس موضوع

---

[1] ملاحظہ ہو اسی کتاب کا صفحہ اور صفحہ

پر جن واقعات سے بھی استشہاد فرمایا ہے وہ سب کے سب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کے واقعات ہیں۔ پھر ان واقعات کے جواب میں جب میں "خبر" اور "شہادت" کا فرق بیان کر دیتا ہوں تو اس میں "خبر نبوی" کے ذکر کا کیا موقع و محل ہے؟ جب "خبر نبوی" کے ذکر کا کوئی مقام و موقع ہی نہیں ہے تو مغالطہ آفرینی کیسی؟

حقیقت یہ ہے کہ اگر محترم عثمانی صاحب سے یہاں سہو ہو گیا ہے تو میں خود ان محترم عثمانی صاحب کا سہو کے لئے خدا سے عفو و درگذر کا خواستگار ہوں لیکن اگر مجھ پر مغالطہ آفرینی کا یہ بے جا الزام سہواً نہیں لگایا گیا ہے تو پھر میں صرف اور صرف یہ عرض کروں گا کہ — "یہ رویہ ایک خداترس عالم دین کے شایانِ شان نہیں ہے" — مولانا محترم اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بھی اور ایک عظیم باپ کے فرزند ہونے کے اعتبار سے بھی قابل عزت و احترام ہیں۔ میں ان کی اس فضیلت کے اعتراف کے باوجود اگر ان سے اختلاف کر رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نقطۂ نظر کو میرا ایمانی ضمیر سخت غلط بلکہ انتہائی گمراہ کن سمجھتا ہے اور میں دلائل ہی کی بنیاد پر ان کی تردید کر رہا ہوں محض اس یقین پر کہ ملک کے اہل علم حضرات میری گذارشات کو "من قال" کی بنیاد پر نہیں بلکہ "ما قال" کی بنیاد پر پرکھیں گے۔

لیجئے! اب ہم "خبر و روایت" اور "شہادت" کے فرق کو تفصیل سے بیان کئے دیتے ہیں یہ "خبر و روایت" اور "شہادت" کا فرق تاکہ جناب عثمانی صاحب کی حجت پوری ہو جائے اور انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ

> "ہمارے علماءِ کرام نے ایک لفظ سیکھ لیا ہے کہ شہادت، شہادت ہوتی ہے اور خبر خبر ہوتی ہے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ لیکن وہ ان دونوں میں کوئی فرق بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔" (۳) جسارت ۸۳-۷-۲۲

(۱) — "خبر نبوی" یا "روایت نبوی" اور "عدالتی شہادت" میں پہلا فرق عدد اور تعداد کا ہے۔ "شہادت" کے لئے گواہوں کی تعداد کا باقاعدہ نصاب مقرر ہے زنا و قذف کی حدود میں چار گواہ، قتل و قصاص میں دو گواہ، مالی لین دین میں دو مرد گواہ لیکن اگر وہ

میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہیں۔ بعض معاملات میں ایک گواہ اور بعض میں تین گواہ مطلوب ہوتے ہیں۔ لیکن "روایت نبوی" یا "خبر نبوی" میں کوئی نصابِ تعداد مقرر نہیں ہے خواہ اس خبر و روایت کا تعلق زنا و قذف سے ہو یا قتل و قصاص سے یا اقتصادی و مالیاتی نظام سے ہو یا تعبدی احکام سے۔

جو لوگ "خبر و روایت" اور "عدالتی شہادت" کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ یا تو دونوں میں نصاب تعداد جاری فرمادیں یا دونوں سے اس نصاب کو خارج کر دیں۔

(۲) ——— ان دونوں میں دوسری مابہ الامتیاز چیز "شرط بلوغت" ہے عدالت میں گواہوں کے لئے بالغ ہونا لازمی شرط ہے قرآن کہتا ہے وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ (اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو) قرآن یہاں رجال کا لفظ استعمال کرتا ہے جو رجل کی جمع ہے اور محترم عثمانی صاحب کی تحقیق کے مطابق ——— "الرجل جوان مرد کو کہتے ہیں نابالغ بچہ کو نہیں کہتے" ——— (فقہ القرآن جلد دوم ص۱۳۱) لیکن جہاں تک روایتِ نبویؐ کا تعلق ہے اس کا بہت ہی غالب حصہ بالغ رواۃ سے مروی ہونے کے باوجود بھی، راوی کا "بلوغت" کی شرط سے مُتّصف ہونا ضروری نہیں ہے نابالغ بچہ بھی نہ صرف یہ کہ روایت کرسکتا ہے بلکہ اس کی روایت فی الواقع قبول کی گئی ہے خواہ یہ روایت نابالغ راوی کے اپنے متعلق ہو یا کسی دوسرے کے متعلق ہو امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں یہ باب قائم کیا ہے مَتَىٰ يَصِحُّ سِمَاعُ الصَّغِيرِ یعنی نابالغ بچے کا سماعِ حدیث کس عمر میں صحیح اور جائز ہے۔ اس باب میں وہ دو نابالغ صحابہ کی روایات درج کرتے ہیں ان میں سے ایک صحابی حضرت محمود بن ربیعؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

"محمود بن ربیعؓ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈول سے پانی اپنے منہ میں لے کر میرے منہ میں ڈالا جبکہ میں پانچ سال کا تھا"

(بخاری۔ کتاب العلم۔ باب متی یصح سماع الصغیر)

حافظ ابو عمر عثمان بن عبد الرحمٰن المعروف بابن الصلاح رقمطراز ہیں۔

"لوگوں نے صغیر السن صحابہ مثلاً حسین بن علیؓ، ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ

نعمان بن بشیرؓ اور اس طرح کے دوسرے صحابہ کی روایت کو قبول کیا ہے
خواہ انہوں نے روایت کا تحمل قبل از بلوغ کیا ہو یا بعد از بلوغ۔"

(مقدمہ ابن الصلاح ص۶۱)

بہرحال "شہادت" کے لئے گواہ کا بالغ ہونا ایک لازمی شرط ہے جبکہ خبر و روایت میں یہ کوئی شرط نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ارقمؓ کی اس خبر کو بالواسطہ یا بلا واسطہ قبول فرمایا کہ ـــــ "عبد اللہ بن اُبَیّ نے فلاں فلاں باتیں آپ کے اور دوسرے اہلِ ایمان کے خلاف کی ہیں" ـــــ حضرت زید بن ارقمؓ ایک کمسن لڑکے تھے عبد اللہ بن اُبَیّ اور اس کے منافق رُفقاء نے قسمیں کھا کر حضرت زید بن ارقمؓ کو جھٹلانے کی کوشش کی تاکہ خود کو سچے باور کروایا جائے مگر اللہ تعالیٰ نے سورہ منافقین کو نازل کرکے کمسن زید بن ارقمؓ کی خبر و روایت کی خود تصدیق فرمادی۔

نابالغ کی روایت و خبر میں صرف اسی امر میں اختلاف ہے کہ وہ کم از کم عمر کیا ہے جس میں نابالغ کی روایت قابل قبول ہوتی ہے لیکن بہرحال اس کی روایت کے مطلق قابل قبول ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح نابالغوں کی شہادت اگرچہ بعض علماء کے نزدیک نابالغ بچوں کے باہمی کھیل کود کے دوران ہونے والے حادثوں میں چند شرائط کے ساتھ جائز ہے تاہم بالغوں کے مقدمات میں ان کی شہادت کا عدم جواز ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔

(۳) ـــــ "خبر و روایت نبوی" اور "عدالتی شہادت" میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص جھوٹی شہادت دینے کے بعد توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے تو آئندہ بھی اس کی "شہادت" قابل قبول ہوگی۔ مگر "خبر نبوی" یا "روایت نبوی" میں اگر کوئی شخص ایک مرتبہ بھی عمداً جھوٹ بولتا ہے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساقط الاعتبار قرار پاجاتا ہے اور آئندہ اس کی کوئی روایت بھی قابلِ قبول نہیں رہتی۔

(۴) ـــــ "روایتِ نبویؐ" اور "عدالتی شہادت" میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص صرف ایک ہی "روایت نبوی" میں کذب گوئی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی تمام پہلی

روایات بھی رد کر دی جاتی ہیں بخلاف اس کے کہ اگر کسی کی "شہادت" میں کذب کا ثبوت بہم پہنچ جائے تو اس سے قبل دی جانے والی "شہادتوں" کو رد نہیں کیا جائے گا اور ان پر مبنی فیصلے برقرار رکھے جائیں گے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو عدالتی نظام ہمیشہ درہم برہم رہے۔ کیونکہ ہر کذب شہادت کے بہم پہنچنے پر شاہد کی سابقہ شہادتوں پر مبنی فیصلوں کی پھر چھان بین شروع ہوئے گی جس کے نتیجہ میں کسی عدالتی فیصلے کو ثبات وقرار میسر نہ ہو سکے گا۔

(۵) ـــــــ "مخبر نبوی" اور "عدالتی شہادت" میں پانچواں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی خاص حادثہ، شخصیت یا مقدمہ سے متعلق ہو جبکہ ثانی الذکر کا تعلق کسی خاص مقدمہ، حادثہ یا فرد سے ہوتا ہے۔ اس فرق سے عملاً جو اثر مترتب ہوتا ہے اسے ایک مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے اگر کسی مقدمے میں دو گواہ ایسی "شہادت" پیش کریں جس کے نتیجے میں کوئی شخص عدالت کی طرف سے قتل کی سزا پا لیتا ہے سزا پر عملدرآمد کے بعد دونوں گواہ، اپنی "شہادت" سے رجوع کر لیتے ہیں تو ان دونوں گواہوں پر اب قصاص لازم ہو گا کیونکہ انہوں نے (۱) اس خاص مقدمہ میں (۲) شہادت کی نیت سے گواہی دی تھی۔ لہٰذا رجوع عن الشہادۃ کی صورت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جھوٹی گواہی دی تھی جس کے نتیجہ میں ایک جان ختم ہو گئی اب ان پر قصاص لازم ہے۔ بخلاف اس کے کہ کوئی جج جو ابھی کسی مقدمے کا فیصلہ نہیں کر پایا ایک مخبر (یا دو مخبروں) کے ذریعہ سے اسے ایک ایسی منسوب الی الرسول روایت پہنچ جاتی ہے جسے راوی نے فرمانِ نبوی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جج اس روایت کی روشنی میں مجرم کو سزائے قتل سنا دیتا ہے نفاذ روایت کے بعد راوی یا مخبر اپنی خبر و روایت سے رجوع کر لیتا ہے تو اب مخبر پر قصاص لازم نہیں آئے گا کیونکہ اس نے (۱) جو خبر پیش کی تھی اس کا اس خصوصی مقدمے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ اس میں ایک عام حکم مذکور تھا نیز مخبر یا راوی نے (۲) عدالتی گواہ کی حیثیت سے کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف شہادت پیش نہیں کی تھی بلکہ ایک خبر پیش کی تھی (جس کا اس مقدمے سے کوئی خصوصی تعلق نہیں تھا) اور یہ خبر بھی ایک مخبر اور راوی کی حیثیت سے بیان کی تھی نہ کہ شاہد کی حیثیت سے۔

(۶) ــــــ "عدالتی شہادت" کا مقام و محل بہرحال قاضی یا جج کی عدالت ہے (عدالت سے باہر کسی کا اطلاع و اخبار محض "خبر" ہے)۔ بخلاف اس کے کہ "خبر" یا "روایت نبوی" کے لئے کسی مقام و محل کی پابندی نہیں ہے اسے ہمیشہ اور ہر جگہ پیش کیا جا سکتا ہے[1]۔ کیونکہ جس طرح قرآنی ارشادات کو عوام الناس تک پہنچانا فریضۂ دینی ہے اسی طرح فرموداتِ نبوی کی اشاعت و تبلیغ بھی فریضۂ دینی ہے[2]۔

(۷) ــــــ عینی شاہد کی موجودگی میں وہ شخص "شہادت" نہیں دے سکتا جسے سماع سے معلومات حاصل ہوئی ہوں ماسوائے اس صورت کے کہ اصل عینی شاہد موت یا بیرونِ وطن منتقل ہو جانے کے باعث، غیب ہو لیکن "روایت نبوی" میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے زید اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی خبر یا روایت کو بکر کے سامنے پیش کرتا ہے تو بکر زید کی موجودگی میں بھی اور عدم موجودگی میں بھی اس "خبر و روایت" کو آگے پہنچا سکتا ہے۔

(۸) ــــــ جس کی شہادت اس کی اپنی ذات کے لئے جَلبِ منفعت یا دفعِ مَضَرّت کا سبب ہو اس کی شہادت اسلامی عدالت میں قابلِ قبول نہیں ہے، بخلاف روایت

---

[1] "خبر و روایت" اور "عدالتی شہادت" کا یہ فرق، مولانا عثمانی صاحب کو بھی تسلیم ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"یاد رہے کہ روایت و شہادت میں سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ روایت دس بیس تلامذہ حدیث کے سامنے ہوتی ہے اور شہادت عدالت میں قاضی کے سامنے" جسارت ۸۳-۸-۵

[2] ــــــ "صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر قرآن کی یہ آیت (۲/۱۵۹) نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔ آیت سے مراد یہی آیت ہے جس میں کتمانِ علم پر لعنت کی وعید شدید مذکور ہے ایسے ہی بعض دوسرے صحابہ نے بھی بعض روایاتِ حدیث کے ذکر کرنے کے ساتھ ایسے ہی الفاظ فرمائے کہ اگر قرآن کریم کی یہ آیت کتمانِ علم کے بارے میں نازل نہ ہوتی تو میں یہ حدیث بیان نہ کرتا۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام کے نزدیک حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ہی کے حکم میں داخل ہے کیونکہ آی[illegible] میں تو کتمان کی وعید ان لوگوں کے لئے آئی ہے جو قرآن میں نازل شدہ ہدایات و بینات کو چھپائیں، اس میں حدی[illegible]ا صراحۃً ذکر نہیں ہے لیکن صحابۂ کرام نے حدیث رسول کو بھی قرآن ہی کے حکم میں سمجھ کر اس کے اخفاء کرنے کو [illegible]عید کا سبب سمجھا"ــــــ

(ماخوذ از تفسیر معارف القرآن مفتی محمد شفیعؒ ج ۱ ص ۴۰۲)

کے کہ وہ اس صورت میں بھی قابلِ قبول ہے۔

(۹) ــــــ باپ کی بیٹے کے حق میں یا بیٹے کی باپ کے حق میں "شہادت" اسلامی عدالت میں قابل قبول نہیں ہے لیکن "روایت نبوی" اصل وفرع میں سے جس کے حق میں بھی ہو قابل قبول ہے۔

"خبر و روایت نبوی" اور "عدالتی شہادت" کا یہ تمام باہمی فرق وامتیاز امام سیوطیؒ کی تدریب الراوی سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ امام سیوطیؒ ہی کی ایک دوسری کتاب "الاشباہ والنظائر" میں بھی یہ فرق واضح کیا گیا ہے۔

(۱۰) ــــــ "روایت" اور "شہادت" کے باہمی فرق کی وضاحت کے لئے تفسیر معالم القرآن (از مولانا محمد علی کاندھلوی سیالکوٹی) کا یہ اقتباس بھی بڑا واضح ہے۔

> "شہادت اور روایت میں بنیادی اور جوہری فرق یہی ہے کہ شہادت عدالت میں ہوتی ہے جبکہ روایت کے لئے عدالت شرط نہیں۔ الجصاص نے روایت وشہادت میں یہ فرق بھی بتایا ہے کہ احکام میں ایک کی روایت قابلِ پذیرائی ہے لیکن شہادت کے لئے دو کا نصاب (قرآن میں) مقرر ہے روایت میں حکایت معتبر ہے جبکہ شہادت میں حکایت کا قانوناً کوئی اعتبار نہیں روایت بطور سند پیش کی جا سکتی ہے لیکن شہادت بطور سند نہیں پیش کی جا سکتی روایت میں قول معتبر ہے لیکن شہادت میں یہ ضروری ہے کہ امر واقعہ کو شہادت کے الفاظ سے پیش کیا جائے روایت میں مرد وزن یکساں ہیں، لیکن شہادت میں یکساں نہیں ہیں"
>
> (تفسیر معالم القرآن ج ۳ ص ۳۷۵)

**فرقِ روایت وشہادت میں ایک ٹھوس واقعہ** | اس کے بعد میں "روایت نبوی" اور "شہادت" کے باہم مفترق اور متمیز ہونے میں ایک ایسا واقعہ بیان کرتا ہوں جس میں ایک جلیل القدر صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اس مسئلے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

"(عہد فاروقی میں) بصرے کے گورنر مغیرہ بن شعبہ سے ابوبکرہ کے تعلقات پہلے سے خراب تھے دونوں کے مکانات ایک ہی سڑک پر آمنے سامنے واقع تھے ایک روز یکایک ہوا کے زور سے دونوں کے کمروں کی کھڑکیاں کھل گئیں ابوبکرہ اپنی کھڑکی بند کرنے کے لیئے اٹھے تو ان کی نگاہ سامنے کے کمرے پر پڑی انہوں نے حضرت مغیرہ کو مباشرت میں مشغول دیکھا ابوبکرہ کے پاس ان کے تین دوست (نافع بن کلدہ، زیاد، اور شبل بن معبد) بیٹھے تھے انہوں نے کہا "آؤ دیکھو اور گواہ رہو کہ مغیرہ کیا کر رہے ہیں؟" دوستوں نے پوچھا "یہ عورت کون ہے؟" ابوبکرہ نے کہا "ام جمیل" دوسرے روز اس کی شکایت حضرت عمر کے پاس بھیجی گئی انہوں نے فوراً حضرت مغیرہ کو معطل کر کے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بصرے کا گورنر مقرر کر دیا اور ملزم کو گواہوں سمیت مدینے طلب کر لیا۔ پیشی پر ابوبکرہ اور دو گواہوں نے کہا "ہم نے مغیرہ کو بالفعل ام جمیل سے مباشرت کرتے ہوئے دیکھا مگر زیاد نے کہا "عورت صاف نظر نہیں آتی تھی اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ام جمیل تھی" زیاد کے اس بیان سے گویا استغاثہ کا ایک گواہ ٹوٹ گیا نتیجتاً باقی تینوں (ابوبکرہ، نافع بن کلدہ اور شبل بن معبد) کو حد قذف میں اسی (۸۰) کوڑے مارے گئے۔"

(احکام القرآن ابن العربی ج ۲ ص ۸۸ بحوالہ تفہیم القرآن ج ۳ ص ۳۳۴)

بعد از اجرائے حدِ قذف کیا ہوا؟

"حضرت عمر نے ان سے فرمایا "توبہ کرو جو کوئی توبہ کرے گا اسی کی شہادت آئندہ مقبول ہو گی" چنانچہ شبل بن معبد اور نافع بن کلدہ نے توبہ کرتے ہوئے اپنی شہادت سے رجوع کر لیا لیکن حضرت ابوبکرہ نے رجوع سے انکار کر دیا۔" (فتح الباری ج ۵ ص ۲۵۵)

اس صورت میں جبکہ کوئی شخص کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور اپنا الزام ثابت نہ کر پائے قرآن نے اس کے لئے تین احکام جاری کئے ہیں

**قاذف کے لئے قرآنی حکم**

(۱) اس کو اسی کوڑے مارو (۲) اس کی شہادت کبھی قبول نہ کرو (۳) وہ فاسق ہے اس کے بعد قرآن ان لوگوں کو مستثنیٰ کرتا ہے جو توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں ایسے لوگوں کے حق میں اللہ غفور و رحیم ہے (۲۴/۴، ۲۴/۵)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نافع بن کلدہ اور شبل بن معبد نے توبہ کر لی اور وہ دونوں آئندہ کے لئے مقبول الشہادۃ بھی قرار پائے ان پر سے "فسق" کا دھبہ بھی دھل گیا لیکن ابوبکرہؓ نے توبہ نہیں کی جس کے نتیجے میں وہ مردود الشہادۃ قرار پائے۔ جناب ابوبکرہ کی عظمت کا یہ پہلو بڑا تابناک ہے کہ وہ فاروقی عدالت کے اس فیصلے کا مرتے دم تک احترام کرتے رہے یہاں تک کہ

"اگر ابوبکرہ کے پاس آ کر کوئی شخص انہیں گواہ بن کر شہادت پیش کرنے کی درخواست کرتا تو وہ فرمایا کرتے تھے کہ "میرے سوا کسی اور کو گواہ بنالو مسلمانوں نے مجھے فاسق قرار دیا ہے"۔ اور یہ عکرمہ، مجاہد، حسن، مسروق اور شعبی سے ان کی ایک ایک روایت کے مطابق ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، قاضی شریح کا بھی یہی قول ہے"۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۲۲)

قذف کے اس واقعے کے مختلف حصوں کو فقہی مسائل کی تخریج کے نقطۂ نظر سے حدیث کی مختلف کتابوں میں بیان کیا گیا ہے خود امام بخاری نے ان تینوں حضرات پر حد قذف کے اجراء کا یہ واقعہ اور ان تینوں سے حضرت عمر کے استتاب کا واقعہ بیان کیا ہے۔

**ایک اہم سوال اور اس کا جواب**

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام بخاری نے اس قصے کو اور دیگر مقامات پر حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی دیگر روایات کو کیوں قبول کیا؟ اور ان سے تخریج مسائل میں کیوں احتجاج کیا؟ جبکہ جناب ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بنص قرآن، عدالتِ فاروقی سے "فاسق" اور "مردود الشہادۃ" قرار پائے؟ اٹھائیے فتح الباری جلد پنجم اور ان الفاظ کا مطالعہ فرمائیے جن میں اسی سوال اور الجھن کا حل پیش

کیا گیا ہے۔

"قد حکی الاسماعیلی فی "المدخل" ان بعضهم استشکل اخراج البخاری هذه القصة واحتجاجه بها مع کونه احتج بحدیث ابی بکرة واجاب الاسماعیلی بالفرق بین الشهادة والروایة وان الشهادة یطلب فیها مزید تثبت لا یطلب فی الروایة کالعدد والحریة وغیر ذلك واستنبط المهلب من هذا ان اکذاب القاذف نفسه لیس شرطاً فی قبول توبته لان ابا بکرة لم یکذب نفسه وقد قبل المسلمون روایته وعملوا بها"

(فتح الباری - باب شهادة القاذف..... ج ۵ ص۲۵۶)

"اسماعیلی نے "المدخل" میں یہ حکایت بیان کی ہے کہ بعض لوگوں کو یہ اشکال پیش آیا کہ امام بخاری نے اس قصے کو اور اس سے احتجاج کو نیز دیگر مقامات پر ابوبکرہ کی احادیث سے احتجاج کو کیسے قبول کر لیا؟ اسماعیلی نے اس کا جواب یہی دیا کہ "شہادت" اور "روایت" میں فرق ہے شہادت کے ثبوت میں کچھ اضافی چیزیں درکار ہوتی ہیں جو ثبوت روایت میں مطلوب نہیں ہوتیں مثلاً عدد اور حریت وغیرہ۔ مہلب نے یہاں یہ استنباط کیا ہے کہ قبول روایت (اصل الفاظ "قبول توبہ" ہیں جو غالباً طباعت و کتابت کی غلطی ہے ___ قاسمی) کے لئے قاذف کا اپنے آپ کو جھٹلانا کوئی شرط نہیں ہے کیونکہ ابوبکرہ نے اپنے آپ کو قطعاً نہیں جھٹلایا لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے ان کی روایات کو نہ صرف یہ کہ قبول کیا ہے بلکہ ان پر عمل بھی کیا ہے۔"

عام مسلمان ہی نہیں بلکہ صحابۂ کرام، محدثین عظام، فقہاء مجتہدین اور علماء مفسرین تک حضرت ابوبکرہ رضی اللہ

| فرقِ روایت و شہادت | علماء سلف و خلف اور |
|---|---|

عنہ کی روایات نبویہ ہمیشہ اور ہر کہیں قبول کرتے رہے ہیں حالانکہ ان کی عدالتی شہادت اس واقعے کے باعث غیر مقبول قرار پائی۔ چودہ صدیوں پر محیط پورا اسلامی ادب اور علمی سرمایہ اس بات پہ گواہ ہے کہ کسی زمانے میں بھی کسی شخص نے بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ ـــــ "ہم جناب ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایات کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ان کی شہادت رد کر دی گئی ہے" ـــــ اور نہ ہی کسی عالم یا مفتی نے کبھی یہ فتویٰ دیا کہ ـــــ "روایت اور شہادت چونکہ ایک ہی چیز ہے لہٰذا ہم حضرت ابوبکرہ کی روایات کو بھی رد کرتے ہیں کیونکہ ان کی شہادت بھی اسلامی عدالت میں رد ہو چکی ہے" ـــــ احادیث کی باقی کتب کو تو چھوڑئیے صحاح کی کوئی کتاب بھی جناب ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے خالی نہیں ہے۔ مسند احمد بن حنبل کی پانچویں جلد میں ص۳۵ تا ص۵۲ تک ان کی ایسی روایات درج ہیں جو تقریباً ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھتی ہیں۔

بہر حال حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات کا یہ باب، روایت و شہادت میں فرق و امتیاز کی ایک ایسی ٹھوس مثال ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا الا یہ کہ کوئی شخص روزِ روشن کو شبِ تاریک ثابت کرنے کے لئے خود بھی آنکھیں بند کر لے اور دنیا کو بھی ایسا کرنے کے لئے وعظ کرنا شروع کر دے۔

آج کے وکلاء و علماء

اب اگر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ

"آج کچھ لوگوں نے یہ کوشش کی ہے کہ روایت اور گواہی میں فرق کیا جائے" (۴) جسارت ۸۳-۸-۵

تو ان کا فرمان ہرگز درخورِ اعتناء نہیں ہے کیونکہ یہ عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے لے کر اب تک کا ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔

رہا محترم خالد اسحاق صاحب کا یہ ارشادِ گرامی کہ

"یہ بات ایک وکیل کو تو زیب دیتی ہے کہ وہ "روایت" اور "گواہی" میں فرق کرے لیکن ایک عالم کو زیب نہیں دیتی" (۴) جسارت ۸۳-۸-۵

تو حقیقت یہ ہے کہ علم کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہے جب جناب خالد اسحاق

صاحب کو زیرِ بحث امر پر دوبارہ غور فرمانے کی مخلصانہ دعوت دیتا ہوں۔

رہا محترم عثمانی صاحب کا یہ فرمانِ مبارک کہ

"دونوں (یعنی روایت و شہادت کے) اوصاف یکساں ہیں اس کے بعد خبر اور شہادت میں فرق کرنا کسی عالم کو زیب نہیں دیتا۔"

(۳) جسارت ۸۳-۷-۲۹

تو یہ بجائے خود ایسی تجدد پسندی ہے جس میں وہ قطعی تنہا منفرد اور شاذ ہیں۔ علماءِ سلف میں ایک بھی قابلِ ذکر عالم ایسا نہیں ہے جو اِن کا ہمنوا ہو۔ سب روایت و شہادت میں فرق و امتیاز کے قائل ہیں اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایات کو (باوجودیکہ ان کی عدالتی شہادت مردود ہو گئی) قبول کرتے رہے ہیں خود محترم عثمانی صاحب نے "فقہ القرآن" جلد سوم ص۲۶۸ پر حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو درج کیا ہے کہ ___ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے امرِ حکومت کو سپردِ خاتون کر دیا ہو" ___ لیکن چونکہ یہ روایت ان کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے اس لئے اس کی تردید میں انہوں نے اور تو سب لایعنی تاویلات کی ہیں مگر یہ "سکہ بند" دلیل (جو اِن کے نقطۂ نظر کے عین مطابق ہے) نہیں دی کہ ___ "ابوبکرہ کی روایت ہی سرے سے قابلِ پذیرائی نہیں ہے کیونکہ وہ اسلامی عدالت میں مردود الشہادۃ قرار پا چکے ہیں اور چونکہ روایت و شہادت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا جس کی شہادت رد ہو گئی اس کی روایت بھی مردود ہے" ___

**عثمانی صاحب کی بنیادی غلطی**

فرقِ روایت و شہادت کے سلسلے میں، محترم عثمانی صاحب کی ایک بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ان دونوں کے مشترک اوصاف پر نگاہ رکھتے ہوئے یہ تو فرما دیتے ہیں کہ ___ "دونوں کے اوصاف یکساں ہیں" ___ اور پھر یہ نتیجہ بھی نکال لیتے ہیں کہ ___ "ان میں فرق کرنا کسی عالم کو زیب نہیں دیتا" ___ لیکن وہ ان دونوں کے درمیان امتیازات اور افتراقات کو قطعاً نہیں دیکھتے۔ اگر وہ جان بوجھ کر اپنی نگاہ کو دونوں کے مشترک اوصاف تک ہی محدود رکھتے ہیں اور ان

کے باہمی فرق کو دیکھنا ہی نہیں چاہتے تو یہ بات ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ میں اس بحث کو ختم کروں۔ چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ذہنوں میں

**ایک اشکال اور اُس کا ازالہ** کھٹکنے والے ایک اشکال و اعتراض کا ازالہ کر دوں۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ

"آپ نے ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی مثال پیش کر کے، جہاں روایت و شہادت کے باہمی فرق کو واضح کر دیا ہے وہاں علماءِ امت کے اس متفقہ اصول کو بھی (کہ الصحابة كلهم عدول یعنی تمام صحابہ عادل ہیں) مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔"

لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ یہ اعتراض و اشکال نہایت سطحی ہے جو عدالتِ صحابہ

**عدالتِ صحابہ کا مفہوم** کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے اس لئے "عدالت صحابہ" کا مفہوم واضح کر دیا جائے تو اس اشکال کا ازالہ ہو جاتا ہے "عدالت صحابہ" کا مفہوم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحابہ کرام زندگی کے ہر شعبہ و مقام پر عدالت کے انتہائی بلند سطح پر تھے اور ان سے کوئی عمل کبھی بھی عدالت کے منافی سرزد نہیں ہوا بلکہ وہ ہر اس عمل سے "محفوظ" تھے جو مقام عدالت سے فروتر تھا۔ "عدالت صحابہ" کا ہرگز ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ صحابۂ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث پیش کرنے میں انتہائی بلند ترین مقامِ عدالت پر فائز تھے انہوں نے کبھی بھی روایت حدیث میں کذب، افتراء یا ذاتی مفاد کے پیشِ نظر کوئی کمی بیشی جان بوجھ کر نہیں کی۔ عدالت صحابہ کا یہی وہ متداول مفہوم ہے جو اہل علم کے درمیان مُسلّم رہا ہے اس ضمن میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا یہ اقتباس بڑا ہی واضح ہے۔

"الصحابة كلهم عدول یعنی "سب صحابہ عادل ہیں"۔ سے مراد یہ ہے کہ سب صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرنے میں معتبر ہیں ہرگز صحابہ سے کذبِ روایات ثابت نہ ہوا چنانچہ تجربہ و تحقیق سے بھی یہ ثابت نہ ہوا کہ کسی بارے میں کسی صحابی نے کچھ دروغ کہا ہے۔ نہ یہ

کہ ان میں سے کسی سے کچھ گناہ کبھی ہوا ہی نہیں"۔ (فتاویٰ عزیزی ص۲۰۷)

"عدالت صحابہ" کے مفہوم کے لئے درج ذیل حوالے بھی قابل دید ہیں۔

۱۔ ارشاد الفحول (شوکانی) ص۱۶۶ ۲۔ فہم قرآن (مولانا اکبر آبادی) ص۱۴۲ ۳۔ ظفر الامانی ص۱۳ ۴۔ فتاویٰ عزیزی (شاہ عبدالعزیز دہلوی) ص۳۲۹ ۵۔ منہاج السنۃ (ابن تیمیہ) ۶۔ تدریب الراوی (سیوطی) ۷۔ منہج الوصول الی اصطلاح احادیث الرسول (نواب صدیق حسن) ۸۔ مجموعہ فتاویٰ (عبدالحی لکھنوی) ۹۔ الکفایۃ فی علم الروایہ (خطیب بغدادی)۔

## گیارھویں فصل۔ زوجہ عثمانؓ کی "عدالتی شہادت" پر بحث

**بحث کا پس منظر**

شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی بحث میں محترم عثمانی صاحب نے حضرت نائلہ (زوجۂ عثمان رضی اللہ عنہا) کی "گواہی" پر حسبِ "اجماع" کا دعویٰ کیا تھا۔ اس کے میں نے کئی جوابات دیئے تھے ایک جواب یہ تھا کہ

"بندۂ خدا! جب حضرت علی کو قصاص کی عدالتی چارہ جوئی پر قدرت ہی حاصل نہ ہو پائی تھی اور وہ کوئی عدالت قائم ہی نہ کر پائے تھے مدعی اور مدعا علیہ اپنا دعویٰ دائر کرنے کی پوزیشن میں آئے ہی نہیں، شہادتوں کو طلب کیا ہی نہ جا سکا تو حضرت نائلہ کی "عدالتی شہادت" پر اجماع کب کہاں اور کیسے منعقد ہو گیا؟ نہ مدعی کا وجود، نہ مدعا علیہ کا وجود، نہ دعویٰ کی دائر گی، نہ عدالت کا وجود، نہ قاضی کی تقرری، نہ مقدمہ کی سماعت کا وجود لیکن "شہادت نسواں" پر "اجماع صحابہ"[۱]!

---

[۱] ظاہر ہے کہ میری یہ تنقید اس موقف پر ہے کہ حضرت نائلہ کی "عدالتی شہادت" پر یہ کوئی اس طرح کی عدالتی نظیر نہیں ہے جس طرح کی نظیر عثمانی صاحب نے ہند بنت عتبہ کے واقعے کی علوی عدالت کی نظیر اور دوسری فاروقی عدالت کی نظیر پیش کی تھی۔

ع تعجب پر تعجب ہے ، اچنبھے پر اچنبھا ہے

میرے باقی تمام جوابات سے (جن میں ان کی تمام الجھنوں کا حل موجود ہے) محترم

**عثمانی صاحب کا نقد و تبصرہ**

عثمانی صاحب نے صرفِ نظر فرماتے ہوئے ان سطور پر یہ تبصرہ فرمایا ہے۔

"موصوف کی طرف سے یہ ایک اور افسوسناک قصورِ علم کا ثبوت ہے کہ آپ کو "اجماع" کی حقیقت بھی معلوم نہیں موصوف یہ سمجھ رہے ہیں کہ عدالت قائم ہوتی، مدعی اور مدعا علیہ حاضرِ عدالت ہوتے کسی قاضی کا تقرر ہوتا گواہوں کے بیانات ہوتے تب کہیں جا کر اجماع ہوتا۔"

(۹) جسارت ۸۳-۹-۹

اس واقعے کی بنیاد پر "شہادتِ نسواں" پر صحابہ کرام کے اجماع کی عملاً دو ہی صورتیں

**اجماعِ صحابہ کی صرف دو ممکن صورتیں!**

ممکن ہیں۔

اوّلاً یہ کہ صحابہ کرام نے حضرت نائلہ کی شہادت کو عدالت میں قبول کر کے عملاً یہ طے کر دیا ہوتا کہ خواتین کی شہادت مردوں کی طرح قابلِ قبول ہے اس طرح یہ عدالتی نظیر اجماعِ صحابہ کی مظہر بن جاتی۔

ثانیاً یہ کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (۱) ایک جگہ جمع ہو کر بحث و مباحثہ کے ذریعے طے کر کے (۲) یہ متفقہ اعلان کر دیا ہوتا کہ حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا کے بیانات "اطلاع و اخبار" کی حیثیت نہیں بلکہ "عدالتی شہادت" کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یاد رہے کہ میں نے یہاں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجماع میں ــــ جمع ہو کر بحث و مباحثہ کرنے ــــ اور پھر ــــ متفقہ اعلان کرنے ــــ کی یہ دونوں شرائط محترم عثمانی صاحب کے اس اقتباس کی روشنی میں عائد کی ہیں۔

"جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ تمام صحابہ فلاں مقام پر جمع ہوئے تھے بحث و مباحثہ کر کے انہوں نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ ہم اس بات پر

اتفاق کرتے ہیں اس وقت تک اجماع کا دعویٰ تسلیم نہیں ہو سکتا تو کیا تمام صحابہ کسی وقت ایک مقام پر جمع ہوئے تھے؟ اور انہوں نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ ---- (فقہ القرآن ج ۲ صـ۲۲۲)

اب اجماع صحابہ کی دو ممکن صورتوں میں سے جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے محترم عثمانی صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ عملاً عدالتی کارروائی کی نوبت ہی نہیں آئی جس کے نتیجے میں حضرت نائلہ کی شہادت مقبول ہو کر ایک نظیر بن سکتی جو اجماعِ صحابہؓ کا مظہر قرار پاتی۔ اب صرف دوسری صورت ہی باقی رہ جاتی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی صحابہ کے کسی اجتماعی بحث و مباحثہ کے نتیجے میں ایسے کسی متفقہ اعلان کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا جس میں حضرت نائلہ کے خارج از عدالت بیانات کو "اطلاع" "اخبار" کی بجائے "عدالتی شہادت" قرار دیا گیا ہو۔

**کج بحثی** | رہا محترم عثمانی صاحب کا یہ ارشاد گرامی کہ

"حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت امیر معاویہ حضرت عمرو بن العاص وغیرہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بہت بڑی تعداد جو حضرت علیؓ سے قصاص کا مطالبہ کر رہے تھے اور وہ یعنی حضرت علیؓ قصاص کے مطالبہ کی حقانیت کو تسلیم کر کے یہ عذر بیان کر رہے تھے یہ سارا کیا زبانی جمع خرچ تھا محض ہوائی چیز تھی جس سے کوئی نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ عملی طور پر کچھ نہ کیا جاتا۔" (۹) جسارت ۸۳-۹-۹

محترم عثمانی صاحب کی اس "فاضلانہ دلیل" پر میں اس کے سوا اور کیا عرض کروں کہ

؎ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

بندۂ خدا یہ تمام لوگ "قتلِ عثمان" پر "قصاصِ عثمانؓ" کا مطالبہ کر رہے تھے اور وہ بھی حضرت نائلہ کی "عدالتی شہادت" کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی "خبر و روایت" کی بنیاد پر ---- اسی لئے تو میں نے اپنے سابقہ مضمون میں یہ لکھا تھا کہ

"اگر "خبر" اور "شہادت" کا فرق مولانائے محترم کے پیشِ نظر ہوتا تو وہ ایسا کمزور استدلال نہ فرماتے حقیقت یہ ہے کہ حضرت نائلہ سے واقعات کی جو اطلاع صحابہ کو ملی اس کی نوعیت "عدالتی شہادت" کی نہیں بلکہ "خبر" کی ہے۔" (۱۰) جسارت ۸۳-۵-۱۰

تاہم بر سبیل تنزل (۱) اگر حضرت نائلہ کے بیانات کو "عدالتی شہادت" ہی قرار دے دیا جائے (اگرچہ ایسا نہیں ہے) اور (۲) اس "حقیقی اجماع" کو (جو دراصل حدود و قصاص میں "شہادتِ نسواں" سے متعلق نہیں ہے بلکہ "مطالبۂ قصاصِ عثمان" سے متعلق ہے) مان بھی لیا جائے تو بھی محترم عثمانی صاحب کی بات بنتی نظر نہیں آتی۔ کیوں؟ اس کی وجہ میرے سابقہ مضمون کے اس اقتباس سے واضح ہے۔

"اگر یہ حقیقی اجماع ہے بھی تو اس بات پر نہیں کہ "عورت کی گواہی مرد کے برابر ہے۔" بلکہ اس بات پہ ہے کہ ــــــ اگر جائے واردات پر کوئی مرد گواہ موجود نہ ہو اور تنہا عورت ہی موجود ہو تو اس اکیلی عورت کی شہادت قابل قبول ہوگی۔" (۱۰) جسارت ۸۳-۵-۱۰

لیکن محترم عثمانی صاحب میری ہر دلیل و جواب سے گوش و نظر بند کرتے ہوئے یہی بیجا تکرار و اصرار فرمائے جا رہے ہیں کہ

"سوال یہ ہے کہ نظری طور پر سب صحابہ نے اپنی رائے کا اظہار کر کے مطالبۂ قصاص کر کے اور فریق مخالف نے اسے قبول کر کے کر دیا تھا یا کہ نہیں؟ یہ جو آپ بھی مجرمین عثمان کے نام گنا رہے ہیں اور ان کے افعالِ شنیعہ کا بیان فرما رہے ہیں کیا آپ پہ وحی آئی ہے یا آپ وہاں کھڑے دیکھ رہے تھے؟ یہ سب کچھ حضرت نائلہ کے بیان پر ہی تو آپ فرما رہے ہیں؟..... یہ سب کچھ اگر اجماع نہیں تو کیا تھا؟

واقعی یہ سب کچھ "اجماع" اور "اتفاقِ صحابہ" ہی ہے مگر حضرت نائلہ کی "عدالتی شہادت" پر نہیں بلکہ ان کے "اطلاع و اخبار" کی روشنی میں "مطالبۂ قصاصِ عثمانؓ" پر ہے۔

# بارھویں فصل۔ آیا قاضی ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ کرسکتا ہے؟

محترم عثمانی صاحب نے اپنے مضمون میں ایک یہ بحث بھی خواہ مخواہ بلا ضرورت چھیڑ دی ہے کہ قاضی یا جج اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر بھی فیصلہ کر سکتا ہے تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ شہادتیں اس قدر اہم چیزیں نہیں ہیں کہ اس پر مدارِ فیصلہ رکھا جائے یہ صرف معاون ہو سکتی ہیں جج کے فیصلہ کرنے میں فیصلہ کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

مولانا محترم نے اپنے اس موقف پر کوئی "قرآنی دلیل" نہیں دی جس کا وہ ہم سے قدم قدم پر مطالبہ کرنے کے عادی ہیں۔ سُنّتِ نبویؐ اور خلفائے راشدین کے عہد سے بھی کوئی دلیل وسند انہوں نے پیش نہیں فرمائی۔ جبکہ قرآن میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جو عثمانی صاحب کے موقف کی دلیل قرار پائے، رہی حدیث اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل تو وہ موصوف محترم کے خلاف اس بات پر شاہد ہیں کہ حاکم یا قاضی اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔

سُنّتِ نبویؐ اور مسئلہ زیرِ بحث

سیّد البشر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوب معلوم تھا کہ منافقین کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور شرارتوں کی بنا پر ان مُفسدین کے جان و مال کس قدر مباح ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے محض اس لئے ان کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں فرمایا کہ کہیں لوگوں کے منہ پر یہ بات نہ چڑھ جائے کہ ــــــ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں" ــــــ حالانکہ اگر آپ ان مُفسدین کے قتل کا فیصلہ بھی فرما دیتے تب بھی کم از کم خدا و مومنین کے ہاں آپ ان تہمتوں سے بالاتر ہی متصور ہوتے اپنی ذات کو ہر تہمت سے بالاتر رکھنے کا یہ اہتمام آپ صرف عدالتی امور ہی میں نہیں فرماتے تھے بلکہ زندگی کے عام اور معمولی معاملات میں بھی اس کا بشدّت اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دو صحابہ نے آپؐ کو اپنی زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت صفیہ بنت

**حاکم کی ذات کا ہر تہمت سے بالاتر رکھنے کا اہتمام**

حیی رضی اللہ عنہا کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تو آپ نے انہیں ارشاد فرمایا "یہ صفیہ بنت حیی ہیں جو میری بیوی ہیں" یہ بات آپ نے محض اس لئے بتائی کہ شیطان ان کے دلوں میں وسوسہ ڈال کر آپ کی ذاتِ اقدس کو موردِ تہمت نہ بنا ڈالے۔

**مزاجِ اسلام**

جو شخص بھی قرآن و سنت کی روشنی میں دین اسلام کی حکمتوں اور مصلحتوں کا مطالعہ کرے گا اسے یہ محسوس ہو گا کہ اسلام بیجا تہمتوں اور بدگمانیوں کے پیدا ہونے کے تمام دروازوں کو بند کرنا چاہتا ہے اسی چیز کے پیشِ نظر فقہائے اسلام نے غلام کی شہادت، اس کے آقا کے حق میں اور اس کے عکس کو باپ کی شہادت بیٹے کے حق میں اور اس کے عکس کو اور دشمن کی شہادت کو دشمن کے خلاف غیر مقبول قرار دیا ہے کیونکہ ان تمام صورتوں میں جانبداری کی تہمت لگ سکتی ہے اور اسی مصلحت و حکمت کے پیشِ نظر حاکم خود اپنے حق میں عدالتی فیصلہ نہیں کر سکتا، کیوں؟ صرف اس لئے کہ حکام اور قضاۃ کی ذوات، موردِ تہمت نہ بن پائیں۔

**صحابۂ کرام کا طرزِ عمل**

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، مقاصد شریعت اور دین کی حکمتوں کو سمجھنے میں تمام افراد امت سے بڑھ کر فہم و فراست اور علم و بصیرت رکھتے تھے چنانچہ وہ لوگ بھی انہی مصالح کے پیشِ نظر اس بات کے قائل نہیں تھے کہ حاکم یا قاضی کو اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہیئے۔

**فرمانِ صدیق اکبرؓ**

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ اثر تقریباً سب شروح حدیث کی کتب میں موجود ہے کہ

فصح عن ابی بکرٍ الصدیق انہ قال: لو رأیتُ رجلاً علٰی حدٍّ مِّن حُدودِ اللہ لَمْ اٰخُذْہُ حتّٰی یکون مَعِیَ شَاھِدٌ غَیْرِیْ۔ (الطرق الحکمیۃ۔ لابن قیم ص۱۷۵)

"حضرت ابوبکر صدیقؓ سے یہ اثر بصحت منقول ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "اگر میں کسی کو حدود اللہ میں سے کسی حد کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھوں

تو اس پر اس وقت تک گرفت نہ کروں گا جب تک کہ میرے ساتھ کوئی گواہ اور نہ ہو۔"

**فرمانِ عمر فاروق رض** اسی طرح کا ایک اثر جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

عن عمر بن الخطاب انہ قال لعبد الرحمان بن عوف "ارأیت لو رأیتُ رجلاً قَتَلَ اَوْ شَرِبَ اَوْ زَنیٰ؟ قال شہادتك شہادۃُ رجلٍ" فقال عمر "صدقت" وروی نحو ھذا عن معاویۃ وابن عباس"

(الطرق الحکمیۃ۔ لابن قیم ص ۱۷۶)

"حضرت عمر بن الخطاب سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عبدالرحمان بن عوف سے پوچھا "تمہاری کیا رائے ہے اگر میں کسی شخص کو قتل، شراب خوری یا زنا کا مرتکب پاؤں؟ انہوں نے جواب دیا "تمہاری شہادت تو ایک مرد (فردِ واحد) کی گواہی ہے (یعنی تمہارا دیکھنا حاکم کا علم نہیں بلکہ گواہ کا مشاہدہ ہے) آپ نے جواباً فرمایا "بجا ہے" اس طرح کی بات حضرت معاویہ اور ابن عباس سے بھی مروی ہے۔"

ضحاک کے واسطے سے جناب عمر بن الخطاب سے یہ بھی منقول ہے۔

ان عمر اختصم الیہ فیمن یعرفہ فقال للطالب: اِنْ شِئْتَ شَھِدْتُّ وَلَمْ اَقْضِ وَاِنْ شِئْتَ قَضَیْتُ وَلَمْ اَشْھَدْ۔ (حوالہ مذکور)

"حضرت عمر کے پاس ایک شخص مقدمہ لے کر آیا جس کی روئیداد مقدمہ کا انہیں علم تھا آپ نے مدعی سے فرمایا "اگر تم چاہو تو میں شاہد بن جاؤں پھر میں قاضی اور حاکم نہ بنوں گا لیکن اگر تم چاہو تو میں فیصلہ کروں گا مگر میں تمہارے حق میں شاہد نہیں ہوں گا۔"

بہر حال عہد صحابہ میں قاضی یا حاکم کے ذاتی علم کی بناء پر فیصلہ نہ کر سکنے کا مسئلہ

**اجماعِ صحابہ رض** ایک متفق علیہ مسئلہ تھا صحابہ میں سے کسی کی رائے بھی اس کے خلاف نہ تھی۔

"قد ثبت عن ابی بکر وعمر وعبد الرحمان بن عوف وابن عباس

ومعاويه: المنع من ذلك ولا يعرف لهم في الصحابة مخالف"

(الطرق الحکمیۃ لابن القیم ص۱۷۹)

"ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ کرنے سے ممانعت ابوبکر، عمر، عبدالرحمان بن عوف، ابن عباس اور معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے صحابہ سے ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ صحابہ میں اس کا کوئی مخالف نہ تھا۔"

اس مختصر سی بحث سے یہ واضح ہے کہ عہدِ صحابہ میں معمول بہ اور مُسلّمہ و متفقہ حقیقت یہی تھی کہ حاکم اپنے ذاتی علم کو فیصلے کی بنیاد نہیں بنا سکتا اسے بہر حال شواہد و بینات ہی کی بنیاد پر مطمئن ہو کر فیصلہ کرنا ہے البتہ بعد کے فقہاء نے علی الاطلاق نہیں بلکہ محدود معاملات میں چند شرائط سے مشروط طور پر ذاتی علم کی بنیاد پر فیصلہ کر ڈالنے کو جائز رکھا ہے لیکن یہ بہر حال روحِ اسلام اور مقاصد شریعت کے منافی ہے۔

محترم عثمانی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ بعد کے ان فقہاء کی انفرادی آراء کی بنیاد پر ججوں اور حاکموں کو اختیار دیدیا جائے کہ وہ جس کو چاہیں "ذاتی علم" کا بہانہ بنا کر انہیں نشانۂ انتقام بنائیں بالخصوص جبکہ حاکم یا جج کی عداوت بھی مخفی اور مستور ہو۔ پھر خاص طور پر ہمارے اس پُرفتن دور میں اگر یہ اختیار ہر حاکم و جج کو عدالتوں میں دیدیا جائے تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ اہل فہم و فراست حضرات سے مخفی نہیں ہے سوچنے کی بات یہ ہے کہ خلفائے راشدین جیسے پاکباز، خدا ترس اور نیک نیت حکام و قضاۃ کو بھی اگر یہ اختیار حاصل نہیں تھا تو آج کے مفاد پرست حکام کو یہ اختیار نہ دینا تو اور بھی اولیٰ اور انسب ہے۔

## تیرھویں فصل۔ شہادتِ نسواں پر چند گذارشات

میں نے اصل مضمون جو محترم عثمانی صاحب کے جواب میں روزنامہ "جسارت" کراچی کو ارسال کیا تھا اس میں تیرہویں فصل کو اُن اٹھارہ واقعات کے جائزے کے لئے وقف

کیا گیا تھا جو موصوف محترم نے اپنے تردیدی مضمون کی ابتدا میں بیان کئے تھے لیکن اب میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان واقعات کی بجائے (جن میں سے بعض کا جائزہ مختلف فصلوں میں لیا جا چکا ہے) تین بنیادی باتوں کے ذکر پہ اکتفا کیا جائے۔

(۱) ـــــــ آیت ۲۸۲/۲ میں گواہ بنا لینے کا جو حکم مذکور ہے آیا وہ ایک ٹھوس عدالتی حکم یا محض اخلاقی "سازش" عدالتی حکم ہے یا محض (احتیاطی تدبیر کے طور پر) ایک "اخلاقی سفارش ہے" جسے اگر اختیار کر لیا جائے تو بہتر، ورنہ اللہ جل سلطانہ، کو کوئی خاص پُرخاش نہیں ہے۔

کل تک محترم عثمانی صاحب (سلف و خلف کے تمام علماء کی ہمنوائی میں) یہی فرماتے رہے ہیں کہ آیت کا تعلق ٹھوس عدالتی امور سے ہے چنانچہ جب وہ ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو گواہ بنانے کی مصلحت و حکمت بیان کرتے ہیں تو ان کی تحریر میں ـــــ عدالت، وکیل صاحبان کی جرح و قدح، مقدمے کی خرابی وغیرہ جیسے عدالتی امور کا ـــــ واضح طور پہ ذکر ملتا ہے۔

"عدالتوں کے چکر میں پھنسنا جہاں بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور وکیل صاحبان اپنی جرح قدح سے اچھے اچھوں کے اوسان خطا کر دیتے ہیں قرض لین دین کے سلسلے میں جو عورتوں کے دائرۂ کار سے تعلق بھی نہیں رکھتا ایک عورت کے لئے دردِ سر ہے وہ تفصیلات کے بیان میں الجھ سکتی ہے جس سے پورا مقدمہ ہی خراب ہو سکتا ہے ـــــ لہٰذا دو عورتیں ہونی چاہئیں کہ ایک عورت کو اگر کوئی الجھاؤ ہو تو دوسری اسے صاف کر دے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص۹۶)

تاہم آیت میں مذکور عدالتی حکم میں چونکہ صراحتاً دو خواتین کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر رکھا گیا ہے جو جناب عثمانی صاحب کی مزعومہ مساواتِ مرد و زن کے خلاف ہے اس لئے اس آیت سے پیچھا چھڑانے کے لئے اب یہ تاویل گھڑی گئی کہ اس کا عدالتی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ بس ایک اخلاقی ہدایت ہے۔

"آیت کریمہ کے اندازِ بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آیت کریمہ میں عدالت کے لئے یہ ہدایت نہیں کی جا رہی ہے۔" (۱) جسارت ۸۳-۷-۱۷

"پوری آیت شریفہ میں کہیں بھی باہمی نزاع، مقدمہ بازی، عدالت اور قاضی کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جب تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو یہ اخلاقی اور احتیاطی تدابیر اختیار کر لیا کرو۔"

(۱) جسارت ۸۳-۷-۱۷

تعجب ہے کہ جس آیت میں محترم عثمانی صاحب کو کل تک عدالتی امور سے متعلق واضح اشارات نظر آتے تھے آج انہیں اس میں کوئی اشارہ تک نظر نہیں آتا حالانکہ اسی آیت میں آگے یہ الفاظ بھی موجود ہیں وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا یعنی "یہ کہ گواہوں کو جب گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں" ـــــ اب یہ ظاہر ہے کہ گواہوں کو گواہی کے لئے بلانا عدالت ہی کا کام ہے۔

پھر حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی روشنی میں ایک عدالتی فیصلہ بھی صادر فرما دیا ہے۔

عن ابی موسیٰ الاشعری اَنَّ رَجُلَيْنِ اِدَّعَيَا بَعِيْرًا عَلٰى عَهْدِ رسولِ اللّٰه صلی اللّٰه علیہ وسلم فَبَعَثَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا شَاهِدَيْنِ فَقَسَمَهُ النَّبِیُّ بینهما نِصْفَيْنِ (مشکوٰۃ۔ باب الاقضیۃ والشہادات)

"ابو موسیٰ الاشعری سے روایت ہے کہ عہدِ رسالت مآب میں دو آدمیوں نے ایک اونٹ کے متعلق دعویٰ دائر کیا اور ہر فریق نے اپنے حق میں دو گواہ پیش کر دیئے، حضورؐ نے فیصلہ یوں فرمایا کہ اونٹ کو دونوں کے درمیان آدھوں آدھ تقسیم فرما دیا۔"

حضورؐ کے اس واضح فیصلے کے بعد بھی (جس میں وہی نصابِ شہادت مذکور ہے جو آیت میں بیان ہوا ہے) آیت کو عدالتی امور سے لاتعلق قرار دینا اور اس کے حکم کو محض ایک (غیر عدالتی) احتیاطی تدبیر قرار دینا بہت بڑی بے جا جسارت ہے۔

(۲) ـــــ زنا سے متعلقہ مقدمات میں شہادت کا قانون قرآن کریم میں سب سے پہلے آیت ۴/۱۵ میں بیان ہوا ہے جس میں مذکور نصابِ شہادت | اجمالِ حکم درضورِ تفصیل | (مع وصفِ ذکوریتِ شہداء) کو نزولِ وحی کے آخری دور تک برقرار رکھا گیا ہے اسی طرح معاشی لین دین میں عدالتی نصابِ شہادت سب سے پہلے آیت ۲/۲۸۲ میں بیان ہوا جو آخر تک برقرار رہا۔ اب اگر بعد میں نازل ہونے والی کسی آیت میں (بسلسلہ زنا) اجمالی طور پر چار گواہوں کا ذکر آیا ہو تو ان کی تفصیلِ صفات آیت ۴/۱۵ کی روشنی میں ہی طے کرنا ہوگی۔ اسی طرح معاشی امور میں اگر بعد میں (مثلاً یتیموں کو ان کے مال حوالے کر دینے کے سلسلے میں) گواہ بنا لینے کا حکم نازل ہوا تو یہ گواہ اسی نصابِ شہادت کی روشنی میں طے ہوں گے جو قرآن نے سب سے پہلے طے کر دیئے ہیں بایں الفاظ کہ ـــــ

"اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ بنا لو اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لو۔۔۔۔"

محترم عثمانی صاحب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ سورۂ نساء میں (بسلسلہ زنا) چاروں گواہوں کی طے شدہ صفت ذکوریت کو، سورہ نور میں واقع " اربعۃ شہداء" کے الفاظ سے مذکر کے صیغوں کی آڑ میں نظر انداز کر کے دونوں اصنافِ بشر کے لئے یکساں اور عام کر دیتے ہیں یہی سلوک وہ معاشی لین دین میں اس نصابِ شہادت سے کرتے ہیں جو سورہ بقرہ میں دائماً طے ہو چکا ہے یہ بہر حال ایک غلط طرزِ عمل ہے۔

(۳) ـــــ آخر میں میں محترم عثمانی صاحب اور ان کے ہمنوا دیگر اہلِ علم حضرات | کو یہ دعوتِ فکر دوں گا کہ وہ غور فرمائیں کہ آیا شہادت ایک "فریضہ" ہے یا "ایک حق" ہے۔ گواہ بن جانے کی صورت میں شاہد پر کسی ذمہ داری کا بوجھ آن پڑتا ہے یا اسے کوئی اعزاز و سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ آپ اس پر جس قدر بھی غور فرمائیں گے یہ محسوس کریں گے کہ شہادت کوئی سعادت یا اعزاز نہیں ہے بلکہ ایک "بارِ فرض" اور "ثقیل ذمہ داری" ہے۔ جس طرح قرآن کریم اَقِیْمُوا الدِّیْنَ (دین کو قائم کرو) اور اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (نماز قائم کرو) کہہ کر اقامتِ

دین اور اقامتِ نماز کو مسلمانوں پر ایک "ذمہ داری" اور "بارِ فرض" کی حیثیت سے عائد کرتا ہے بالکل اسی طرح وہ اَقِیْمُوا الشَّھَادَۃَ (شہادت قائم کرو) کہہ کر اسے بھی ایک "بار فرض" اور "ذمہ داری" قرار دیتا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو ادائے شہادت پر مامور کرنا اس پر "ثقیل ذمہ داری" لاد دینا ہے اور اسے ادائے شہادت سے سبکدوش کرنا۔ دراصل اسے ذمہ داری کے بوجھ سے آزاد کرنا ہے نہ کہ اسے کسی حق سے محروم کرنا ـــــ جس پر سے شہادت کی ذمہ داری اٹھالی گئی اسے اس "بارِ فرض" سے سبکدوش کر دیا گیا نہ کہ کسی سعادت و اعزاز سے محروم کر دیا گیا۔

اب جبکہ خود قرآن کریم کی نگاہ میں بھی شہادت ایک "ذمہ داری" اور "بارگراں" قرار پائی (نہ کہ کوئی اعزاز و سعادت) تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کو خواہ مخواہ عدالتی گواہ قرار دینے میں یہ سرگرمی کیوں دکھائی جاتی ہے؟

کیا ہمارے مہربان، شہادت کے اس پہلو پر اور اس کی اس حیثیت پر بھی غور فرمائیں گے؟

TRUEMASLAK @ INBOX.COM

# باب ۸

# مملکت اور سربراہیِ نسواں

خواتین اپنی طبعی کمزوریوں کی موجودگی میں اور تدبیر امور خانہ اور بچوں کی ولادت، تربیت، پرورش اور تعلیم کے فطری وظائف سے کنارہ کش ہوتے ہوئے کیا سربراہِ مملکت کے عہدے پر متمکن ہو سکتی ہیں؟ محترم عثمانی صاحب اس کا جواب "ہاں" میں دیتے ہوئے جو دلائل بیان فرماتے ہیں ان میں سے پہلی دلیل یہ ہے کہ

عثمانی صاحب کی پہلی دلیل

"انبیائے سابقین کی شریعت جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا ہو یا حق تعالیٰ نے بغیر کسی نکیر کے قرآن کریم میں نقل فرما دیا ہو ہمارے لئے بھی شریعت ہوتی ہے اور ہمارے لئے اس کا اتباع اور پیروی لازمی ہوتی ہے قرآن کریم کی سورۂ نمل میں ملکۂ سبا حضرت بلقیس کی امارتِ کبریٰ کا قصہ ملاحظہ فرمائیں قرآن کریم نے ان کو ایک ملک (سبا) کی سربراہِ مملکت اور با اختیار و اقتدار ملکہ کی حیثیت سے پیش فرمایا ہے اور اس کے صاحب اقتدار و اختیار سربراہِ مملکت ہونے پر قرآن کریم نے کوئی معمولی سی نکیر بھی نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں ان کا سربراہ مملکت ہونا صحیح ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۶۴)

**جوابِ دلیل** موصوف محترم کی یہ دلیل دو اجزاء پر مشتمل ہے۔

اولاً یہ کہ انبیائے سابقین کی شریعت ـــــ ہمارے لئے بھی شریعت ہے۔

ثانیاً یہ کہ قرآن کی نگاہ میں بلقیس کا سربراہِ مملکت ہونا صحیح ہے کیونکہ قرآن نے اس واقعہ کو بغیر کسی نکیر کے پیش فرمایا ہے۔

اب ہم موصوف محترم کی دلیل کے ان دونوں اجزاء کا صرف قرآن کریم ہی کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

**اتباع شرائعِ سابقہ کا مسئلہ**

جہاں تک انبیائے متقدمین کی شریعتوں کی اطاعت و پیروی کا تعلق ہے محترم عثمانی صاحب رقمطراز ہیں کہ

> ”اس بارہ میں فقہاء نے مختلف آراء قائم کی ہیں یہ مسئلہ اس لقب سے یاد کیا جاتا ہے کہ انبیائے سابقین کی شریعت ہمارے لئے بھی شریعت ہیں (تاآنکہ ان کا منسوخ ہونا ثابت ہو جائے) یا نہیں؟ اس میں فقہاء کرام کے پانچ قول ہیں“

(اقتباس مولانا ظفر احمد عثمانی۔ ماخوذ از فقہ القرآن ج ٣ صـ٢٦١)

**اتباع شرائع سابقہ کے متعلق دو مسالک**

لیکن ہم فقہائے کرام کے ان پانچ اقوال کی تفصیل میں جانے کی بجائے صرف دو اقوال پر اظہار رائے کرتے ہیں کیونکہ ان تمام اقوال کا خلاصہ انہی دو اقوال میں مضمر ہے ایک قول یہ ہے کہ ”انبیائے سابقین کی شرائع کی پیروی ہم پر بھی لازم ہے تاآنکہ ہمیں ان میں سے کسی حکم کے اتباع سے منع نہ کیا گیا ہو“ ــــ دوسرا قول یہ ہے کہ ”شرائع متقدمہ کا اتباع ہم پر سے ساقط ہے ہم ان کے کسی حکم کے اتباع پر مامور نہیں ہیں الا یہ کہ کوئی حکم ہماری شریعت میں ایسا ہو جو سابقہ شرائع کے کسی حکم سے موافقت رکھتا ہو ایسی صورت میں اتباع کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نبیٔ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس حکم پر چل رہے ہیں نہ یہ کہ سابقہ شرائع میں سے کسی حکم کی پیروی کی جارہی ہے“ ــــ

ہمارے نزدیک یہ آخری قول ہی صحیح قول ہے سنت نبوی کو تو خیر بعض لوگ حجت اور ماخذ قانون ماننے ہی نہیں لیکن قرآن جو سب کے نزدیک دلیل اول اور مصدر قانون ہے حق میں آخری قول ہی کی تصدیق و تصویب فرماتا ہے۔

**مطالعۂ قرآن اور عقل عام کا فیصلہ**

قرآن کریم کا سرسری مطالعہ بھی قاریٔ قرآن پر یہ حقیقت واضح کر دیتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات میں تمام انبیاء پر فضیلت و فوقیت حاصل ہے کہ گذشتہ پیغمبروں کی شریعتیں زمان و مکان کی حدود میں محدود تھیں مگر نبیٔ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت عصر و مصر کی حد بندیوں سے بالاتر ہے انبیائے سابقین خاص خاص قوموں اور علاقوں کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں مگر حضرت خاتم الانبیاء والرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت تک ہر فرد بشر اور ہر قوم انسان کے لئے نبی بنایا گیا ہے سابقہ انبیاءؑ کی شریعت خاص لوگوں اور خاص علاقوں تک محدود و مخصوص تھی مگر اللہ کے آخری رسولؐ کی شریعت ایسی ہر محدودیت سے ناآشنا اور ہر حد بندی سے بالاتر ہے گذشتہ شرائع کے احکام جن لوگوں کے لئے مخصوص اور محدود تھے انبیائے کرامؑ ان کے علاوہ دیگر لوگوں کو ان احکامِ شریعت کا نہ تو مکلف ہی سمجھتے تھے اور نہ ان کی تبلیغ ہی فرماتے تھے۔ بقول مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی شریعت کے احکام کو غیر بنی اسرائیل تک عام اور متعدی کرنا "بھیڑوں کا کھانا کتوں کے آگے ڈالنے" کے مترادف ہے۔ پس جو شخص سابقہ شریعتوں کے احکام کو امتِ محمدیہ کے افراد پر لازم قرار دیتا ہے وہ بیک وقت کئی لغزشوں کا ارتکاب کرتا ہے اولاً یہ کہ جو احکام زمانی اور مکانی حدود تک محدود ہیں وہ انہیں ان کی اصل حدود سے متجاوز بلکہ بالاتر قرار دیتا ہے ثانیاً یہ کہ وہ عصر و مصر کی حدود میں محدود شریعت کو جب پوری نوعِ انسانی تک (جس پر آج امت محمدیہ مشتمل ہے) عام اور متعدی کر دیتا ہے تو وہ ایک سابقہ شریعت کے "خصوص" میں "عمومیت" کا رنگ پیدا کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں ایک علاقائی اور قومی شریعت کو بین الاقوامی شریعت کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جو حقیقت نفس الامری کے خلاف ہے ثالثاً یہ کہ ایسا کرتے ہوئے وہ سابقہ محدود شرائع میں تو وسعت پیدا کر دیتا ہے مگر شریعت محمدیہ کو ایسا ناقص نظامِ قانون تصور کرتا ہے کہ اس کے نقص کو پورا کرنے کے لئے اُن شرائع متقدمہ سے احکام مستعار لیتا ہے جنکی مخاطب بہر حال یہ امت نہیں بلکہ امم سابقہ ہیں مزید برآں اتباع شرائعِ سابقہ کو آخر الامم پر لازم کر دینے والا گذشتہ انبیاء کو زمانی اور مکانی حدود سے نکال کر عالمگیر نبی کے منصب پر فائز کرتا ہے اور جو فی الواقع اس

منصب پر فائز ہے اس کی شریعت کو نامکمل تصور کرتے ہوئے سابقہ شریعتوں سے احکام کی پیوندکاری کے ذریعے مکمل کرتا ہے ان ھذا الشیئ عجاب الغرض گذشتہ شرائع کے اتباع کا تصور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے عالمگیر ہونے کی فضیلت کو باطل کر دینے والا تصور ہے۔

لیکن ان سب باتوں سے صرف نظر کر کے اگر سابقہ شرائع کی پیروی کے مسلک کو اختیار بھی کیا جائے تو عملاً یہ اطاعت و پیروی ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ ان سب (گذشتہ) شریعتوں کے اصل ماخذ یا تو مسخ و معدوم ہو چکے تھے یا انسانی ہاتھوں سے تحریف و تبدل کا شکار ہو چکے تھے اس لئے عملاً ان کا اتباع ممکن بھی نہیں ہے اسی لئے تو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو علیحدہ اور جدید شریعت عطا کی گئی تاکہ عوام الناس اس سے ہدایت پا سکیں۔

اب اس کے بعد آیئے قرآن کریم کی طرف!

اس میں شک نہیں کہ سابقہ آسمانی شریعتیں بھی وحی الٰہی پر مبنی تھیں اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی وحیٔ خداوندی پر مبنی ہے مگر سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو کس وحی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے؟

**قرآنی تصریحات**

اس وحی کے اتباع کا جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل ہوئی؟ یا اس وحی کی پیروی کا جو انبیائے سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام پہ نازل کی گئی تھی؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جو اس وقت ہمارے زیر بحث موضوع کا دوٹوک فیصلہ کر دیتا ہے درج ذیل آیات کا بغور مطالعہ فرمائیے جنہیں ایک خاص ترتیب سے ہم پیشِ خدمت کر رہے ہیں۔

(ل) سب سے پہلے وہ آیات ملاحظہ فرمائیں جن میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو (انبیائے سابقین کی وحی کی پیروی کرنے کی بجائے) صرف اس وحی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی۔

۱۔۔۔ اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶:۱۰۶)

"اس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔"

۲ـــــ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳) "جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اسے چھوڑ کر دوسروں کو اپنا سرپرست بنا کر ان کی پیروی نہ کرو۔"

۳ـــــ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ (۱۰/۱۰۹) "تم اس چیز کی پیروی کئے جاؤ جو تمہاری طرف وحی کی جاتی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے۔"

۴ـــــ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۳۳/۲) "اور صرف اس چیز کا اتباع کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے وحی کی جا رہی ہے بیشک اللہ تعالیٰ صاحب علم اور صاحب حکمت ہے۔"

۵ـــــ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳۹/۵۵) "اور پیروی کرو اس چیز کے بہترین پہلو کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے۔"

ان پانچوں آیات میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی امت کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ آپ "مطلق وحی" کی پیروی کریں بلکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ صرف اس "خاص وحی" کی پیروی و اطاعت اختیار کی جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے آخر الامم کو عطا کی گئی ہے۔

(ب) اب وہ آیات ملاحظہ فرمائیے جن میں اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا آیات میں دیئے جانے والے واضح حکم کے نتیجے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو خود آپ ہی کے الفاظ میں یوں کہلوایا گیا ہے کہ

۱ـــــ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ---- (۶/۵۰) "میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف نازل کی جاتی ہے۔"

۲ـــــ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷/۲۰۳) "ان سے کہو میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھے بھیجی جاتی ہے۔"

۳ ــــــ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۱۵/۱۰) "میں تو اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔"

۴ ــــــ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۹/۴۶)

"میں تو صرف اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔"

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اعلانات ہیں جو یہ واضح کرتے ہیں کہ آپ صرف اس وحی کا اتباع کرتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی جاتی ہے نہ کہ اس وحی کا جو گذشتہ انبیأ کی طرف بھیجی جاتی رہی ہے۔

(ج) اب ان آیات کو ملاحظہ فرمائیے جن میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ کفار خواہ وہ مشرکین عرب ہوں یا اہل کتاب۔ یہ چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وحی سے پھیر دیا جائے جو "آپ کی طرف" نازل ہو رہی تھی وہ آپ کو اس "وحی" سے منحرف نہیں کرنا چاہتے تھے جو ماضی کے انبیاء کی طرف نازل کی گئی تھی کیونکہ گذشتہ دور کی کسی وحی کا اتباع آپ سرے سے کرتے ہی نہیں تھے کہ اس سے آپ کو منحرف کر دینے کی وہ کوشش کرتے۔

۱ ــــــ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ (۴۹/۵)

"ہوشیار رہو کہ یہ لوگ تمہیں فتنہ میں ڈال کر اس چیز سے تمہیں منحرف نہ کر پائیں جو خدا نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔"

۲ ــــــ وَاِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَهٗ (۷۳/۱۷) "ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ دو۔"

(د) اب آخر میں وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صرف

اس وحی کی تبلیغ اور اس وحی سے وابستہ رہنے پر مامور تھے جو خدا کی طرف سے آپ کو بھیجی جاتی تھی۔

۱۔۔۔ یَا اَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵/۶۷)

"اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔"

۲۔۔۔ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ (۴۳/۴۳)

"اس چیز کو مضبوطی سے تھامے رہو جو تمہیں وحی کی گئی ہے۔"

جو چیز اہل کتاب کے کفر و سرکشی میں اضافے کا موجب ہے وہ سابقہ وحیوں کا انکار نہیں بلکہ اس وحی کا انکار ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نازل کی گئی ہے۔

وَلَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّكُفْرًا ط (۵/۶۴) "جو چیز تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کی سرکشی و باطل پرستی میں اضافے کا موجب بن گئی ہے۔"

حضرت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس وحی کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے پابند تھے جو آپ کی طرف نازل کی گئی تھی نہ کہ اس وحی کی بنیاد پر جو انبیائے سابقین کو بھیجی گئی تھی۔ سورہ مائدہ میں ہے کہ

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۔۔۔۔ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۔۔۔۔ (۴۸) وَاَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ ط ۔۔۔۔ (۵/۴۹)

اے نبی! ہم نے تمہاری طرف یہ برحق کتاب نازل کی ۔۔۔۔ آپ لوگوں کے درمیان اس "ما انزل اللہ" کے مطابق فیصلہ کریں اور ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں ۔۔۔۔ اور آپ "ما انزل اللہ" کے مطابق ان کے باہم امور میں فیصلہ فرمائیں ان کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں اور ان سے چوکنے رہیں کہ وہ تمہیں اس "ما انزل اللہ" سے نہ پھیر دیں جو "تری طرف" نازل ہوا ہے۔

اس آیت کے آغاز میں "ما انزل اللہ" جو مذکور ہے تو اس سے مراد "مطلق وحی" نہیں ہے بلکہ صرف وہی "خاص وحی" مراد ہے جسے "ما انزل اللہ الیک" کہہ کر آیت کے آخر میں واضح کر دیا گیا ہے۔

خلاصۂ آیات | الغرض یہ تمام آیات اس حقیقت کو شک و شبہ سے بالاتر کر دیتی ہیں کہ جس وحی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استمساک و تبلیغ کا تعلق تھا جس وحی کے اتباع کا آپؐ عملاً التزام فرماتے تھے جس وحی کے امتثال پر آپؐ مامور من اللہ تھے جس وحی سے آپؐ کو منحرف کر دینے کے لئے اعداءِ اسلام کوشاں رہتے تھے اور جس وحی کے مطابق آپؐ عوام الناس کے درمیان فیصلہ کرنے کے پابند تھے وہ وحی وہ نہیں تھی جو گذشتہ انبیاء کی طرف بھیجی گئی تھی بلکہ وہ صرف وہ وحی تھی جو "آپ کی طرف" نازل کی گئی تھی سابقہ وحیوں کے ساتھ ہمارا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف ایک تعلق ہے اور وہ ہے نظریاتی اعتقاد و ایمان کا تعلق جسے قرآن نے متقین کی صفات قرار دیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (متقی وہ لوگ ہیں..... جو آپ کی طرف نازل ہونے والی وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی وحی پر بھی ___ $\frac{۲}{۳}$)۔ رہا بعد از ایمان، اتباع و پیروی اور قضاء و حکم کا تعلق تو وہ صرف اس وحی کے ساتھ "خاص" ہے جو حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین کی طرف نازل کی گئی ہے یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ مندرجہ بالا آیات کو "فکرِ اسلامی" اور "طلوعِ اسلام" کے کیمپوں سے وابستہ حضرات اپنی کتابوں میں بڑے زور شور سے درج کرتے ہیں تاکہ حدیث رسول کے "مقابلے" میں صرف "قرآنی وحی" کا اتباع "ثابت و لازم" قرار دیا جائے۔ قرآن کے علاوہ بھی حضرت مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل ہوتی تھی یا نہیں؟ فی الحال اس سوال کو نظر انداز کیجئے اور اس بات پہ اپنی توجہ مبذول فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ صاحب قرآن پیغمبر اور اس کی امت کو "مطلق وحی" کے اتباع کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ صرف اس "خاص وحی" کی اطاعت کا پابند کر رہا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نازل ہوئی تھی لیکن ہمارے کچھ مہربان یہ فرماتے ہیں کہ ___

"اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو سابقہ وحیوں کی اطاعت کا پابند کیا ہے ماسوا، اس حکم کے جسے آخری وحی نے منسوخ کر دیا ہو"۔۔۔۔۔ اس اصول کے مطابق سابقہ شرائع کے ساتھ ہمارا بنیادی تعلق یہ قرار پایا کہ ۔۔۔۔۔ "ہم اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سابقہ شرائع کی پابندی اصلاً تعبدی فریضہ ہے ماسوا (گذشتہ شرائع کے) اُس حکم کے جسے آخری وحی نے ناقابلِ عمل یا منسوخ قرار دیا ہو"۔۔۔۔۔ گویا آخری وحی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ زمانی اور مکانی حدود میں محدود سابقہ شرائع کو (جو مسخ و تحریف کا نشانہ بھی بن چکی ہیں) ترک کر کے نئے حالات میں عصر و مصر کی حد بندیوں سے بالاتر ایک ایسا نظامِ حیات پیش کرے جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے پیغامِ امن و سکون ہو بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ سابقہ علاقائی، قومی اور زمانی حدود میں گھری ہوئی اُس عارضی شریعت کی عمارت میں جزوی ترمیم کی پیوندکاری کرتی رہے جو مخصوص امکنہ اور محدود ازمنہ کے لئے معرضِ وجود میں آئی تھی ۔۔۔۔۔ اس کے برعکس قرآن فی الواقع جو حقیقت پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ۔۔۔۔۔ "آخری نبی اور آخری امت پر صرف اس وحی کے اتباع کا تعبدی فریضہ عائد کیا گیا ہے جس نے سابقہ وحیوں اور ان پر مبنی شرائع کو کالعدم کر دیا ہے اِس آخری وحی کا کوئی حکم اگر سابقہ شرائع کے موافق ہے تو اس حکم کا اتباع سابقہ شریعت کی اطاعت کے سبب سے نہیں بلکہ اس آخری وحی کی پیروی کے نقطۂ نظر سے اختیار کیا گیا ہے"

**قرآنی تصریحات اور محترم عثمانی صاحب کی "فقہ"!**

مگر ان قرآنی تصریحات کے علی الرغم محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

"یہ فقہ میں طے شدہ مسئلہ ہے کہ جب تک قرآن کریم میں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی ہدایت نازل نہ ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گذشتہ شریعتوں کی ہی پیروی فرمایا کرتے تھے۔" (رجم اصل حد ہے یا تعزیر ص۶۱)

فی الحال اس بات کو چھوڑئیے کہ فقہ میں اس مسئلے کو کس نے "طے شدہ مسئلہ" قرار دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی دسیوں آیات اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ آپؐ صرف اس وحی کے اتباع پر مامور رہیں جو "آپ کی طرف" بھیجی گئی ہے حضرت نبیٔ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم

کو پے در پے آخری وحی کے اتباع کا حکم دینے کے بعد سابقہ شرائع کی پیروی کو بھی لازم قرار دینا ایک قطعی جاہلانہ طرزِ عمل ہے جو "قرآن" "قرآن" کی رٹ لگانے والے کو زیب نہیں دیتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ گذشتہ شرائع کی پیروی و اطاعت کو لازم قرار دیتے ہیں دین و شریعت، اصول و جزئیات وہ شاید یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کسی خاص قوم کو مخصوص زمان و مکان میں دیئے جانے والے احکام اس عالمگیر شریعت کی جگہ لے ہی نہیں سکتے جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ایک امت کے لئے قابلِ عمل قرار پا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی ہر وحی دو اجزاء پر مشتمل ہے۔

۱ ــــ وہ مشترک اور عام ہدایات جو اساسی افکار اور بنیادی نظریات کی حیثیت سے مستقل اور دائمی قدر و قیمت کی حامل ہوتی ہیں اسلامی معتقدات اور ایمانیات اسی ضمن سے ہیں توحید اور ردِّ شرک ان تعلیمات کا مرکزی مضمون ہے یہ ہر شریعت اور ہر وحی کا لازمی حصہ ہیں۔

۲ ــــ وہ منفرد ہدایات اور جداگانہ احکام جو ایک خاص قوم کے لئے خاص زمانے تک امتثال و تعمیل کے لئے وحی کی صورت میں نازل کئے گئے ہیں اوامر و نواہی اور حلال و حرام کی تعلیمات اسی ضمن سے ہیں یہ ہدایات و احکام ہر امت کے لئے مختلف اور منفرد ہیں قرآنی اصطلاح میں ان احکام کے مجموعہ کو "شرعة"، "شریعت" یا "منہاج" کہا جاتا ہے۔

اوّل الذکر حصۂ وحی ہمیشہ اور ہر زمانے میں دینِ اسلام کا لازمی جزو رہا ہے اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن میں اسے "دین" کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے کیونکہ ہمیشہ اور ہر دور میں اس جزوِ وحی کو "اصلِ دین" کی حیثیت حاصل رہی ہے تاہم لفظ "دین" کا اطلاق قرآن کریم کی روشنی میں جملہ شرائع میں موجود "مشترک تعلیمات" کے ساتھ جمع ہو کر ان اوامر و نواہی اور تعلیماتِ حلال و حرام پر بھی ہوتا ہے جو کسی خاص شریعت کی تشکیل کرتے ہیں۔ قرآنی سیاق و سباق اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ کہاں "دین" سے مراد محض اوّل الذکر چیز ہے (جس کا بنیادی فکر عقیدۂ توحید اور ردِّ شرک ہے) اور کہاں اول الذکر اور ثانی الذکر اجزائے وحی کے پورے مجموعے کا نام "دین" ہے یہی حال لفظ "شریعت"

کا ہے کہ وہ کہیں تو اوّل الذکر جزوِ وحی کے مقابلے میں ثانی الذکر جزوِ وحی پر اطلاق پذیر ہوتا ہے اور کہیں دونوں اجزائے وحی کے مجموعے پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

دین و شریعت کی اس ابتدائی وضاحت کے بعد ہم محترم عثمانی صاحب کی "قرآنی دلیل" کا جائزہ لیتے ہیں جس کی بنیاد پر غالباً انہوں نے اپنی فقہ میں یہ طے کر رکھا ہے کہ انبیائے سابقین کی شریعت بھی ہمارے لئے واجب الاتباع ہے موصوفِ محترم سورۂ انعام کی آیات

**آیت ۹۰ کی وضاحت** ۸۷ تا ۹۰ کو مع ترجمہ درج کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ

"ان آیات میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ انبیائے سابقین کی ہدایت کی آپ بھی پیروی فرمائیں کیونکہ ان کو جو ہدایت اور روشنی عطا فرمائی گئی تھی وہ بھی منجانب اللہ[1] تھی۔"

(رجم اصل حد ہے یا تعزیر صلہ)

موصوف مکرم کی بنائے استدلال آیت کے ان الفاظ پر قائم ہے أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (یہی وہ حضرات انبیاء ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی ہے پس آپ بھی اے پیغمبر! ان کی ہدایت کی پیروی فرمائیے) اس استدلال پر مندرجہ ذیل گذارشات قابلِ غور ہیں۔

۱ ـــــــ اس آیت میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ہدایت کی پیروی و اقتداء کا حکم دیا گیا ہے جس کی اضافت تمام انبیاء کی طرف کی گئی ہے (هُدَاهُمُ اقْتَدِهْ) اور جو سب پیغمبروں میں مشترک اور متفق علیہ ہے کسی ایسی ہدایت کی پیروی کا حکم نہیں ہے جو امورِ شریعت (ہماری تقسیم کے مطابق دوسرے جزوِ وحی) سے متعلق ہو کیونکہ ہر امت کے لئے احکامِ شریعت ہر دوسری امت سے مختلف ہوتے ہیں انبیائے سابقین میں سے ہر ایک کی شریعت اپنے سے پہلی یا بعد والی شریعت سے ناسخ و منسوخ کے رشتے میں منسلک ہوتی ہے اوامر و نواہی میں (جو ہر شریعت میں اقتضائے حالات کے تحت بدلتے

---

[1] یقیناً انبیائے سابقین کی وحی بھی منجانب اللہ تھی مگر آپ کو حکم یہ نہیں تھا کہ آپ "مَا أُوحِيَ" (جو کچھ وحی کیا گیا ہو) کا اتباع کریں بلکہ یہ تھا کہ آپ "ما اوحی الیک" یا "ما یوحیٰ الیک" (جو آپ کی طرف وحی کیا گیا یا کیا جاتا ہے) کا اتباع [illegible] سمجھتے ہیں۔

رہتے ہیں) جملہ سابقہ شرائع کا اتباع ممکن ہی نہیں ہے پس آیت میں جس ہدایت کی اقتدار کا حکم ہے وہ تمام شرائع سابقہ کی مشترک تعلیمات پر مشتمل ہے مثلاً توحید، رد شرک اور اس طرح کی دیگر تعلیمات جو کسی ایک شریعت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام شرائع سے ان کا یکساں تعلق ہے۔

٢ ـــــ اس آیت میں انبیائے سابقین کی "ہدایت" سے مراد "اصلِ دین" (یعنی توحید کی پیروی اور رد شرک) میں انبیاء کی اطاعت و اقتدار ہے یہ الفاظ اسی حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۸۸) | یہ ہے اللہ کی وہ ہدایت جسکی طرف وہ اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے اگر ان تمام انبیاء نے شرک کیا ہوتا تو ان کے تمام اعمال اکارت جاتے۔ |

یہ الفاظ اس امر کو قطعی واضح کر دیتے ہیں کہ انبیائے سابقین کی جس "ہدایت" کی پیروی کا حکم نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے اس کا تعلق توحید اور ردِ شرک سے ہے، جس سے کنارہ کشی کے نتیجے میں اعمال برباد ہو جاتے ہیں (وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ)۔

٣ ـــــ خود قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ ہر امت کے لئے (اصل دین یعنی توحید کے اشتراک کے باوجود) حلال و حرام کے ضوابط اور اوامر و نواہی کی تعلیمات الگ الگ ہیں جن کو "شرعة" یا "منہاج" کہا گیا ہے جہاں تک اصل دین (یعنی عقیدہ اور اس کے اثباتی دلائل یا رد شرک اور اس کے جملہ دلائل) کا تعلق ہے اس میں کسی شریعت میں کوئی فرق نہیں ہے اور جہاں تک حلت و حرمت اور امر و نہی کے قواعد و ضوابط پر مشتمل شرائع کا تعلق ہے خود قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ

| | |
|---|---|
| لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا | ہر ایک امت کے لئے ہم نے الگ الگ شرعۃ اور منہاج بنایا ہے۔ |

اب غور فرمائیے کہ جہاں تک توحید اور اصل دین کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیتا ہے کہ

فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ — انبیائے سابقین کی ہدایت کی پیروی فرمائیے۔

اور جہاں تک حلت وحرمت، امر ونہی اور دیگر امور کا تعلق ہے خدائے ذوالجلال والاکرام کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم یہ ہے کہ

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا (۴۵/۱۸) — ہم نے آپ کو بھی ایک شریعتِ امر عطا کی ہے پس آپ اسی کی ہی پیروی کریں۔

پس ہماری یہ بحث اس بات کو واضح کر دیتی ہے کہ آپؐ (اور آپ کی امت) سابقہ شرائع میں سے کسی شریعت کے اتباع کے پابند نہیں تھے قرآن بتکرار بسیار یہی حکم دیتا ہے کہ ــــ "آپؐ صرف اسی وحی کی پیروی کریں جو آپ کی طرف نازل کی گئی (یا کی جاتی) ہے" ــــ اور یہی حکم قیامت تک کے لئے امتِ محمدیہ کے لئے بھی ہے۔

الغرض قرآن پاک میں ایسی جتنی آیات بھی مذکور ہیں جن سے آپؐ کے لئے کسی نبیٔ سابق کے اتباع کا مفہوم متبادر ہوتا ہے ان میں ایمان واعتقاد (اور توحید وردِ شرک) کے گوشوں میں انبیائے سابقین کا اتباع مراد ہے نہ کہ حلال وحرام اور امر ونہی یا اس طرح کے دیگر امور ہیں۔ احادیث میں لے دے کر اس ایک واقعہ کو انبیائے سابقین کی اقتداء و اطاعت کے لئے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے جسے صحیحین کے علاوہ دیگر مسانید میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ

دلیل رجم اہلِ کتاب

"یہود' بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ "ہم میں سے ایک مرد اور عورت نے باہم زنا کا ارتکاب کیا ہے" حضور نے فرمایا "تمہاری کتاب میں رجم کے متعلق کیا مذکور ہے" انہوں نے جواب دیا کہ "ہم زنا کاروں کی فضیحت کرتے ہیں اور انہیں کوڑے مارتے ہیں" حضرت عبداللہ بن سلام بول اٹھے کہ "یہ جھوٹ ہے تورات میں حکمِ رجم موجود ہے" تورات لانے کا انہیں حکم دیا گیا یہود نے تورات کھول کر آیتِ رجم پر ہاتھ رکھ کر اس کی لاحق وسابق

عبارت کو پڑھ دیا۔ عبداللہ بن سلام نے یہودی کو ہاتھ اٹھانے کو کہا۔ ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیتِ رجم موجود تھی یہود اب بول اٹھے کہ "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے بجا فرمایا بیشک تورات میں حکمِ رجم موجود ہے پھر آپ نے رجم کا حکم دیا اور دونوں زنا کاروں کو سنگسار کروا دیا۔" (خلاصۂ روایات)

ان روایات کو (جن کا خلاصہ ہم نے اوپر چند سطور میں بیان کیا ہے) محترم عثمانی صاحب بڑی شرح و بسط سے بیان کر کے ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات کے اس حکم کے مطابق عربوں کے ابتدائی حالات میں رجم کی سزا کو اپنا لیا تھا چنانچہ جب تک قرآن کریم میں زنا کی سزا نازل نہیں ہوئی تھی آپ بھی اس پر عمل فرماتے رہے اور آپ کا یہ عمل عین[1] قرآن کے مطابق تھا کیونکہ آپ کو پچھلے انبیاء کی شریعتوں پر عمل کرنے اور ان کی اقتدار کرنے کا حکم تھا۔" (رجم۔ اصل حد ہے یا تعزیر ص ۶۲)

اس سوال کو تو چھوڑ دیئے کہ جب قرآن جگہ جگہ بتکرار و اعادہ آپ کو اس "وحی" کی پیروی کا حکم دیتا ہے جو "آپ کی طرف" نازل کی گئی ہے تو پھر آپ نے کس طرح تورات پر عمل فرمایا؟ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ کسی صحیح اور صریح حدیث میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ـــ "میں تو وہی فیصلہ کروں گا جو خود تورات میں ہے۔" (رجم۔ اصل حد ہے یا تعزیر ص ۵۷)

محترم عثمانی صاحب نے ان الفاظ کو ابوہریرہ کی جس روایت کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے اس کے متعلق بعد از تحقیق یہ بات ثابت اور طے شدہ ہے کہ فی سندہ رجل مبھم (اس کی سند میں ایک غیر واضح اور مجہول راوی ہے فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۷۱)۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن بتکرار و اعادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

---

[1] یقیناً آپ کا سزائے رجم دینے کا عمل مطابقِ قرآن تھا کیونکہ یہ خود آخری شریعت کا ہی حکم ہے سابقہ شرائع کی اتباع سے قرآن روک کر آخری شریعت کی اتباع کا حکم دیتا ہے۔ (۴۵/۱۸)

حکم دیتا ہے کہ

اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ — آپ صرف اُس وحی کی پیروی کریں جو آپ پر نازل شدہ ہے۔

اور حضورؐ کی زبان سے ایک بار نہیں متعدد بار یہ اعلان ہوتا ہے کہ

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ — میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف نازل کی جاتی ہے۔

مگر "فکر اسلامی" کے علمبردار حکم خدا و قرآن کو بھی گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد بار بار کے اعلانات کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے اور یہی رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ آپ نے یہود کہ فیصلۂ رجم تورات کی بنیاد پر کیا تھا اور خود اس وحی کو ترک کر دیا تھا جو آپ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ اور جس سے اتباع پر آپ مامور تھے۔ سبحانک ھٰذا بہتان عظیم۔

رہا یہ امر کہ اگر آپ کو تورات کے مطابق فیصلہ نہیں کرنا تھا (اور نہ کیا ہی تھا) تو پھر تورات کیوں منگوائی؟ | پھر آپ نے تورات کو منگوایا کیوں تھا؟ تو اس کی کئی وجوہات تھیں۔

اولاً یہ کہ شرارت پسند اور دنی الطبع یہود پر فضیحت اور تبکیت کرنا مقصود تھا انہیں یہ بتاتے ہوئے کہ جس چیز کے کرنے پر وہ مامور کئے گئے تھے خود انہوں نے ہی اسے ترک کر دیا تھا، تاکہ کتاب اللہ کے ساتھ ان کے "اخلاص" کی حقیقت واضح ہو جائے۔

ثانیاً یہ کہ خود یہود بے بہبود پر بھی اور عامۃ الناس پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ جس کتاب کے متعلق نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَیْنَا (ہم تو صرف اپنے اوپر نازل شدہ کتاب پر ایمان رکھتے ہیں) کی گردان کرتے ہوئے وہ نہیں تھکتے تھے اس پر ان کے ایمان کی حقیقت کو کتاب اللہ کی عملاً پیروی و اطاعت کے آئینہ میں دکھا دیا جائے اور بتا دیا جائے کہ دعویٰ ایمان کے ساتھ ان کی عملی روش یہ ہے۔

ثالثاً یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر "مخالفتِ انبیاء" کا جو الزام یہود لگایا کرتے

تھے (بالخصوص تحویلِ قبلہ کے ضمن میں) اس کے متعلق یہ واضح کر دیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو خود صاحبِ شریعت نبی ہیں البتہ یہود جن انبیاء پر ایمان لا کر ان کی پیروی کے پابند ہیں وہ خود اپنے تقاضائے ایمان کو عملاً کس حد تک پورا کر رہے ہیں ایک طرف یہود کا تورات کو پڑھنا اور پڑھانا اور دوسری طرف اس کے احکام سے گریز کرنا ایک کھلا کھلا منافقانہ طرزِ عمل ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تورات منگوا کر ان سے پڑھوا کر ان پر واضح کر دیا۔

یہ تھیں وہ وجوہ جن کی بنیاد پر تورات کو منگوایا گیا۔

سچی بات یہ ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی جوڑے کو خود آپ پر نازل ہونے والی وحی کے اتباع میں نہیں بلکہ تورات کے اتباع میں سنگسار کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا وہ دراصل یہ کہتا ہے کہ ــــ "آپ نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے کہ جس وحی کی اتباع و پیروی آپ پر لازم تھی اسے آپ نے ترک کر دیا اور جس وحی (تورات) کی پیروی کے آپ مکلف نہیں تھے اور جو آپ پر نازل بھی نہیں ہوئی تھی اس کا اتباع کر ڈالا" ــــ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

یہ ستم ظریفی بھی قابلِ داد ہے کہ قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ یہود تورات کی تحریف کر ڈالتے ہیں اور ہمارے یہ مہربان قرآن کے اس بیان کے باوجود یہ شور مچائے جا رہے ہیں کہ آپؐ نے اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کو درخورِ اعتناء نہ سمجھتے ہوئے اس کتاب کے مطابق فیصلہ فرمایا جو محرف ہے۔ پھر بخدا! اس سے بھی بڑی جسارت یہ ہے کہ قرآن کے یہ "نادان دوست" جس بات کو بے دھڑک حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب فرما رہے ہیں خود اپنے آپ کو اس سے بالاتر قرار دیتے ہیں۔ اگر خود انہیں یہ کہا جائے کہ ــــ "قرآن کو چھوڑ کر کسی گذشتہ محرف کتاب کے مطابق فیصلہ فرما دیں" ــــ تو یہ لوگ اپنے دعویٰ ایمان کی لاج رکھتے ہوئے یہی فرمائیں گے کہ ــــ "ہم اپنے پیغمبر پر نازل ہونے والی کتاب کو ترک کر کے اور کسی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کریں گے" ــــ مگر نبیٔ صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کا تصور یہ ہے کہ آپؐ نے

اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کو ترک کر دیا تھا۔ اور مَا یُوحیٰ اِلَیْہِ (جو آپ کی طرف وحی کی گئی) کو چھوڑ کر مَا یُوحیٰ اِلیٰ غَیْرِہٖ (جو آپ کے علاوہ کسی اور کو وحی کی گئی) کے مطابق فیصلہ فرمایا تھا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے "فکرِ اسلامی" کے علمبرداروں کی متضاد روش کو بھی واضح کر دیا جائے۔

**ادارہ فکر اسلامی کی متضاد روش**

سوال یہ ہے کہ جن آسمانی کتابوں سے انبیائے سابقین کی شرائع کا علم حاصل ہوتا ہے وہ انسانی دست برد اور بشری تحریف و تغییر سے محفوظ ہیں یا نہیں؟ اگر محفوظ ہیں تو اولاً اس کی قرآنی دلیل کیا ہے؟ ثانیاً جب پہلی کتب صحیح و سالم اور محفوظ و مصئون ہیں تو نزول قرآن کیوں اور کس لئے؟ ــــــ اگر آپ کا جواب یہ ہے کہ سابقہ کتب تحریف و تبدل اور مسخ و تغیر کا شکار ہو چکی ہیں تو پھر انبیائے سابقین کا اتباع کیسے کیا جائے گا؟ ان سوالات سے تعرض فرماتے ہوئے "فکرِ اسلامی" کے علمبردار ارشاد فرماتے ہیں۔

> "ان انبیائے سابقین کی ہدایات ہمیں کہاں سے ملیں گی؟ کیا ان حضرات کی کتابیں اور صحیفے آج کہیں موجود ہیں؟ اگر موجود بھی ہیں؟ تو کیا وہ اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں؟ ان دونوں باتوں کا جواب نفی میں ہے ان کتابوں اور ان تمام سنتوں کی تصدیق اور ان کی پیروی کی تاکید قرآن کریم انہیں اپنے اندر محفوظ کر کے کرتا ہے (اس کے بعد آیت ۱۳؍۴۲ کو مع ترجمہ درج کر کے یہ فرمایا گیا ہے ــــــ قاسمی) لہٰذا وہ تمام ہدایات جو انبیاء سابقین کو عطا فرمائی گئی تھیں اور جن کی پیروی کی تاکید ہمیں فرمائی گئی ہے وہ سب قرآن کریم میں جمع کر دی گئی ہیں ان کا کہیں الگ وجود نہیں ہے۔"
>
> (تسہیل[1] برہان القرآن صفحہ ۱۲۸)

---

[1] "تسہیل برہان القرآن" پر کسی شخص کا نام بطور مصنف یا مؤلف درج نہیں ہے اس کے سرورق پر "از افادات، مفکر قرآن، مجدد عصر، حضرت خواجہ احمد امرتسری" کے الفاظ ثبت ہیں۔ خواجہ صاحب کا تعارف

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہے کہ ادارہ "فکر اسلامی" کے وابستگان کے نزدیک انبیائے سابقین کی اتباع کا واحد ذریعہ اب یہی ہے کہ قرآن کی پیروی کی جائے کیونکہ گذشتہ انبیاء کی تعلیمات اب قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں۔

یہاں قدرے توقف کیجئے اور سابقہ مباحث پر نگاہ ڈالئے جس میں یہ بات تفصیلاً بیان کی گئی ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اور صرف اس وحی کی اطاعت و پیروی کے پابند تھے جو آپ کی طرف نازل ہوتی تھی نہ کہ اس وحی کی جو انبیائے سابقین کو

---

"ابن قرآن سندھی" صاحب کے قلم سے ص۱۶ تا ص۹۱ تک محدود ہے۔ "مجدد عصر" کے ان افادات کو کتابی شکل کس نے دی؟ عمر احمد عثمانی صاحب نے یا کسی اور نے؟ کچھ پتہ نہیں۔ "ابن قرآن سندھی" طاہر المکی صاحب ہیں یا کوئی اور صاحب؟ کچھ علم نہیں۔ البتہ اس کتاب پر ناشر کا سرنامہ یوں درج ہے ـــــ "حفیظ برادران ۲۴۰ کاشانۂ حفیظ۔ گارڈن ایسٹ۔ کراچی ۳" ـــــ مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کی ہر کتاب جو مجھ تک پہنچی ہے (مثلاً فقہ القرآن اول تا چہارم اور رجم اصل حد ہے یا تعزیر) پر یہ ایڈریس مرقوم ہے ـــــ "ادارہ فکر اسلامی کاشانۂ حفیظ ۲۴۰۔ گارڈن ایسٹ ایسرداس سٹریٹ۔ کراچی ۳" ـــــ ناشر کے سرنامہ پر ایک [illegible] نظر بھی اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ "تسہیل برہان القرآن" کی نشر و اشاعت بھی وہیں سے ہوئی ہے جہاں سے مولانا عمر احمد عثمانی صاحب کے لٹریچر کی ہوئی ہے ـــــ سوال یہ ہے کہ عمر احمد عثمانی صاحب یا دیگر وابستگانِ "ادارہ فکر اسلامی" نے "تسہیل برہان القرآن" پر کسی کا نام بطور مصنف یا مؤلف درج کیوں نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب "تسہیل" اور "فقہ القرآن" کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے "تسہیل برہان القرآن" میں "فکر اسلامی" کے علمبرداروں نے واشگاف انداز میں اور کھلے لفظوں میں سنت نبوی کے مبنی بر وحی ماخذ قانون ہونے کا انکار کیا ہے جبکہ یہی "فکر اسلامی" کے علمبردار "فقہ القرآن" وغیرہ میں سنتِ نبوی کی دستوری اور آئینی حیثیت کا انکار کھل کر نہیں کرتے بلکہ بعض جگہ تو تقیہ کرتے ہوئے جناب عثمانی صاحب یہاں تک لکھ ڈالتے ہیں کہ ـــــ "دلائل شرعیہ کی ترتیب یوں ہے اول کتاب اللہ، دوم سنت رسول اللہ، سوم اجماع، چہارم قیاس" ـــــ (فقہ القرآن ج ۳ ص۲۲۰) "تسہیل برہان القرآن" کے علاوہ ادارہ "فکر اسلامی" کے باقی لٹریچر میں سنت نبوی کا کھلے بندوں انکار کرنے کی بجائے "درایت" کی آڑ میں انکار کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ہم "طلوع اسلام" کے بانی جناب غلام احمد پرویز صاحب کی قدر کرتے ہیں کہ وہ اول روز سے انکارِ حدیث کے مسلک پر کھلے بندوں قائم ہیں انہوں نے کہیں بھی دلائل شرعیہ میں (تقیہ کرتے ہوئے) سنتِ نبوی کو شامل نہیں کیا ان کے نزدیک صرف قرآن ہی مبنی بر وحی ماخذ قانون ہے اور بس۔ میں ذاتی طور پر مولانا عثمانی صاحب کی اس روشِ تقیہ کی نسبت جناب پرویز صاحب کی کھری اور بے لاگ روش انکار حدیث کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہوں اگرچہ تہذیبِ مغرب کی ذہنی مغلوبیت اور انکار حدیث میں دونوں ہی تشابہت قلوبھم کے روحانی رشتہ میں مربوط ہیں اور علمی طور پر میں دونوں کو غلط سمجھتا ہوں۔

عطا کی گئی تھی۔ یہ "وحی" (جس کی اتباع کی آپؐ اور آپ کی امت مکلف ہے) فقط قرآن ہی پر مشتمل ہے یا قرآن کریم کے علاوہ بھی آپ پر نازل ہوتی تھی؟ وحی خارج از قرآن بھی

"فکر اسلامی" اور "طلوع اسلام" کا موقف یہ ہے کہ خدائی وحی صرف قرآن میں منحصر ہے خارج از قرآن اس کا کہیں وجود نہیں ہے جبکہ جمیع علماء امت کے نزدیک خود قرآن کریم کی روشنی میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خارج از قرآن بھی وحی سے نوازا گیا ہے فریق اوّل ان آیات کی جو خارج از قرآن وحی پر دلالت کرتی ہیں ایسی تاویلات بیان کرتا ہے جس سے قرآن کے علاوہ کسی "وحی" کا اثبات نہ ہو پائے اس بحث میں ہم اس آیت کے مفہوم و مدلول کا جائزہ لے رہے ہیں جو تحویل قبلہ کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی آیت کے الفاظ یہ ہیں

| | |
|---|---|
| وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ (۲/۱۴۳) | جس قبلے پر آپ تھے اسے ہم نے محض اسی لئے تو بنایا تھا کہ یہ کھل جائے کہ کون رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ |

علماء امت کے نزدیک بنائے استدلال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے بیت المقدس کو خود حق تعالیٰ نے قبلہ قرار دیا تھا۔ (جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ) لیکن قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں ملتی جس میں یہ حکم موجود ہو کہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جائے اب چونکہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف فرمائی ہے اس لئے یہ واضح ہے کہ خدا کا یہ حکم اگر قرآن کے ذریعے نہیں دیا گیا تھا تو وحیٔ قرآن کے علاوہ کسی اور وحی کے ذریعے سے دیا گیا تھا علماء امت کے اس استدلال کے جواب میں ادارہ "فکر اسلامی" کے وابستگان فرماتے ہیں کہ

> "قبلے کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ قرآن کریم نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ جب تک کسی مسئلے کے متعلق قرآن کریم میں کوئی حکم نازل نہ ہو جائے اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم تھا کہ آپ پچھلی شریعتوں کی پیروی فرمائیں چنانچہ بہت سے حکموں میں آپ نے ملت ابراھیمی

کے تورات اور انجیل کے بعض احکام کی پیروی فرمائی ہے چنانچہ سورہ الانعام میں انبیائے سابقین ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، الیاس، عیسیٰ، اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم الصلوٰۃ والسلام کا نام بنام تذکرہ فرما کر آخر میں فرمایا کہ ـــــ یہ وہ حضرات ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی تھی تو اے پیغمبر! آپ بھی ان کی ہدایت کی پیروی فرمائیے ـــــ اس حکم کے مطابق بہت سے ان مسائل میں جن کے بارہ میں ابھی قرآن کریم میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا آپ پچھلی شریعتوں کے احکام پر عمل کرتے تھے ـــــ اسی طرح سورہ بقرہ کی وہ آیات جن سے مسجد حرام کو قبلہ بنانے کا حکم صادر فرمایا گیا ہے جب تک نازل نہیں ہوئیں (یہ آیات مدینہ منورہ جانے کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی تھیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کو بنی اسرائیل میں قبلہ کی حیثیت حاصل تھی۔"
(تسہیل برہان القرآن صـ۳۸۱)

اس توجیہہ پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

ا ـــــ اگر بیت المقدس کو قبلۂ اوّل گذشتہ شرائع کی پیروی میں بنایا گیا تھا تو گذشتہ شریعتوں کے حامل بعض پیغمبر مکے کے خانہ کعبہ ہی کو قبلہ قرار دیئے ہوئے تھے (مثلاً حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی اولاد) اور بعض بیت المقدس (جو یروشلم میں ہے) کو قبلہ بنائے ہوئے تھے (مثلاً حضرت سلیمان اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام)۔ اب سوال یہ ہے کہ ان مختلف انبیائے سابقین میں سے صرف ان انبیاء ہی کا اتباع کیوں اختیار کیا گیا جو مسجد اقصیٰ کو قبلہ قرار دیئے ہوئے تھے جبکہ ان گذشتہ پیغمبروں میں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام بھی شامل تھے جن کے ہاتھوں بیت اللہ کی دیواریں اٹھائی گئیں اور جن کے قبلے کی طرف مکہ میں منہ کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود نماز پڑھتے رہے ہیں اور جن کی پیروی کے لئے (انبیائے سابقین کی ہدایت کی عمومی اقتدار کے باوجود) خاص طور پر اِتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (آپ ملت ابراہیمی کی پیروی کریں) کے الفاظ

ہیں حکم دیا گیا؟ کیا انبیائے سابقین کے عموم میں سے ان انبیاء کی اتباع کو مخصوص کر لینے کی کوئی قرآنی دلیل ہے جو بیت المقدس کو قبلہ بنائے ہوئے تھے؟ هَاتُوا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۔

۲ ـــــــ انبیاء سابقین کی اتباع کا جو حکم (بقول علمبرداران "فکر اسلامی") قرآن میں دیا گیا ہے اس کے متعلق ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ

"وہ تمام ہدایات جو انبیائے سابقین کو عطا فرمائی گئی تھیں اور جن کی پیروی کی تاکید ہمیں فرمائی گئی ہے وہ سب قرآن کریم میں جمع کر دی گئی ہیں ان کا کہیں الگ وجود نہیں ہے۔" (تسہیل برہان القرآن ص۱۳۹)

لیکن دوسری طرف جب یہ کہا جاتا ہے کہ ــــ جب سابقہ شرائع قرآن ہی میں آگئی ہیں اور گزشتہ جملہ کتابوں اور انبیاء کی سنتوں کو قرآن نے خود اپنے اندر جمع اور محفوظ کر لیا ہے تو پھر بتائیے کہ بیت المقدس کن انبیائے سابقین کا قبلہ تھا جن کی اقتداء میں آپؐ نے قبلۂ ابراہیمی کو ترک کر کے مسجد اقصیٰ کو اپنا قبلہ بنایا؟ ــــ تو پھر قرآن کی بجائے تورات کی ورق گردانی شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر یہ مژدہ سنایا جاتا ہے کہ

"کتاب دانیال نبی باب ۶ درس ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت دانیال کا قبلہ بیت المقدس تھا۔" (تسہیل برہان القرآن ص۳۸۲)

"حضرت داؤد بھی جنہوں نے بیت المقدس کی بنیاد رکھی تھی اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے چنانچہ پانچویں زبور میں فرماتے ہیں ــــ خداوند خونی اور دغا باز آدمی سے نفرت کرتا ہے لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر آؤں گا اور تجھ ہی سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف منہ کر کے تجھے سجدہ کروں الخ۔" (تسہیل برہان القرآن ص۳۸۲)

قرآن کی بجائے یہ سب کچھ ان "کتب مقدسہ" سے اخذ کیا جاتا ہے جن کے بارے میں اسی کتاب میں پہلے یہ درج کر چکے ہیں کہ

"انبیائے سابقین کی ہدایات ہمیں کہاں سے ملیں گی؟ کیا ان حضرات کی

کتابیں اور صحیفے آج کہیں موجود ہیں؟ اگر موجود بھی ہیں تو وہ اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں؟ ان دونوں باتوں کا جواب نفی میں ہے۔"
(تسہیل برہان القرآن ص۱۳۸)

ع دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

اس تفصیلی بحث کی روشنی میں جس کا جی چاہے اب یہ مان لے کہ

۱۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حکم خداوندی کو (جو صرف اس وحی کے اتباع سے متعلق تھا جو ان کی طرف بھیجی جاتی تھی) پسِ پشت ڈال کر اپنے رب کی نافرمانی کرتے ہوئے "کتاب دانیال" اور "کتاب زبور" کی اطاعت میں بیت المقدس کو قبلہ بنا لیا تھا یا یہ مان لے کہ

۲۔ آپ نے قرآن کے علاوہ اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی کی پیروی میں بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا جس کی تصدیق خود قرآن نے بعد میں وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ ---- (ہم نے سابقہ قبلہ محض اس لئے بنایا تھا کہ جان لیا جائے کہ ----) کے الفاظ سے کر دی ہے۔

قُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ کہہ دیجئے کہ یہی ہے حق تمہارے رب کی طرف سے جو چاہے اسے مان لے اور جو چاہے انکار کر ڈالے۔ ($\frac{18}{29}$)

شرائع سابقہ کے متعلق ہماری یہ تفصیلی بحث اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ خود قرآن کریم کی رو سے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس وحی کی اتباع واطاعت پر مامور تھے جو خدا کی طرف سے آپ پر نازل ہوا کرتی تھی اس کے علاوہ آپ کسی اور وحی کی پیروی کے مجاز نہیں تھے اور یہی حال امت محمدیہ کا ہے۔

اتباعِ شرائع سابقہ کے بعد اب ہم محترم عثمانی صاحب کی دلیل کے دوسرے جزو **ملکہ سبا سربراہِ مملکت** کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے۔

"قرآن کی نگاہ میں ملکہ سبا کا سربراہِ مملکت ہونا صحیح ہے کیونکہ قرآن نے

اس واقعہ کو بغیر کسی نکیر کے پیش کیا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۶۴)

۱ ـــــ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی (بلکہ ہر مصنف، نقاد، ادیب اور شاعر کی) یہ عادت ہے کہ وہ کسی کے تمام عیوب و نقائص کو بیان کرنے کی بجائے صرف ان رذائل کا ذکر کرتا ہے جو اعتقادی یا اخلاقی طور پر اقبح یا اشنع ہوں قرآن کی نگاہ میں کفر و شرک سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں اس عیب، جرم یا ظلم کے مقابلے میں وہ باقی نقائص و رذائل اور جرائم و مظالم کو ہلکا سمجھتا ہے اس لئے قرآن نے اگر ملکۂ سبام کے کفر و شرک کی مذمت و نکیر فرمائی ہے اور اس سے کمتر عیوب و نقائص کی نکیر نہیں فرمائی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ شرک سے ہلکے اور کمتر رذائل کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔

۲ ـــــ دوسری بات یہاں یہ قابلِ غور ہے کہ عثمانی صاحب نے عورت کے لئے سربراہی مملکت کی دلیل کشید کرتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ ملکہ بلقیس کا یہ واقعہ اُس دور جاہلیت سے تعلق رکھتا ہے جب وہ ہنوز مسلمان نہیں ہوئی تھی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی وہ سربراہِ مملکت کے منصب پر حسب سابق برقرار رہی یا کہ نہیں؟ قرآن اس بارے میں ایک لفظ بھی بیان نہیں کرتا بلکہ قرآن تو یہ بھی نہیں بتاتا کہ ملکہ بلقیس آیا اپنے ملک کو واپس لوٹ بھی گئی؟ ہر شخص قرآن کھول کر خود دیکھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملکہ سبا کی کتاب حیات کا صرف وہی ورق پیش کیا ہے جس میں حالت کفر و شرک سے نکل کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں پہنچ کر ان کے اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے قبولِ اسلام کے بعد ان کے متعلق قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُنہیں واپس ہی بھیج دیا ہو کجا یہ کہ وہ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے واپس گئی ہوں لہٰذا یہ کہنا کہ

"ان کے ایمان لانے کے بعد حضرت سلیمان نے انہیں معزول کر کے تخت و تاج سے محروم نہیں کر دیا بلکہ انہیں ان کے منصب پر قائم اور باقی رکھا۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۶۴)

قرآن کے منہ میں اپنی طرف سے من گھڑت بات ڈالنا ہے بعد اس کے کہ قرآن (ملکہ سبام کے قبولِ اسلام کے واقعہ کو بیان کر کے) خاموش ہو جاتا ہے اور بعد کے واقعات کو بیان کرنے

کی بجائے مکمل سکوت اختیار کرتا ہے۔

ہمارے لئے یہ حیرت ہی کا نہیں بلکہ دکھ اور افسوس کا بھی مقام ہے کہ بعض لوگ تہذیب مغرب کی ذہنی غلامی کا شکار ہو کر کس طرح قرآن کو موم کی ناک بنا کر موڑ رہے ہیں اور قرآن سے ہدایت لینے کی بجائے "عصری تقاضوں" کے تحت الٹا اسے ہدایت دینے پہ اتر آئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ "قرآن، قرآن" کی رٹ بھی لگائے جا رہے ہیں قرآن کے الفاظ سے ــــ (نہیں بلکہ مفہومِ قرآن میں اپنی طرف سے اضافہ کر ڈالنے کے بعد)۔ قرآن کی روح کے خلاف قوانین کشید کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کا اصل ایمان واعتقاد قرآن مجید کے قوانین وضوابط پہ نہیں بلکہ مغربی تہذیب کے اصول ومبادیات پہ ہے اور قرآن کے ساتھ یہ سلوک صرف اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ اسلام کی مرمت فرما کر اسے جدید ( ) بناتے ہوئے "عصری تقاضوں" سے ہم آہنگ کر دیا جائے ورنہ اسلام "آثار قدیمہ" کی ایک "نشانی" بن کر رہ جاتا ہے

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

۳ ــــ تیسری بات یہاں یہ غور طلب ہے کہ بر سبیل تنزل اگر قرآن نے ملکۂ سبا کے قبول اسلام کے بعد اس کا سربراہ مملکت کے منصب پر برقرار رہنا بیان بھی کر دیا ہوتا تب بھی امت محمدیہ کے لئے اس میں کوئی دلیل نہیں تھی کیونکہ ہمارے لئے واجب الاطاعت صرف وہ شریعت ہے جو وحی کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہ نازل ہوئی نہ کہ گزشتہ انبیاء کی شرائع اس اصل پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے یہ ہے وہ قرآنی دلیل جس کی بنیاد پر محترم عثمانی

**عثمانی صاحب کی دوسری دلیل سربراہئ نسواں** | صاحب نے عورت کی سربراہی کی عمارت استدلال قائم فرمائی ہے اس سلسلے میں ان کی دوسری قرآنی دلیل بھی ملاحظہ فرمائیے وہ سورہ توبہ کی آیت ۷۱ کو نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ ــــ (۹/۷۱)

مومن مرد اور مومن خواتین ایک دوسرے کے ولی ومددگار ہیں وہ معروف کا حکم دیتے ہیں ــــ

بنائے استدلال یہ ہے کہ "یامرون بالمعروف" میں فعلِ "امر" کو مومن مردوں اور عورتوں دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے چونکہ "امر" کا معنیٰ اختیار و اقتدار بھی ہے جیسا کہ قرآن میں "اولی الامر منکم" کے الفاظ سے ظاہر ہے اس لئے امر بالمعروف میں اقتدار و اختیار پاکر خواتین و حضرات کا اس فریضے کو سرانجام دینا دونوں اصناف بشر کے حاکم و فرمانروا ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ہے محترم عثمانی صاحب کا خلاصۂ دلیل (پرویز صاحب بھی یہی دلیل دیا کرتے ہیں)۔

"امر" کا مفہوم

اس میں کوئی شک نہیں کہ "امر" کا معنیٰ اختیار و اقتدار بھی ہوتا ہے مگر یہ لفظ صرف اسی مفہوم پر منحصر نہیں ہے خود قرآن پاک میں یہ لفظ "اقتدار و اختیار" کے علاوہ دیگر معانی کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے ذیل میں ان آیات کو درج کیا جاتا ہے جن میں یہی لفظ "اختیار و اقتدار" کے علاوہ دیگر مفاہیم کے لئے استعمال ہوا ہے۔

۱ــــ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۲/۱۱۷) — وہ کسی کام کے کرنے کو طے کر لیتا ہے تو کہتا ہے "ہوجا" اور وہ ہوجاتا ہے۔

۲ــــ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ اِلَيْكُمْ (۶۵/۵) — یہ اللہ کا حکم (فرمان) ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے۔

۳ــــ اِنَّمَا اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۶/۱۵۹) — ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے وہی انہیں بتائے گا جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

۴ــــ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ (۱۲/۴۱) — فیصلہ ہوگیا اس بات کا جو تم دونوں پوچھ رہے تھے۔

۵ــــ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۷/۱۱۰، ۲۶/۳۵) — اب تم کیا رائے و مشورہ دیتے ہو۔

۶ــــ اِذَا كَانُوْا عَلٰى اَمْرٍ جَامِعٍ (۲۴/۶۲) — جب وہ کسی امر اجتماعی (اجتماعی کام) پر مل کر موجود ہوں۔

۷ــــ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (۸/۴۲) — تاکہ جس بات کا اللہ فیصلہ کر چکا ہے اسے ظہور میں لے آئے۔

۸۔۔۔ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ (۱۶/۳۳) — یا تیرے رب کا فیصلہ صادر ہو جائے۔

۹۔۔۔ وَمَا اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ (۱۶/۷۷) — وقوعِ قیامت کا معاملہ تو پلک جھپکنے کا وقت ہی لے گا۔

۱۰۔۔۔ اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (۱۶/۱) — آگیا اللہ کا فیصلہ اب تم اس کے لئے جلدی نہ مچاؤ۔

ان دس آیات میں لفظ "امر" کام، معاملہ، حالت، فیصلہ، حکم، فرمان اور بات کے معنوں میں استعمال ہوا ہے "امر" اگر فعل کی صورت میں استعمال ہو تو اس کا معنیٰ محض "حکم دینا" ہوتا ہے قطع نظر اس سے کہ حکم دینے والا صاحبِ اقتدار ہو یا محرومِ اختیار ہو مندرجہ ذیل آیات میں لفظ "امر" بمعنیٰ "حکم دینا" استعمال ہوا مگر اس کی پشت پر دنیاوی اقتدار و تسلط موجود نہیں ہے۔

۱۔۔۔ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ (۲/۱۶۹) — بیشک شیطان تمہیں برائی اور بیحیائی کا حکم دیتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ شیطان کی پشت پر کوئی دنیاوی اقتدار موجود نہیں ہے۔

۲۔۔۔ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ (۲/۹۳) — تمہارا ایمان کس قدر بری بات کا تمہیں حکم دیتا ہے۔

۳۔۔۔ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ (۵۲/۳۲) — کیا ان کی عقلیں انہیں یہی سمجھاتی ہیں؟

۴۔۔۔ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ.... (۱۱/۸۷) — کیا تیری نماز تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ.....

ان آیات سے یہ بات واضح ہے کہ اقتدار کے بغیر کوئی ترغیب، نصیحت، رائے، اکساہٹ (PERSUATION) اور مشورہ دینے پر بھی "امر" کا اطلاق ہوتا ہے لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ لازماً قوت اقتدار پا کر ہی سرانجام دیا جا سکتا ہے کہ اختیار و اقتدار کے بغیر یہ چیز ناممکن قرار پائے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اقتدار و فرمانروائی مدینے

میں میسر آئی تھی مگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض آپ مکہ میں بھی بغیر اقتدار کے ادا فرماتے رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات جو ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھیں وہ اس حقیقت پر شاہد عدل ہیں۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ (۷/۱۹۹) | اے نبی نرمی و درگزر سے کام لو اور نیکی کی تلقین کئے جاؤ۔ |
| ۲۔ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷/۱۵۷) | رسولؐ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے۔ |
| ۳۔ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا (۲۵/۶۰) | کیا بس جسے تو کہہ دے اسی کو ہم سجدہ کرتے پھریں۔ |
| ۴۔ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ (۹۶/۱۲) | یا وہ (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) تقویٰ کا حکم دے۔ |

یہ چاروں آیات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اُس مساعی کا حال بیان کر رہی ہیں جو آپؐ نے مکی دَور میں محرومِ اقتدار ہو کر سرانجام دی تھی کیونکہ یہ چاروں آیات مکی دَور ہی میں نازل ہوئی تھیں۔

اس بحث سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کسی شخص کا صاحبِ اقتدار ہونا ضروری نہیں ہے اگر حکومت و ریاست کی قوت ہاتھ میں نہ ہو تو بھی اس فریضے کو انجام دیا جا سکتا ہے اور اگر یہ قوت حاصل ہو جائے تب بھی۔ لہٰذا سورہ توبہ کی زیرِ بحث آیت میں "امر" سے مراد اقتدار و اختیار لینا اور پھر یہ طے کر لینا کہ "امر بالمعروف" کا فریضہ صرف عندالاقتدار ہی انجام دیا جاتا ہے بنیادی طور پر غلط بات ہے کجا یہ کہ اس کی بنیاد پر خواتین کو سربراہِ مملکت بنایا جائے۔ مرد اپنے دائرہ کار میں امر بالمعروف کا فریضہ سرانجام دیں گے اور خواتین اپنے دائرۂ عمل میں دونوں کا دائرۂ کار مختلف ہے خود عثمانی صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ خواتین کا دائرۂ عمل گھر تک محدود ہے کیونکہ انہیں فطرت کی طرف سے وہی صلاحیتیں میسر ہوئی ہیں جو امورِ خانہ اور پرورشِ اطفال اور تربیتِ صبیان کے لئے ضروری ہیں۔ ریاست و سیاست اور حکومت و فرمانروائی ان کے دائرۂ کار ہی سے باہر ہے جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو پھر محض لفظ "امر" کی بنیاد پر

مردوں کے ساتھ خواتین کو شریکِ اقتدار کرنا ایک بیجا قسم کی سخن سازی ہے جس کا محرک وہی مغرب پرستی ہے جو متجددینِ دورِ حاضر کو "قرآن" کے نام پر مکے کی بجائے ترکستان بلکہ "انگلستان" لئے جا رہی ہے۔

ممکن ہے کہ جناب عثمانی صاحب یہ فرمائیں کہ ـــــ "آیت زیر بحث میں مرد و زن دونوں کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے اس لئے خواہ اقتدار و اختیار میسر ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں خواتین حضرات "شانہ بشانہ" شریکِ امر بالمعروف ہوں گے اگر اقتدار و حکومت کے بغیر یہ فریضہ تنہا مردوں پر عائد نہیں ہوتا تو اس قوت کی موجودگی میں بھی اسے (عورتوں پر سے ساقط کر کے) محض مردوں تک محدود نہیں رکھا جا سکتا" ـــــ تو یہ ایک سطحی مغالطہ ہے جو اسلامی معاشرت کو نگاہ میں نہ رکھتے ہوئے اور مغربی مخلوط معاشرت کو دیکھتے ہوئے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں جہاں تک امر بالمعروف کا تعلق ہے اپنے اپنے دائرۂ کار میں ہر صنف بشر اس فریضے کو انجام دے گی مگر اقتدار و حکومت کے معاملات چونکہ عورت کے دائرۂ کار سے خارج ہیں اس لئے انہیں صرف مرد ہی سرانجام دے گا۔ رہا یہ معاملہ کہ آیت میں اگر دونوں اصنافِ بشر کا یکساں ذکر ہے تو اقتدار و اختیار کی صورت میں دونوں کی پوزیشن یکساں کیوں نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حلقِ رأس اور لباسِ احرام کے قرآنی احکام دونوں اصناف کے لئے عام ہونے کے باوجود اپنی ہیئت وصورت میں ہر دو صنف انسان کے لئے مختلف ہیں اسی طرح یہاں بھی خواتین وحضرات کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام یکساں ہونے کے باوجود اپنی نوعیت ادائیگی میں مختلف ہیں۔ مرد حضرات مناصب اقتدار پر بیٹھ کر نیز بیرون در و اندرون در ہر مقام پر حسبِ استطاعت یہ فریضہ ادا کریں گے اور خواتین اپنے محاذ و مستقر پر رہ کر اس فریضے کو سرانجام دیں گی۔

یہ ہیں محترم عثمانی صاحب کے وہ "قرآنی دلائل" جو وہ عورت کی سربراہیٔ مملکت کے عدم سربراہی نسواں پر قرآنی دلیل حق میں پیش فرماتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم ایک ایسی دلیل پیش کر رہے ہیں جو ان کے موقف کی تردید پر نصِ قاطع ہے قرآن یہ بیان کرتا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ۔ مرد عورتوں پر سربراہ اور کارفرما ہیں۔

۔۔۔۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (۴:۳۴) ۔۔۔ پس نیک عورتیں اطاعت شعار ہیں۔

قرآن کی یہ آیت مرد کو قوامیت (سربراہی) کے مقام پر رکھ رہی ہے اور عورت کو قنوت (اطاعت و فرمانبرداری) کے مقام پر۔ "قوام" کا معنیٰ خود محترم عثمانی صاحب نے "سربراہ" اور "کارفرما" لکھا ہے۔

"ترجمہ: مرد عورتوں کے سربراہ اور کارفرما ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۶۵)

یہاں قرآن نے مردوں کو عورتوں پر مطلق "سربراہ" اور "کارفرما" کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس اطلاق کا یہ تقاضا ہے کہ مردوں کی سربراہانہ اور کارفرمایانہ حیثیت کو ہر شعبۂ حیات میں برقرار رکھا جائے بعض لوگ اسے گھر کی زندگی تک محدود رکھتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ ـــــ گھر کی زندگی کی حد تک مرد عورتوں پر قوام ہیں ـــــ یہ درست نہیں ہے کیونکہ اس سے دامن مفہوم کی وسعت میں تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی قرآن نے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (مرد عورتوں پر سربراہ اور کارفرما ہیں) کہا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ فِی الْبُیُوْتِ (مرد گھروں کے اندر عورتوں پر سربراہ اور کارفرما ہیں) نہیں کہا ہے تاہم اسے اگر عائلی زندگی تک ہی محدود رکھا جائے تب بھی خواتین کے لئے سربراہی مملکت کا عدم جواز ہی اس سے نکلتا ہے جناب عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"اسلام نے جو ایک فطری مذہب ہے مرد ہی کو گھر کا سربراہ مقرر کیا ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۳۸۲)

اب یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک گھر کے اندر تو اسلام (جو ایک فطری مذہب ہے) عورت کو سربراہ نہیں بناتا (بلکہ مرد کو سربراہ بناتا ہے) مگر ایک ریاست میں (جو ہزاروں لاکھوں گھروں پر مشتمل ہوتی ہے) وہ مرد کو قوامیت کے مقام سے نیچے اتار دیتا ہے اور عورت کو قنوت کے مقام سے اٹھا کر قوامیت (سربراہی و کارفرمائی) کے مقام تک پہنچا دیتا ہے اور یوں اب وہی اسلام جو خانگی تنظیم میں تو "فطری دین" کا کردار ادا کرتا ہے ملکی تنظیم میں "غیر فطری دین" کا رول پیش کرتا ہے فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَکَادُوْنَ

يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا۔

یہ تو رہی قرآنی دلیل جو عورت کی سربراہیِ مملکت کے خلاف ہے اب ایک عملی تجربہ

ایک عملی تجربہ | بھی ملاحظہ فرمائیے مصر میں عورتوں کو سربراہِ مملکت تو نہیں بنایا گیا البتہ انہیں بڑے بڑے عہدوں پر ضرور فائز کیا گیا جس کے دو ایسے منفی نتائج ظاہر ہوئے جو دیدۂ بینا کے لئے درسِ عبرت ہیں۔

اولاً یہ کہ عورتوں کی کارکردگی مردوں کے مقابلے میں بہت کمتر رہی ظاہر ہے کہ مرد جس قدر بھاگ دوڑ کر سکتے ہیں خواتین نہیں کر سکتیں۔

ثانیاً یہ کہ عورتوں کے پاس جا کر مملکت کا کوئی راز راز ہی نہیں رہتا مملکت کے بڑے حساس نوعیت کے راز افشاء ہوئے جس کا فائدہ اسرائیل جیسی بدترین ریاست کو پہنچا۔

(بحوالہ اسلامی ریاست مولانا مودودی صاحب ص۵۱۶)

ہرچند کہ ہم نے اس پوری کتاب کے مواد کو قرآن کریم ہی کی بنیاد پر مرتب کرنے کا تہیہ

روایتِ بخاری پر بحث | کر رکھا ہے مگر ہم بخاری کی اس روایت کو زیرِ بحث لائے بغیر نہیں رہ سکتے جسے محترم عثمانی صاحب نے اپنی جولانیٔ طبع کا نشانہ بنائے رکھا۔

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ لَقَدْ نَفَعَنِیَ اللّٰہُ بِکَلِمَۃٍ اَیَّامَ الْجَمَلِ لَمَّا بَلَغَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ فَارِسًا مَلَکُوا ابْنَۃَ کِسْرٰی قَالَ، لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَاَۃً۔

(بخاری۔ کتاب الفتن)

حضرت ابوبکرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ نے ایامِ جنگ جمل میں مجھے ایک بات سے بہت فائدہ پہنچایا (وہ بات یہ تھی) کہ جب رسول اللہ کو یہ خبر پہنچی کہ اہل ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو امورِ سلطنت سونپ دیئے ہیں تو حضورؐ نے فرمایا "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنا اقتدار عورت کو سونپ دیا ہو۔"

محترم عثمانی صاحب اس حدیث پر (جو صحیح صریح اور مرفوع ہے) ارشاد فرماتے ہیں کہ

ا۔۔۔ "یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قیادت کو کمزور کرنے کے لئے

بعد میں گھڑی گئی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۶)

۲۔ "جس نے یہ روایت گھڑی ہے اس نے نہ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پوزیشن ہی کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ پر بھی بہت بڑا اتہام لگایا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۶)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ پر کون سا اتہام لگایا گیا ہے؟ اس کی بحث تو خیر آگے آرہی ہے فی الحال یہ ملاحظہ فرمائیے کہ اس صحیح اور صریح حدیث کو وضعی اور غلط روایت قرار دینے کے لئے موصوف محترم کی رگ ِدرایت جو پھڑکی ہے تو انہوں نے اس کی تغلیط و تکذیب کے لئے

**روایت پر پہلا اعتراض** دلائل کیا بیان فرمائے ہیں ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ

"اس حدیث کا اس وقت تک کوئی پتہ نہیں تھا جب تک جنگِ جمل واقع نہیں ہوئی حضرت ابوبکرہ کو بھی حسب بیان حدیث یہ حدیث اس وقت یاد آئی جب حضرت علی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فوج کی کمان سنبھال لی اس واقعہ سے پہلے انہیں بھی یہ حدیث یاد نہیں آئی۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۶)

محترم عثمانی صاحب نے "حسب بیانِ حدیث" کے الفاظ میں جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا حوالہ انہوں نے نہیں دیا۔ ہم نے اپنی سی کوشش کر دیکھی ہے مگر ہمیں ایسی کوئی حدیث نہیں ملی جس میں یہ مذکور ہو کہ "حضرت علی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان جنگ چھڑنے سے پہلے اور موخر الذکر کے کمان سنبھال لینے سے قبل یہ حدیث ابوبکرہ کو مستحضر نہ تھی اور اس کا استحضار عین اس وقت ہوا جب جنگ جمل کے شروع ہونے سے قبل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فوج کی کمان سنبھال چکی تھیں" ۔۔۔ ہم نے مسند احمد بن حنبل جلد پنجم میں ص ۳۵ تا ص ۵۲ تک حضرت ابوبکرہ کی روایات کا مطالعہ کیا ہے ہمیں کوئی ایسی روایت نہ مل پائی جس میں وہ کچھ مذکور ہو جو جناب عثمانی صاحب ارشاد فرما رہے ہیں[1]۔ جو روایت خود

---

[1] بلکہ ایسی روایات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ابوبکرہ کو یہ فرمان نبوی اس وقت بھی یاد تھا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قبل از جنگ لوگوں کو اپنی حمایت میں جمع کرنے میں کوشاں تھیں حوالہ آگے آرہا ہے۔

انہوں نے پیش کی ہے اس میں بھی یہ بات موجود نہیں روایت کا وہ ترجمہ ملاحظہ فرمائیے جو خود جناب عثمانی صاحب نے پیش فرمایا ہے۔

"حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے مجھے جنگ جمل کے ایام میں ایک بات سے مجھے بہت نفع پہنچایا (وہ بات یہ تھی کہ) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ اہلِ ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنی ملکہ بنالیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنے معاملات کا اختیار ایک عورت کے سپرد کر دیا ہو" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۸)

محترم عثمانی صاحب کا یہ ترجمہ خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں سرے سے وہ بات ہے ہی نہیں جسے وہ بیان فرما رہے ہیں۔

روایت زیر بحث کو وضعی اور ساقط الاعتبار ثابت کرنے کے لئے محترم عثمانی صاحب

**دوسرا اعتراض** نے دوسری دلیل ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

"اس حدیث کے موضوع اور من گھڑت ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق تمام محدثین اور مورخین اس پر متفق ہیں کہ وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۹)

حدیث زیر بحث کے الفاظ اس بات کو قطعی واضح کر دیتے ہیں کہ حضرت ابوبکرہؓ کے جنگِ جمل میں حصہ لینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مانع تھا کہ ـــــ "وہ قوم فلاح نہیں پاسکتی جن کے امورِ سلطنت عورت کے سپرد کئے گئے ہوں" ـــــ اس فرمانِ نبویؐ کا انہیں یہ فائدہ پہنچا کہ مسلمانوں کے اس فتنۂ قتالِ باہمی میں حضرت علی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما میں سے کسی کا بھی عملاً ساتھ نہیں دیا البتہ وہ اصلاح بین الناس اور قصاصِ عثمانؓ کے معاملے میں حضرت اُمّ المومنینؓ سے متفق تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس رائے کے خلاف تو حضرت علیؓ بھی نہیں تھے انہیں بھی قصاصِ عثمانؓ کے مطالبے کی معقولیت سے انکار نہیں تھا ان کا عذر صرف یہ تھا کہ اس بدامنی اور انتشار تفری کی حالت میں قصاص لینا ممکن

نہیں ہے پہلے امر خلافت کو مستحکم کر لیا جائے پھر قاتلینِ عثمان سے قصاص بھی لیا جائے گا خود محترم عثمانی صاحب اس حقیقت کے معترف ہیں۔

"ایک طرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک جم غفیر قصاص کا مطالبہ کر رہا ہے اور دوسری طرف حضرت علی اور ان کے تمام ہمنوا صحابہ اس مطالبہ کو صحیح مان کر عذر یہ پیش کر رہے ہیں کہ ابھی خلافت مستحکم نہیں ہوئی باغیوں کا زور ہے ہم قصاص نہیں لے سکتے جونہی حالات درست ہوں گے اور ہمیں قصاص لینے کی قدرت حاصل ہو جائے گی ہم ضرور قصاص لیں گے لیکن امن و امان قائم ہو جانے کا انتظار فرمائیے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۱۱)

**ایک سفید جھوٹ**

رہا محترم عثمانی صاحب کا یہ دعویٰ کہ ــــ "تمام محدثین و مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا" ــــ تو یہ ایک ایسا کذبِ خالص ہے جس میں صداقت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ تمام محدثین و مؤرخین کا نام لے کر اتنا بڑا جھوٹ بولتے ہوئے ہمیں یقین ہے کہ خدا کا خوف اور آخرت میں جوابدہی کا احساس جناب عثمانی صاحب کے قریب بھی نہیں پھٹکا ہو گا۔

جہاں تک محدثین و مؤرخین کا تعلق ہے ہم بلا خوف تردید یہ کہتے ہیں کہ ایک بھی محدث، مورخ، عالم اور فقیہ آج تک ایسا نہیں گزرا جس نے یہ کہا ہو کہ ــــ "حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ جنگ جَمَل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی حمایت میں شریکِ حرب و قتال تھے" ــــ ایک مقام پر محترم عثمانی صاحب حقائق کو مسخ کرتے ہوئے خدع و فریب کے ہتھیاروں کو استعمال کرتے ہوئے ایک صورت واقعہ کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ

"یہ یاد آجانے کے بعد بھی حسب تصریح ابن بطال وہ آخر دم تک حضرت عائشہ کی رائے پر قائم رہے۔ انہوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں فرمایا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت پر بھی آمادہ نہ ہو سکے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۸)

ابن بطال نے یہ تصریح کہاں کی ہے؟ محترم عثمانی صاحب نے کوئی حوالہ نہیں دیا تاکہ کوئی شخص اصل مأخذ تک رسائی پاکر اصل حقیقت سے واقف نہ ہو جائے۔ ابن بطال سے جو کچھ فتح الباری میں مرقوم ہے اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ خونِ عثمانؓ کے مطالبۂ قصاص میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہم خیال ہونے کے باوجود جناب ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ شریک جنگ نہیں تھے وہ مسلمانوں کے باہمی حرب و قتال کے اس فتنے سے کلی طور پر محترز رہے اور فریقین میں سے کسی کا بھی جنگ میں عملاً ساتھ نہیں دیا۔ ابن بطال کا فتح الباری میں جو طویل اقتباس موجود ہے وہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی جنگ جمل سے مکمل علیحدگی پر دلالت کرتا ہے اس اقتباس کا آخری حصہ اس حقیقت کو واشگاف کر دیتا ہے۔

**تصریح ابن بطال**

"ونقل ابن بطال عن المهلب ....... وانما انكرت هي ومن معها على علي منعه من قتل قتلة عثمان وترك اقتصاص منهم وكان علي ينتظر من اولياء عثمان ان يتحاكموا اليه فاذا ثبت على احد بعينه انه ممن قتل عثمان اقتص منه فاختلفوا بحسب ذلك وخشي من نسب اليهم القتل ان يصطلحوا على قتلهم فانشبوا الحرب بينهم الى ان كان ما كان فلما انتصر علي عليهم حمد ابوبكرة رأيه في ترك القتال معهم وان كان رايه كان موافقا لرأي عائشة في الطلب بدم عثمان۔ انتهى كلامه۔ ترجمہ: ابن بطال نے مہلب سے نقل کیا ہے ......... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتلین عثمان کو قتل نہ کرنے اور قصاص ترک کرنے پر ناگواری کا اظہار کیا جبکہ حضرت علی اس بات کے منتظر تھے کہ اولیاءِ عثمان خود مقدمہ لے کر ان کے پاس آئیں اور جب کسی کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ وہ قاتلین عثمان میں سے تھا تو اس سے قصاص لیا جائے اس پر لوگوں میں اختلاف

ہو گیا۔ جن بلوائیوں کی طرف قتلِ عثمان کے فعل کو منسوب کیا جاتا تھا انہیں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ فریقین کی صلح کا مطلب (قصاص عثمان میں) خود ان کا اپنا قتل ہو جانا ہے، اس لئے انہوں نے فریقینؓ میں باہم جنگ چھیڑ دی پھر جو ہوا سو ہوا جب حضرت علیؓ نے اپنے مخالفین پر غلبہ پایا تو حضرت ابوبکرہؓ نے ترکِ قتال کی اپنی رائے پر حمد کی اگرچہ وہ خون عثمان کے مطالبے میں حضرت عائشہؓ کے ہم خیال تھے۔" (فتح الباری ج ۱۳ ص۵۶)

فتح الباری میں ابن بطال کا یہ اقتباس آفتاب نیمروز کی طرح اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ باوجودیکہ **ابوبکرہ کا جنگ سے رکنا اور روکنا** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی (اصلاح بین الناس اور مطالبۂ قصاص عثمان کی) رائے سے اتفاق کرتے تھے لیکن وہ جمل کے میدانِ حرب وقتال سے الگ رہے انہوں نے کسی فریق کی حمایت میں بھی ضرب سیف سے کام نہیں لیا بلکہ وہ خود دیگر لوگوں کو بھی مسلمانوں کی اس باہمی خانہ جنگی کے فتنے سے روکا کرتے تھے بخاری (اور مسلم) میں یہ مذکور ہے کہ جنگِ جمل کے دنوں میں:

"حضرت ابوبکرہ گھر سے نکلے تو احنف بن قیس کو ہتھیار بند جاتے ہوئے دیکھا پوچھا "کہاں کے ارادے ہیں؟" جواب دیا "ابن عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وحمایت کے لئے جا رہا ہوں" حضرت ابوبکرہ نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جب دو مسلمان تلوار لے کر ایک دوسرے کے مدمقابل ہو جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں۔" (بخاری، کتاب الایمان، کتاب الفتن۔ فتح الباری ج ۱۳ ص۵۶)

الغرض ابن بطال کی مہلب سے نقل کردہ تصریح اور احنف بن قیس کو باہمی قتال سے روکنے والا یہ واقعہ دونوں اس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں کہ "حسب تصریح ابن بطال، حضرت ابوبکرہ کی حضرت عائشہ کی رائے سے موافقت کا مطلب صرف یہ ہے کہ دونوں واجب الاحترام ہستیاں قصاصِ عثمانؓ اور اصلاح بین الناس کے معاملہ میں ہمرائے تھیں اس موافقتِ رائے

کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت ابوبکرہؓ، حضرت عائشہؓ کی حمایت میں حضرت علیؓ کے خلاف شریکِ جنگ تھے ایسا مطلب نکالنا حقائق کو مسخ کرنا ہے۔

پھر یہ بھی کیا عجیب بات ہے کہ "فتح الباری" کا نام لئے بغیر جہاں سے محترم عثمانی صاحب نے ابوبکرہؓ کو قبل از قتال ارشاد نبویؐ کا مستحضر ہونا ابن بطال کی تصریح کو لے کر اسے اپنے من مانے مفہوم کا لبادہ اوڑھا کر پیش کیا ہے وہیں پر یہ عبارت بھی موجود ہے کہ

"اخرج عمر بن شبة من طريق مبارك بن فضالة عن الحسن ان عائشة ارسلت الى ابى بكرة فقال: إِنَّكِ لَأُمٌّ وَإِنَّ حَقَّكِ لَعَظِيمٌ ولكن سمعت رسول الله يقول، لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ تَمْلِكُهُمْ اِمْرَأَةٌ" (فتح الباری ج ۱۳ ص ۵۶) "عمر بن شبہ نے مبارک بن فضالہ کے واسطے سے حسن سے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جناب ابوبکرہ کو (اپنی حمایت میں اور مخالفت علیؓ میں حصہ لینے کے لئے) پیغام بھیجا تو ابوبکرہ نے جواب دیا کہ "بیشک آپ ماں ہیں اور ماں کی حیثیت سے آپ کا بہت بڑا حق ہے لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس کی فرمانروا عورت ہو"۔

ابن حجر کی نقل کردہ یہ روایت اس امر کو غیر مبہم انداز میں واضح کر دیتی ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ نے حضرت عائشہؓ کی معیت میں حضرت علی کے خلاف قطعاً جنگ میں حصہ نہیں لیا بلکہ آغازِ جنگ سے بہت پہلے جبکہ حضرت عائشہؓ ابھی لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے پیغام رسانی ہی کر رہی تھیں جناب ابوبکرہ نے ان کے پیغام کے جواب میں وہ فرمانِ نبوی پیش کر دیا تھا جس کے متعلق عثمانی صاحب یہ بلند بانگ دعویٰ فرما رہے ہے کہ

"حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث اس وقت یاد آئی جب حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فوج کی کمان سنبھال لی اس واقعہ سے پہلے انہیں بھی یہ حدیث یاد نہیں آئی"۔ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۶)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ صرف مطالبۂ قصاصِ عثمان اور اصلاح بین الناس کی حد تک حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا سے متفق تھے مگر عملاً وہ مسلمانوں کی اس باہمی جنگ سے کنارہ کش رہے لیکن عثمانی صاحب اس "اتفاقِ رائے" میں پہلے یہ خودساختہ مفہوم و معنیٰ پیدا کرتے ہیں کہ جناب ابوبکرہ حضرت علیؓ کے خلاف حضرت عائشہؓ کی معیت میں برسرِ جنگ تھے اور پھر "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کے مصداق یہ فرماتے ہیں کہ

"سوال یہ ہے کہ اس قول نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یاد آجانے نے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کو کیا صرف یہ فائدہ پہنچایا تھا کہ وہ یہ بات سمجھ گئے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ماتحت جنگ کرنے والے مغلوب ہو جائیں گے۔ حالانکہ وہ خود بھی ان کے زیرِ کمان شریک جنگ تھے (یہ سفید جھوٹ ہے کہ وہ بھی شریک جنگ تھے ــــ قاسمی) لیکن یہ یاد آجانے کے بعد بھی حسب تصریح ابن بطال وہ آخر دم تک حضرت عائشہ کی رائے پر قائم رہے انہوں نے اپنی رائے سے رجوع بھی نہیں کیا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت پر بھی آمادہ نہ ہو سکے یہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ پر سراسر بہتان ہے کہ ارشاد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے یاد آجانے کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر جمے رہیں اور اس سے رجوع نہ فرمائیں۔

(فقہ القرآن ج ۳ صـ۳۸۸)

ع ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہئے

بندۂ خدا! ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رائے پر جمے رہنے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اصلاح بین الناس اور قصاص عثمان کے مطالبے میں ان کے ہمنوا تھے ــــ "قصاصِ عثمان اور اصلاح بین الناس" ــــ بس یہ تھی وہ رائے جس پر حضرت ابوبکرہ آخر تک قائم رہے خود عثمانی صاحب کی یہ عبارت اس پر شاہد ہے۔

"حضرت ابوبکرہ کے مسلک کے متعلق مشہور بات یہی ہے کہ وہ لوگوں کے

درمیان اصلاح حال کے مطالبہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی رائے کی تائید میں تھے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۷)

آگے چل کر محترم عثمانی صاحب رقمطراز ہیں کہ

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور جوان کے ساتھ تھے، انہوں نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس موقف پر انکار کیا تھا کہ وہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کر رہے تھے اور ان سے قصاص نہیں لے رہے تھے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۷)

"اصلاح حال" اور "مطالبۂ قصاصِ عثمان" بس یہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ رائے تھی جس پر جناب ابوبکرہ رضی اللہ عنہ آخر تک قائم رہے

**خودساختہ اساس** لیکن محترم عثمانی صاحب نے اس "اتفاقِ رائے" میں اپنی طرف سے یہ اضافی مفہوم پیدا کر کے کہ ـــــ "حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے شریکِ قتال تھے" ـــــ ایک باطل بنیاد قائم کی اور پھر اس پر استدلال کی عمارت کھڑی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے شریک جنگ تھے تو انہیں اس حدیث کے یاد آجانے سے کیا فائدہ ہوا اور اس حدیث کے یاد آجانے نے انہیں کیا خاک بچایا۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۶)

**بناءِ فاسد علی الفاسد** پھر اس بناءِ فاسد علی الفاسد کو مزید طُول دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

"حضرت ابوبکرہ جیسا جلیل القدر صحابی ارشاد نبوی کے یاد آجانے کے بعد بھی اپنے غلط موقف پر ڈٹا رہے اسے ہماری عقل تسلیم نہیں کرتی۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۶)

اس کے بعد اسی بناءِ فاسد علی الفاسد کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید سینہ زوری کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔

"یہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ پر سراسر بہتان ہے کہ ارشاد نبوی علی صاحبہا

الصلوٰۃ والسلام کے یاد آجانے کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر جمے رہیں اور
اس سے رجوع نہ فرمائیں"۔ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۸)

ہم ایسی تحقیق کو ہرگز ہرگز صحیح نہیں سمجھتے جس میں حقائق کو مسخ کر کے ان میں خودساختہ
معانی و مفاہیم پیدا کئے جاتے ہیں اور پھر انہی مزعومہ معانی اور باطل مفاہیم کو معیارِ حق
جان کر ہر اس چیز سے انکار کر ڈالا جائے جو تہذیبِ مغرب کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی آخر
اس اساسِ باطل پر اُٹھنے والے ان اکاذیب وافترا ات کا کہاں تک نوٹس لیا جائے کہ
ہماری صداقت کی تو بہر حال ایک حد تک ہے مگر متجدد دینِ دورِ حاضر کے جھوٹ کی تو کوئی
حد ہی نہیں ـــــ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ
الْحِسَابِ ـــــ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ وَاَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ۔

اب داد دیجئے محترم عثمانی صاحب کو کہ

ع لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دعویٰ یہ کہ ـــــ "تمام محدثین و مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ وہ (یعنی حضرت ابوبکرہ
رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھے اور انہوں نے حضرت علی
رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا"ـــــ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۶) مگر حال یہ ہے
کہ کسی ایک بھی محدث یا مورخ کا حوالہ نہیں دیا؟

اس کے بعد ہم بھارت کے نامور عالمِ دین مولانا سید جلال الدین انصر عمری کی اس
کتاب کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں سے عورتوں کی عدالتی شہادت کے موضوع
پر جناب عثمانی صاحب صفحات کے صفحات فقہ القرآن میں نقل کرتے چلے گئے ہیں مگر کوئی
علامت ایسی نہیں دی جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ مواد مولانا انصر عمری صاحب کے قلم تحقیق سے
مرتب ہوا ہے۔

"مشہور صحابی ابوبکرہ کہتے ہیں کہ "جنگ جمل میں حضرت عائشہ کے ساتھ
شریک ہو جاتا لیکن حضور کے ایک فرمان نے مجھے اس سے بچا لیا۔ جب
آپؐ کو کسریٰ کی لڑکی کے تخت نشین ہونے کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا تھا

کہ ــــ "وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنا اقتدار کسی عورت کے حوالے کر دے"۔ ــــ (عورت ــــ اسلامی معاشرہ میں ص۲۶۲)

**روایت بخاری پر تیسرا اعتراض** اس روایت پر جناب عثمانی صاحب کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ

"اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے حالات کے مصالح کے تحت بالفرض عورتوں کے سربراہِ مملکت ہونے کی ممانعت بھی فرمائی ہو تو چونکہ یہ ایک دستوری مسئلہ ہے اس لئے اسے بھی تشریعِ عام نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر مکان میں ابدالآباد تک قابل عمل ہو"۔

(فقہ القرآن ج ۳ ص۲۷۸)

یہ اس مسئلے پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک عذر لنگ ہے جسے تہذیب مغرب کے مطابق اسلامی تہذیب کو ڈھالنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے قرآن میں تو ایک حرف بھی عورت کی سربراہی مملکت کے حق میں بطور دلیل واقع نہیں ہے بلکہ اس کی تردید ہی میں دلائل پائے جاتے ہیں البتہ بخاری کی یہ روایت (جو صاف صحیح، صریح، واضح اور مرفوع روایت ہے اور منشائے قرآن کی مزید توضیح کرتی ہے) متجددین کی راہ میں رکاوٹ ہے چنانچہ اپنی راہ کے اس کانٹے کو دور کرنے کے لئے تاویل نہیں بلکہ تحریف کی راہ اختیار کرتے ہوئے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ روایت کوئی دائمی تشریعی قدر و قیمت نہیں رکھتی ہے حقیقت یہ ہے کہ احادیثِ نبویؐ کی تشریعی حیثیت سے انکار کا رجحان اگرچہ ابتدائی زمانے میں (بعد از خلافت راشدہ) معتزلہ میں پایا جاتا تھا مگر وہ زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ پایا اور آج اس ابتدائی فرقے کے پیرو معتزلہ کے نام سے کہیں موجود نہیں ہیں وہ فتنہ محدثین کی زبردست علمی اور تحقیقی کاوشوں کے نتیجے میں اپنی موت آپ مرگیا تھا پھر اس دور کے مسلمان خود ایک غالب و کارفرما تہذیب کے علمبردار ہونے کے باعث کسی اور تہذیب کی ذہنی غلامی کا شکار نہ تھے جو بیرونی افکار سے متاثر ہو کر انکارِ سنّت کا مسلک قبول کرتے اس لئے اس وقت کی علمی فضا اور تحقیقی ماحول بجائے خود "انکارِ سنت" کے مسلک کی راہ میں عظیم الشان رکاوٹ تھا اور پھر

اُس دور کے معتزلہ بھی پڑھے لکھے تھے صاحبِ علم تھے عربی ادب پر عبور رکھتے تھے اس لئے وہ کوئی کچی بات کرتے ہوئے خود بھی خائف رہتے تھے کہ اہل علم کی بارگاہ میں ان کی ہوا نہ اکھڑ جائے لیکن آج کے "معتزلہ" ان خوبیوں میں اُن کے مقابلے میں کسی شمار قطار میں ہی نہیں ہیں یہ لوگ تو فکری اور نظری اعتبار سے فرنگی تہذیب کے غلام ہیں مستشرقین کے نقوشِ پا ان کے لئے نشانات راہ ہیں انہی کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو جب اپنے منہ سے یہ لوگ اُگلتے ہیں تو انہیں "دلائل" کا نام دے دیتے ہیں "تحقیق" کی راہ پر چلتے ہوئے بال برابر بھی کوئی چیز اسلامی تہذیب کے خلاف مغربی تہذیب کی حمایت میں محسوس ہو تو اسے پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن اگر فرنگی تہذیب کے خلاف پہاڑ سے بھی وزنی کوئی چیز سامنے آئے تو تغیر و تحریف کے بارود سے اڑا دینے میں جُت جاتے ہیں کیونکہ ان غلام فطرت مستغربین کی نشو و نما اس تہذیب مغرب کے اصول و مبادیات میں ہوئی ہے جو قدم قدم پر اسلامی تہذیب سے ٹکراتی ہے چنانچہ ان لوگوں نے تہذیب فرنگ کو اختیار کر لینے کے بعد بھی مسلمان بنے رہنے کا کارگر نسخہ یہ ایجاد کیا ہے کہ اولاً سُنّتِ نبویؐ کا تعلق قرآن سے کاٹ پھینکا جائے اور ثانیاً جب قرآن اکیلا رہ جائے اور اس کی پشت پر "سنت نبوی" کے وہ عملی نظائر نہ ہوں جو الفاظ قرآن کو عملی تمدن میں متشکل کر دینے والے ہوں تو پھر اس قرآن کو "عصری تقاضوں" کی آڑ میں "اجتہاد" کا نام لے کر قرآن کی جدید تعبیر و تفسیر کے پردے میں تحریف و تغیر کے خراد پر چڑھا دیا جائے اور اسلام کو چھیل چھال کر اس کی ایسی شکل بنا دی جائے کہ ماسوائے نام کے مغرب کی لادینی تہذیب میں اور اسلام کی دینی تہذیب میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے اور یہ ضدان متفرقان" یوں ایک دوسری کے ہم رنگ اور ہم شکل ہو جائیں کہ

ع تا کس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری!

اب اگر مغربی تہذیب سے مسحور بلکہ مرعوب دماغ آج اس حدیث کو کوئی تشریعی مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ان کا یہ موقف پرِ کاہ کے برابر بھی کوئی وقعت نہیں رکھتا سوال [illegible] ہے؟ کیا قرآن نے مرد کو عورت پر قوام (سربراہ اور کارفرما) نہیں بنایا؟ کیا عورت مردوں کے مقابلے میں فطرتاً

کمزور اور ضعیف نہیں ہے؟ ان سوالات کے واقعی اور حقیقی جوابات کی روشنی میں سربراہی نسواں کا کوئی جواز قرآن پیش نہیں کرتا بلکہ قرآن خواتین کا دامن خانگی فرائض کی بجا آوری تک محدود کر دیتا ہے اور سربراہیٔ مملکت کے منصب کو اُس صنف بشر کے لئے مخصوص کر ڈالتا ہے جو بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ[1] (جو علمی اور جسمانی طور پہ کشادہ ظرف اور مضبوط ہو) سربراہِ مملکت کے لئے قرآنی شرط اور یہ ظاہر ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں علمی میدان میں بھی اپنی ذہنی صلاحیتوں کی کمزوریوں کے باعث مرد سے کمتر ہے (تفصیلی بحث آگے آرہی ہے) اور جسمانی قوں کے اعتبار سے بھی صنف رجال سے ضعیف تر ہے اس کا اعتراف خود محترم عثمانی صاحب کو بھی ہے۔

"عورت عموماً کمزور ہوتی ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۱۹)

اب جبکہ قرآن سربراہ مملکت کے لئے علمی اور جسمانی اعتبار سے کشادہ ظرف اور مضبوط ہونے کی شرط کو بیان کرتا ہے اور عورتیں اس شرط کو پورا کرنے میں مردوں کی قطعاً ہم پلہ نہیں ہیں تو اس کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ سربراہِ مملکت کا منصب مردوں کے لئے مخصوص ہے لیکن ہمارے علامہ فطرت [illegible] کا یہ حال ہے کہ گذشتہ امتوں میں سے کافرو مشرک امت کی ایک خاتون [illegible] کے "اسوہ حسنہ" کو دلیل بناتے ہیں اور فی الواقع سابقہ انبیاء کی شریعتوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

[illegible]

[illegible] معنی و مفہوم کی وضاحت کے لئے محترم عثمانی صاحب کا یہ اقتباس [illegible] فرمایئے۔

"یہ حدیث [illegible] نہیں ہے بلکہ ایسی قوموں کا ایک نفسیاتی تجزیہ ہے [illegible] وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جس کی قیادت کے لئے کوئی مرد میسر نہ آسکے اور اسے اپنی قیادت کسی عورت کے سپرد کرنی پڑے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۸۹)

محترم عثمانی صاحب کا یہ پورا اقتباس اور بالخصوص اس کا یہ جملہ کہ "وہ قوم کیا

---

[1] یہ بنی اسرائیل کا ایک واقعہ ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے ہم یہ استدلال اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ "سابقہ شرائع" کی بجائے "گذشتہ امتوں [illegible] کے حالات کو حجت سمجھنے والے اس پر غور فرمائیں۔

فلاح پا سکتی ہے جس کی قیادت کے لیئے کوئی مرد میسر نہ آسکے"۔۔۔۔۔ اس بات کو غیر مبہم انداز میں واشگاف کر دیتا ہے کہ سربراہیٔ مملکت اصلاً مرد ہی کا حق ہے عورت مردوں کی موجودگی میں یہ منصب نہیں پا سکتی اسے صرف قحط الرجال ہی میں اقتدار مل سکتا ہے اور جس قوم میں قیادت کے لیئے مردوں کا ایسا فقدان اور قحط پایا جائے کہ اس قوم کو اپنی قیادت کسی عورت کے سپرد کرنی پڑے تو ایسی قوم فلاح نہیں پا سکتی۔ یہ حدیث اگر قوموں کا یہی نفسیاتی تجزیہ بیان کرتی ہے تو پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کے حکم کو تشریعی حکم قرار دینا ہی پڑے گا حقیقت یہ ہے کہ محترم عثمانی صاحب نے غیر شعوری طور پر اس مفہوم کی خود توثیق و تصدیق کر دی ہے جس کی مخالفت میں وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ آخر مفاد حدیث بھی تو یہی ہے کہ مردوں کی موجودگی میں عورت سربراہِ مملکت نہیں ہو سکتی اور جناب عثمانی صاحب کا "نفسیاتی تجزیہ" بھی اسی پہ دلالت کرتا ہے اس لحاظ سے آخر دونوں میں کیا جوہری فرق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب عثمانی صاحب نے اپنے اس اقتباس میں اسی حقیقت کو لاشعوری طور پر قبول فرما لیا ہے جس کی تردید و تغلیط کے وہ درپے ہیں۔

ہماری یہ خواہش بلکہ دعا ہے کہ جس حقیقت کو انہوں نے لاشعوری طور پر قبول فرما لیا ہے اُسے وہ شعوری طور پر بھی اپنا لیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم محترم عثمانی صاحب کے اس تاریخی استدلال کی حقیقت بھی

**ایک غلط تاریخی استدلال اور اس کی حقیقت!**

واضح کر دیں جو انہوں نے عورت کی سربراہیٔ مملکت کے حق میں کیا ہے وہ جنگِ جمل میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی قیادت سے یہ دلیل اخذ کرتے ہیں کہ عورت سربراہِ مملکت بھی ہو سکتی ہے مگر اس بات پر وہ توجہ نہیں فرماتے کہ حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کن حالات میں اور کن ارادوں سے گھر سے باہر نکلی تھیں۔

تاریخ کا غائر مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کے خروج از خانہ کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ امت کی ماں ہونے کے ناطے سے اصلاح بین الناس کی خواہش مند تھیں نہ وہ قیادت و سیادت کی خواہشمند تھیں اور نہ انہیں فوجوں کی کمان سنبھالنے کی آرزو تھی لیکن جب وہ گھر سے نکل پڑیں تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ انہیں جنگ کرنا پڑی

سوال یہ ہے کہ اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ان کی اس دوڑ دھوپ سعی و کاوش اور جنگ و جدل کو کس نگاہ سے دیکھا ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے حامی صحابۂ کرام کی نگاہ میں ان کا یہ اقدام غلط تھا ہی مگر ان کا اس اقدام کو غلط قرار دینا اس بناء پر نہ

**اقدام عائشہؓ در نگاہ صحابۂ کرام**

تھا کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف فریق سے تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ وہ ایسے حق پرست اور گروہی عصبیتوں سے بالاتر لوگ تھے کہ اس ضمن میں جو کچھ بھی انہوں نے فرمایا وہ ان حضرات کی قطعی بے لاگ اور دیانتدارانہ رائے تھی رہے وہ صحابۂ کرام جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حامی اور شریک قتال تھے تو ان میں سے بھی کسی سے صراحت کے ساتھ یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کو سراہا ہو اگرچہ وہ خود بھی مجبوریٔ حالات کی بناء پر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ نہ کرنے کی نیت کے باوجود میدانِ حرب میں اترنے پر مجبور ہو گئے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کو دیکھئے وہ خود حضرت ام المؤمنین کے ہم خیال تھے مگر انہوں نے جن وجوہ سے ان کی حمایت اور موافقت میں جنگ کرنے سے گریز کیا ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ مبارک ان کے ذہن میں مستحضر تھا کہ "وہ قوم فلاح یاب نہیں ہو سکتی جو عورت کو اپنا امر حکومت سونپ دے۔"

اب اگر حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ اقدام ہمارے متجددین کے لئے

**ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کا تبصرہ**

سرمایۂ دلیل بن سکتا ہے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا طرز کیوں دلیل نہیں قرار پا سکتا جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو صاف طور پر (اپنے خط میں) یہ لکھا کہ

> "آپ کی حیثیت رسول اللہ اور امت کے درمیان ایک دروازے کی ہے اور آپ کا حجا[illegible] پردہ ہے لیکن آپ نے اس پردے کو چاک کر دیا یاد رکھئے قرآن نے آپ کے دامن کو سمیٹ دیا ہے اسے پھیلائیے نہیں اللہ نے آپ کو اپنے گھر میں بٹھایا ہے اسے چھوڑ کر میدان میں نہ چلے آئیے خدا خود اس [illegible]ت کی پشت پر ہے۔ آپ خود جانتی ہیں کہ حضورؐ کو آپ سے کس قدر محبت تھی

اگر امت کی ذمہ داری آپ کے حوالہ کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ دین کا ستون اگر گرنے لگے تو عورتیں اسے کھڑا نہیں کر سکتیں اور اگر اس میں شگاف پیدا ہو جائے تو عورتوں کے بس میں نہیں کہ اس کو بھر دیں ان میں اگر دین کے لئے جہاد (بمعنی قتال ــــ قاسمی) کی اہلیت ہوتی تو حضور لازماً آپ کو اس کی وصیت کرتے عورتوں کا جہاد اور ان کے لئے انتہائی محبوب بات یہ ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنا دامن سمیٹے رکھیں۔

ذرا سوچیئے تو سہی کہ اگر آپ کی ملاقات حضور سے اس حال میں ہوتی کہ آپ اونٹ پر بیٹھے ہوئے پہاڑوں اور ٹیلوں کے اطراف ایک گھاٹ سے دوسری گھاٹ گھوم رہی ہیں تو آپ کیا جواب دیتیں کل آپ کو حضور کے سامنے حاضر ہونا ہے اور حال یہ ہے کہ آپ نے اللہ کے ڈالے ہوئے پردے کو چاک کر دیا ہے اور اس کے عہد کو توڑ چکی ہیں۔

جو کچھ آپ نے کیا اگر وہ مجھ سے سرزد ہوتا تو خدا کی قسم! مجھے جنت میں جاتے ہوئے بھی ندامت ہوتی (لہٰذا میری گذارش یہ ہے کہ) آپ حضور کے قائم کردہ پردے کو اپنا ستر اور گھر کے صحن کو اپنا قلعہ بنائیں آپ حقیقت میں امت کی خیرخواہ اسی وقت ہوں گی جبکہ آپ ان کی مدد کے لئے (بجائے میدان میں جانے کے) گھر میں رہیں اگر میں آپ کو وہ حدیث سناؤں جو میں نے حضور سے سنی ہے تو آپ سانپ کی طرح مجھے ڈسنے کے لئے دوڑ پڑیں"۔ (العقد الفرید ج ۲ ص ۹۶-۹۷

الامامۃ والسیاسۃ ج ۲ ص ۵۶ بحوالہ عورت اسلامی معاشرہ میں)

صرف اتنا ہی نہیں کہ محض حضرت ام سلمہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس اقدام کو نامناسب قرار دیا بلکہ دیگر جید صحابہ نے بھی (جن میں سے اکثریت غیر جانبدار اصحاب کی تھی) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس فعل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔

**زید بن صوحان رضؓ کا جواب**

حضرت عائشہ صدیقہ نے بصرے سے حضرت زید بن صوحان کو اپنے "ولد خالص" کے الفاظ سے خطاب کرتے ہوئے یہ خط لکھا کہ ــــــ حضرت عثمان

رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لئے جو کوشش ہو رہی ہے تم فوراً اس میں شریک ہو جاؤ ورنہ کم از کم اپنی قوم کے افراد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت سے باز رکھو"۔۔۔۔ اس خط کی وصولی پر حضرت زید بن صوحان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

"اللہ تعالیٰ ام المومنین پر رحم فرمائے انہیں گھر میں بیٹھنے اور ہمیں باہر نکل کر جہاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن جس امر کی وہ پابند تھیں خود تو اس سے آزاد ہو گئیں اور ہم سے اس کی پابندی کرانا چاہتی ہیں اور جس کام پر ہم مامور کئے گئے ہیں اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور ہمیں اس سے روک رہی ہیں"۔

پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے خط کے جواب میں لکھا کہ

"یقیناً میں آپ کی اولاد خالص ہوں (اور آپ میری ماں ہیں) بشرطیکہ آپ اس سعی و کاوش سے کنارہ کش ہو جائیں اور گھر لوٹ جائیں ورنہ آپ کے چھوڑنے والوں میں مجھے پہلا شخص سمجھیے"۔ (طبری ج ۵ ص ۱۸۴-۱۸۳۔ الکامل لابن الاثیر ج ۳ ص ۹۷۔ بحوالہ عورت اسلامی معاشرہ میں)

بصرہ ہی کی ایک اور مشہور شخصیت صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جاریہ بن قدامہ

**جاریہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ اور اقدام عائشہ رضی اللہ عنہا**

رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے گویا ہیں کہ

"آپ کے اس خروج کے مقابلہ میں حضرت عثمان کی شہادت بہت ہلکی ہے اللہ نے آپ کی حرمت قائم کی تھی اور آپ کو پردے کا پابند کیا تھا لیکن آپ نے اس پردے کو چاک اور اس کی حرمت کو ختم کر دیا جو شخص آپ سے جنگ جائز سمجھتا ہے وہ گویا آپ کے قتل کو بھی جائز سمجھتا ہے (ذرا غور کیجیے آپ نے لوگوں کو کس قدر نازک پوزیشن میں ڈال دیا ہے لہذا) اگر آپ اپنی خوشی سے آئی ہیں تو اپنے گھر لوٹ جائیے اور اگر آپ کو مجبور کر کے لایا گیا ہے تو آپ اس کے خلاف لوگوں کا تعاون حاصل کیجیے اور اپنے مستقر پہ پہنچ جائیے"۔

(تاریخ الرسل والملوک طبری ج ۵ ص ۱۷۶۔ بحوالہ 'عورت' اسلامی معاشرہ میں)

**ابوبکرہ کی رائے**

اس کے بعد بخاری میں مذکور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول پھر ملاحظہ

فرمائیے کہ

"جنگِ جمل میں، میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ شریکِ جنگ ہو جاتا لیکن حضورؐ کے اس فرمان نے مجھے اس سے بچا لیا جب آپ کو کسریٰ کی لڑکی کے تخت نشین ہونے کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا تھا کہ "وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جو اپنا اقتدار عورت کے حوالے کر دے" (بخاری۔ کتاب الفتن)

**ابن عمر اور اقدام عائشہ رضی اللہ عنہا** حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا تبصرہ ان الفاظ پر مشتمل ہے۔

"بیتها خیر لها من هودجها"

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے ان کا گھر ان کے ہودج سے بہتر ہے"

(الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص۶۲۔ بحوالہ عورت، اسلامی معاشرہ میں)

کوئی مسلمان ان جید اصحابِ رسول کی تنقیدی آراء کو یہ کہہ کر رد نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف تھے ان بزرگوں سے سوائے حق گوئی اور دیانتدارانہ رائے کے اور کسی چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی اگر یہ لوگ بھی گروہی عصبیتوں کا شکار ہو کر جادۂ حق سے منحرف ہو سکتے ہیں تو پھر ہم نہیں سمجھتے کہ کون شخص راہِ حق پر قائم رہ کر اظہارِ حق کر سکتا ہے پھر ان بزرگوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قیادت[لہ] کی بناء پر باہمی قتال کے اس فتنے سے الگ رہنے والوں میں حضرت ابوبکرہ اور عبداللہ بن عمر بھی تھے۔

---

[لہ] امامت کبریٰ اور امامت صغریٰ:۔ حضرت عائشہ صدیقہ کے اس واقعۂ قیادت سے عورت کی "امامت کبریٰ" کا استدلال کرنے والے شاید یہ نہیں جانتے کہ جو لوگ ان کی قیادت میں حضرت علی کے خلاف برسرِ جنگ تھے انہوں نے حضرت عائشہ کو نماز میں بھی اپنا امام نہیں بنایا حالانکہ نماز کی امامت سلطنت کی امامت سے چھوٹی چیز ہے چنانچہ جو اصحاب رسولؐ ام المؤمنین کی قیادت میں ان کے اشارے پر اپنی جان و مال نثار رہے تھے وہ آپ کو اپنا قانوناً خلیفہ بنانے کے لئے تیار نہیں تھے حتیٰ کہ نماز کون پڑھائیں؟ طلحہؓ یا زبیرؓ؟ اس پر اصحاب جمل کا اختلاف ہوا حضرت عائشہ نے یہ نہیں کہا کہ "جب جنگ میں میں تمہاری قائد ہوں تو مسجد میں امام میرے سوا کون ہو سکتا ہے" اور نہ ہی اصحاب جمل نے ہی یہ استدلال کیا اور یہ سب کچھ حضرت عائشہؓ کے ان حامیوں میں ہوا جن کے نزدیک آپؓ کی دینی حیثیت اور تقویٰ و تدین طلحہؓ و زبیرؓ اور ابن زبیرؓ وغیرہ سے بڑھ کر تھی۔

بہر حال جید اصحاب نبوی کی ان آراء کی روشنی میں ایک انصاف پسند آدمی اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ اقدام حدود اسلام سے متجاوز تھا۔ جس کی پیروی کرنا بجائے خود ایک غلط بات ہے۔

اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ فرمائیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کرنے کو تو یہ اقدام اقدام عائشہؓ خود ان کی اپنی نظر میں!! کر گزریں مگر بعد میں خود ان کو اس پر ندامت محسوس ہوئی اس ندامت نے انہیں عمر بھر بے چین کئے رکھا حتیٰ کہ وہ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی محض اس بناء پر مدفون نہ ہوئیں کہ ان سے یہ لغزش سرزد ہو گئی تھی جبکہ قبل ازیں وہ یہاں دفن ہونے کا ارادہ فرما چکی تھیں۔

"وفات کے وقت انہوں نے (یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے) وصیت کی کہ مجھے روضۂ نبوی میں آپ کے ساتھ دفن نہ کرنا بقیع میں اور ازواج کے ساتھ دفن کرنا (بخاری۔ کتاب الجنائز) میں نے آپ کے بعد ایک جرم کیا ہے (مستدرک حاکم جزو عائشہ) ابن سعد میں ہے کہ جب وہ یہ آیت پڑھتی تھیں وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ۔ تو اس قدر روتی تھیں کہ روتے روتے آنچل تر ہو جاتا تھا" (سیرت عائشہؓ۔ از سید سلیمان ندوی ؒ ص۱۴۲)

علامہ ابن عبدالبر، الاستیعاب میں یہ روایت لائے ہیں کہ ام المؤمنین نے عبداللہ بن عمر سے شکایتاً فرمایا "اے ابو عبدالرحمٰن! تم نے کیوں نہ مجھے اس کام پر جانے سے منع فرمایا؟" انہوں نے جواب دیا "میں نے دیکھا کہ ایک شخص آپ کی رائے پر حاوی ہو گیا ہے اور مجھے امید نہ تھی کہ اس شخص (عبداللہ بن زبیر) کے خلاف چل سکیں گی۔" اس پر ام المؤمنینؓ نے فرمایا "کاش تم مجھے منع کر دیتے تو میں نہ نکلتی۔"

(الاستیعاب ۔ بحوالہ اسلامی ریاست ص۵۱۲)

اس کے بعد اس فعل کو سب جید صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ خود حضرت [illegible] عنہا غلط جانتے ہوئے اس پر نادم ہیں اسے اس بات کی دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے کہ عورت

سربراہِ مملکت ہو سکتی ہے؟ یا عدالتی اور قانون سازی کے مناصب پر فائز ہو سکتی ہے۔
بالخصوص جبکہ اس قیادت کو (جس کی بنیاد پر اس استدلال کی عمارت اٹھائی جا رہی ہے) پالینے کے لئے انہوں نے نہ کوئی خواہش کی اور نہ کوشش۔ ان کی دوڑ دھوپ کا تمامتر محور و مرکز محض مطالبۂ قصاص عثمان اور اصلاح بین الناس تھا پھر بر سبیل تنزل اگر یہ چیز دلیل بن بھی سکتی ہے تو صرف اس بات کی کہ فوجوں کی کمان عورت کے ہاتھ میں دی جائے لیکن محترم عثمانی صاحب عورت کو "کمانڈر ان چیف" بنانے کی بجائے تمام تر زور انہیں سربراہِ مملکت بنانے یا دیگر بلند پایہ مناصب کا حقدار ثابت کرنے پر صرف کرتے ہیں پھر تاریخی حقائق یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ جناب ام المؤمنین کے خروج از خانہ کا مقصد اصلاحِ احوال اور مطالبۂ قصاص عثمان کے سوا اور کچھ نہ تھا گھر سے نکلتے وقت میدانِ جنگ کو اپنی منزل قرار دینا ان کے پیشِ نظر نہ تھا مگر بعد میں حالات ایسے پیچیدہ ہوتے گئے کہ انہیں میدانِ جنگ میں بھی جانا پڑا اس لئے نہیں کہ وہ فوجوں کی کمان ہاتھ میں لینے کی حریص تھیں بلکہ اس امید پر کہ عین میدان جنگ میں ام المؤمنین کو سواری پر دیکھ کر شاید بد باطن لوگ حیا کریں اور اصلاحِ احوال کی کوئی امید بر آئے۔

(ملاحظہ ہو دائرہ معارف اسلامی۔ جنگ جمل کا واقعہ)

اس کے بعد حضرت ام المؤمنین کی اس لغزش کو جوان سے شورش اور ابتری حالات میں مجبورانہ و مضطرانہ واقع ہوئی اور جس پر وہ خود بھی بعد میں نادم اور شرمسار ہوئیں اسے مملکت کے کلیدی مناصب اور سربراہی ریاست کے منصب پر عورت کے فائز ہونے کی دلیل بنانا صحیح نہیں۔

**نکیر صحابہ کا جواب**

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس اقدام پر حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اس نکیر و ترد ید اور خود ان کی اپنی ندامت و شرمساری کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ——— "یہ تمام حوالہ جات خود ساختہ ہیں۔ صحابہ کے یہ تبصرے اور یہ خطوط سب وضعی ہیں یہ سارا مواد جعلی ہے یہ روایات بعد میں گھڑی گئی ہیں ان سب روایات و آثار میں کیڑے پڑے ہوئے ہیں وغیرہ وغیرہ" ———

یہ دورِ جدید کا ایک فیشن ہے کہ جو چیز خلافِ مطلب ہوتی ہے اسے جعلی یا "خلافِ قرآن" کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ خلاف قرآن نہیں ہوتی صرف اس مفہوم کے خلاف ہوتی ہے جو قرآن کے گلے مڑھ دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ خود حضرت ام المؤمنین کا یہ طرزِ عمل صرف آثار و روایات ہی کے مطابق حدودِ اسلام سے متجاوز قرار نہیں پا رہا ہے بلکہ قرآن کے مطابق بھی اس کی یہی پوزیشن ہے کیونکہ قرآن نے خواتین اسلام کو امہات المؤمنین ہی کے توسط سے یہ حکم دیا ہے کہ

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ۔ (اے بیگماتِ نبویؐ) اپنے گھروں میں وقار سے ٹکی رہو۔

TRUEMASLAK@INBOX.COM

# باب ۹

# قصاص و دیت نسواں

چونکہ میں صرف اور صرف قرآن کریم ہی کی روشنی میں ـــــ فقہ القرآن (جلد سوم) پر ایک نظر ڈال رہا ہوں اس لئے میں نے زیر بحث مسئلے میں اپنے دلائل کو حدودِ قرآن تک ہی محدود رکھا ہے اور یہ مجھے محترم عثمانی صاحب کی مخصوص ذہنی افتاد کے پیشِ نظر کرنا پڑا ورنہ اس مسئلے کا کما حقہٗ جائزہ دلائلِ سنتِ نبوی ﷺ کے بغیر ممکن نہیں ہے میں ابھی احادیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں قلم اٹھانے پر سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے محترم عثمانی صاحب کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ وہ "شہادتِ نسواں" اور "دیتِ نسواں" پر ایک مستقل کتاب منظر عام پر لا رہے ہیں اس لئے میں نے اس کتاب کی آمد تک اس بحث کو معرض التوا میں رکھنا انسب تصور کیا۔

میری یہ تحریر (جس میں اب معمولی لفظی تبدیلی ہو چکی ہے) ۲۰ تا ۲۲ مئی ۱۹۸۴ء تک تین اقساط میں روزنامہ جنگ میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

آجکل اخبارات میں قصاص و دیت کا مسئلہ موضوعِ بحث بن چکا ہے اخبار بین حضرات جانتے ہیں کہ اس بحث میں دو گروہ خم ٹھونک کر ایک دوسرے کے مدمقابل ہو گئے ہیں ایک گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کی فکری قیادت کا فریضہ جناب عمر احمد عثمانی صاحب اور جناب غلام احمد پرویز صاحب ادا کر رہے ہیں دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کی نظری و علمی

راہنمائی کا کام جمہور علماءِ امت سرانجام دے رہے ہیں۔ فریقین کے دلائل کا بغور مطالعہ

**اختلاف کی اصل بنیاد** کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے ان کے نظریات میں اختلاف کی اصل بنیاد "مأخذ قانون" کا اختلاف ہے اول الذکر گروہ کے نزدیک اسلامی قانون کا منبع صرف "قرآن کریم" ہے جبکہ دوسرے فریق کے نزدیک اسلامی قانون کا مصدر و مأخذ "قرآن اور سُنّتِ نبوی" ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ سنت نبوی بھی ماخذ قانون ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر اتمامِ حجت کی حد تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اس لئے یہاں اس مبحث سے صرف نظر کرکے مسئلہ زیر بحث پر قلم اٹھاتے ہوئے میں اپنے دلائل کو صرف قرآن کی حد تک محدود رکھوں گا کیونکہ قرآن کا مصدر و مأخذ ہونا بہرحال دونوں فریقوں کو مُسلّم ہے۔

قصاص و دیت کے بارے میں بحث و استدلال کا تمام تر انحصار قرآن پاک کی درج

**آیاتِ قرآن** ذیل دو آیات ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

(۲ / ۱۷۸)

اے ایمان والو! تم پر قتل کے مقدموں میں قصاص لکھ دیا گیا ہے آزاد آدمی قاتل ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے غلام نے قتل کیا ہو تو اس غلام ہی کو قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لئے تیار ہو تو معروف طریقے پر خونبہا کا تصفیہ ہونا چاہیئے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خون بہا ادا کرے یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف و رحمت ہے اس کے بعد جو زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

دوسری آیت جو سورہ نساء میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| ____مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (۴/۹۲) | ____جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے اس پر مومن غلام کا آزاد کرنا اور مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنا لازم ہے اِلّا یہ کہ وہ معاف کر دیں لیکن اگر وہ مقتول ایسی قوم میں سے ہو جس سے تمہاری عداوت (لڑائی) ہو تو صرف مومن غلام کو آزاد کرنا لازم ہے اور اگر وہ ایسی قوم کا فرد ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہو تو دیت ادا کرنا اور مومن غلام کو آزاد کرنا لازم ہے۔ |

اس آیت پر بحث فرماتے ہوئے محترم مولانا عمر احمد عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"قتل خطا میں قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ دیت دینی ہوگی اس میں قرآن نے مرد عورت اور بچہ کے قتل میں کوئی فرق نہیں کیا ہے اس نے صرف یہ فرمایا ہے کہ ___"مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنی ہوگی"____

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۲۴)

**"نفسِ" دیت اور "مقدارِ" دیت**

بالکل درست فرمایا ہے جناب محترم عثمانی صاحب نے! واقعی قرآن نے قتل خطا کے کفارے میں صرف دیت کی ادائیگی کا حکم دیا ہے بغیر اس کے کہ اس نے دیت کی مقدار کا تعین کیا ہو "نفس دیت" میں قرآن نے مرد، عورت یا بچے کے قتل میں کوئی فرق نہیں کیا ہے مرد کی بھی "دیت" ہے۔ عورت کی بھی "دیت" ہے، بچے کی بھی "دیت" ہے "نفس دیت" کے لزوم میں یہ سب افراد مساوی ہیں قرآن صرف یہ کہتا ہے کہ ____ "مقتول کے ورثاء کو دیت دینی ہوگی"____ (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۲۴) مگر دیت کی "مقدار" کیا ہو؟ یہ الگ مسئلہ ہے جس کو قرآن نے قطعاً طے نہیں کیا ہے۔ یہ امر کہ ہر مسلمان مقتول کی دیت ہے ایک متفقہ مسئلہ ہے مگر یہ امر کہ "مقدار دیت" کیا ہے؟ معرضِ اختلاف میں پڑا ہوا مسئلہ

ہے۔ "نفس دیت" کی ادائیگی کا حکم اصولِ قرآن سے تعلق رکھتا ہے جبکہ "مقدارِ دیت" کے تعین کا مسئلہ جزئیات سے تعلق رکھتا ہے قرآن جب بھی اور جہاں بھی دیت کا ذکر کرتا ہے اس انداز سے کرتا ہے کہ ــــــ "مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنی ہوگی" ــــــ مگر کس مقدار میں؟ یہ بات قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہے سوال یہ ہے کہ "مقدار دیت" کا تعین کون کرے؟ اس کا جواب پہلے گروہ کے نزدیک یہ ہے کہ ہر دور کا "مرکزِ ملت" اپنی حاکمانہ حیثیت سے اس کا تعین کرے گا جبکہ دوسرے گروہ کے نزدیک اس کا تعین حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مامور من اللہ حاکم کی حیثیت سے کریں گے کیونکہ یہ ان کے منصبِ نبوت کا براہِ راست تقاضا ہے جسے پورا کرنے کے لئے انہیں کتاب کے ساتھ بھیجا گیا ہے (بلکہ کتاب کو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے) ورنہ اللہ تعالیٰ قرآن کو براہِ راست بھی مشرکین عرب تک پہنچا دینے پر قادر تھا تاکہ ان کا "مرکزِ ملت" خود اس کی جزئیات کا تعین کرلے۔ رسول کا مقام و مرتبہ محض ایک نامہ بر اور ڈاکیئے کا نہیں ہے جس کا کام محض پیغام پہنچا دینا ہو بلکہ وہ ان لوگوں کے لئے ہر شعبۂ حیات میں "اسوۂ حسنہ" ہے جو اس پر ایمان لے آئیں۔

بعض لوگ رسول کو یہی مقام دیتے ہیں کہ وہ محض ایک چٹھی رسان تھا جس کا کام ڈاک پہنچا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے اور اب لوگ جانیں اور وہ چٹھی جانے جو ان تک پہنچ چکی ہے وہی لوگ اب چٹھی کے غیر مقررہ مقادیر کا تعین کریں گے۔ جناب پرویز صاحب ارشاد فرماتے ہیں

> "قرآن کی راہنمائی چونکہ تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے ہے (حالانکہ اسی طرح رسولِ قرآن کی راہنمائی بھی تمام انسانوں اور تمام زمانوں کے لئے ہے ــــ قاسمی) اس لئے اس میں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) صرف اصول بیان کیے گئے ہیں تاکہ ہر دور کے انسان اپنے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل متعین کرتے رہیں"
>
> (سلیم کے نام دوم ص۲۱۲)

بہرحال قرآن نے "نفس دیت" کی ادائیگی کا حکم دیا ہے بغیر اس کے کہ اس نے "مقدار دیت" کو طے کیا

## "نفسِ شئے" اور "مقدار شئے" کی وضاحت ایک قرآنی مثال سے!

ہو میں اس بات کو قرآن ہی کی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں قرآن نے زرعی زکوٰۃ کے باب میں یہ حکم دیا ہے کہ وَاٰتُوا حَقَّہٗ یَوْمَ حَصَادِہٖ (جس روز کھیتی کٹ جائے زرعی پیداوار میں سے اپنے رب کا حق ادا کرو)۔ یہاں قرآن مطلق زرعی پیداوار میں سے خدا کا حق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور یہ فرق نہیں کرتا کہ وہ پیداوار نہری زمین سے حاصل ہوئی ہو یا بارانی زمین سے۔ اس کا حکم اور مطالبہ فقط یہ ہے کہ ـــــ "زرعی پیداوار میں سے اللہ کا حق ادا کرو جس روز کہ کھیتی کٹ جائے" ـــــ محترم عثمانی صاحب یہاں زرعی پیداوار میں اولاً نہری (یا چاہی) اور بارانی زمین کی پیداوار میں فرق کرتے ہیں ثانیاً اسی تفریق ہی کی بنیاد پر دونوں قسم کی پیداوار میں "مقدار زکوٰۃ" میں بھی فرق وامتیاز کرتے ہیں وہ پہلی قسم کی پیداوار میں مقدار زکوٰۃ نصف عشر اور دوسری قسم کی پیداوار میں مکمل عشر تسلیم فرماتے ہیں ملاحظہ فرمائیے ان کے مندرجہ ذیل اقتباسات۔

> "زرعی پیداوار پر دسواں حصہ اگر زمین بارانی ہو لیکن اگر زمین نہری (یا چاہی) ہو اور آدمی کو محنت اور سرمایہ خرچ کر کے پانی کو حاصل کرنا اور زمین کو سیراب کرنا پڑتا ہو تو پھر پیداوار کا بیسواں حصہ (نصف عشر) اور معدنیات پر پانچواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔" (فقہ القرآن ج ۱ ص ۲۸۸)
>
> "زمین کی پیداوار خواہ وہ باغات کی شکل میں ہو یا کھیتوں کی شکل میں سب میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے لیکن اس حق کی مقدار کیا ہوگی؟ اس کو پھر غیر متعین چھوڑ دیا ہے۔" (ایضاً ص ۲۸۹)

بالکل اسی طرح قرآن یہ تاکید کرتا ہے کہ ـــــ "مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنی ہوگی" ـــــ لیکن یہاں محترم عثمانی صاحب ہر صنف کے مسلم مقتول کے لئے مساوی "مقدار دیت" کو ثابت کرنے کے رجحان کے تحت فرماتے ہیں کہ

> "قتل خطا میں قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ دیت دینی ہوگی اس میں قرآن کریم نے، مرد، عورت یا بچہ کے قتل میں کوئی فرق وامتیاز نہیں کیا ہے اس نے صرف یہ فرمایا ہے کہ مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرنی ہوگی۔"
>
> (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۲۴)

اب اگر قرآن نے دیت کے باب میں مرد عورت یا بچہ کے قتل میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا ہے تو اس نے زرعی پیداوار میں نہری (یا چاہی) اور بارانی زمین کی پیداوار میں بھی کوئی فرق نہیں کیا ہے لیکن مولانا محترم نہ صرف یہ کہ یہاں پیداوار میں فرق کرتے ہیں بلکہ ان کی مقدار زکوٰۃ میں بھی امتیاز کرتے ہیں، جسے قرآن نے اسی طرح غیر متعین چھوڑ دیا ہے جس طرح دیت کی مقدار کو غیر متعین چھوڑ دیا ہے آخر یہ تنویت کیوں؟

میرا استدلال یہ ہے کہ جس طرح اور جس بنیاد پر زرعی پیداوار میں نہری (یا چاہی) اور بارانی زمین کی کھیتی میں فرق کیا گیا ہے بالکل اسی طرح اور اسی بنیاد پر مقتول مرد مومن اور مقتول خاتون مسلمہ کی دیت میں بھی فرق کیا جا سکتا ہے جس طرح اور جس بنیاد پر زرعی پیداوار کی غیر مقررہ قرآنی مقدار زکوٰۃ میں مکمل عشر اور نصف عشر میں فرق کیا گیا ہے بعینہٖ اسی طرح اور اسی بنیاد پر دیت کی غیر مقررہ قرآنی مقدار میں بھی پوری دیت اور نصف دیت کی تفریق پیدا کی جا سکتی ہے لہٰذا یہ کہنا غلط بات ہے کہ مقتول مرد ہو یا عورت قرآن نے دونوں کے لئے دیت کا ایک ہی لفظ استعمال کر کے "مقدار دیت" کی مساوات کو بھی لازم کر دیا ہے کیونکہ پھر تو اسی دلیل کی بنیاد پر نہری (یا چاہی) اور بارانی زمین کی پیداوار میں بھی "مقدار زکوٰۃ" کی مساوات لازم آتی ہے جسے خود محترم عثمانی صاحب بھی نہیں مانتے ہیں۔ بہر حال مومن مقتول کے لئے (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) دیت کے لفظی اشتراک کی بنا پر دونوں کی "مقدار دیت" کو مساوی قرار دینا ایسا ہی بے وزن استدلال ہے جیسا اس شخص کا جو قرآن کے قانون وراثت میں "نَصِيبٌ" (حصہ) کا مشترک لفظ دیکھ کر یہ دعویٰ کر دے کہ مرد و زن کے حصے مساوی ہیں۔ قرآن میں جس طرح ــــ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ــــ اور ــــ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ــــ میں "نَصِيبٌ" کے لفظی اشتراک کے باوجود "مقدار نصیب" میں مساوات لازم نہیں ہے (اور "مقدار نصیب" کے تعین کے لئے قرآن یا خارج از قرآن کسی اور قابل اعتماد ماخذ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا) بالکل اسی طرح مرد و زن کے لئے

مطلق دیت والی آیت میں بھی "دیت" کے لفظی اشتراک کے باوجود "مقدارِ دیت" میں مساوات لازم نہیں ہے (اور "مقدار دیت" کے تعین کے لئے قرآن یا خارج از قرآن کسی اور قابل اعتماد مأخذ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا)۔ الغرض قرآن سے یہ تو ثابت ہے کہ "نفسِ دیت" میں مقتول مردِ مومن خاتونِ مسلمہ اور بچہ سب مساوی ہیں مگر یہ کہ "مقدار دیت" میں بھی ان سب کے درمیان مساوات پائی جاتی ہے قرآن کریم سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہے۔

# ذمّی کی دیت کا مسئلہ

مسلم عورت کی مقدارِ دیت کے بعد دوسرا اہم مسئلہ جو اس مسئلے سے متقارب اور متماثل خیال کیا جاتا ہے وہ ذمّی کافر کی دیت کا مسئلہ ہے اس کی اہمیت اس بنا پر بھی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک قرآن پاک کی رُو سے مردِ مسلم اور ذمی کافر کی مقدار دیت برابر اور مساوی ہے چنانچہ وہ استدلالاً یہ فرماتے ہیں کہ ـــــ اگر ذمی کافر کی "مقدار دیت" قرآن کی رو سے مردِ مسلمان کی مقدار دیت کے برابر ہے تو پھر آخر خاتون مسلمہ کا کیا قصور ہے کہ اس کی مقدار دیت مسلمان مرد کے برابر نہ ہو ـــــ محترم عثمانی صاحب نے اپنی کتاب "فقہ القرآن" میں اسی استدلال کا سہارا لیا ہے۔

جناب عثمانی صاحب اور ان کے ہمنوا قرآن کی بنیاد پر "ذمی کافر" اور "مومن مقتول" کی مساوی مقدارِ دیت کے قائل ہیں جبکہ احناف کے علاوہ تمام علماءِ امت ذمی کی مقدار دیت کو مسلمان مقتول کی مقدار دیت کا نصف مانتے ہیں

**عثمانی صاحب کا موقف**

محترم عثمانی صاحب آیت ۹۲ کے تحت رقمطراز ہیں کہ

"کوئی مسلمان کسی ذمی کافر کو قتل کر دے یعنی کسی ایسے کافر کو قتل کر دے جس سے تمہارا ذمہ داری کا معاہدہ ہو اور قتل کسی غلطی کا نتیجہ ہو تو اس میں بھی ایک غلام کو آزاد کرنا ـــــ (یہاں غلام کے "مومن" ہونے کی شرط اڑا دی گئی

ہے۔ قاسمی) ــــ اور مقتول کے ورثار کو دیت ادا کرنا ہوگی۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۲۴)

محترم عثمانی صاحب کے ایک ہمنوا (ریٹائرڈ) جسٹس خلیل الرحمان چودھری صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"قرآن کے اس حکم سے واضح ہوا کہ اگر کوئی مسلمان ذمی کافر کو قتل کر دے یعنی کسی ایسے کافر کو قتل کر دے جس سے تمہارا معاہدہ ہو اور قتلِ عمد نہ ہو بلکہ قتلِ خطا ہو تو اس میں بھی ایک غلام کو آزاد کرنا۔ (یہاں پھر غلام کے "مومن" ہونے کی شرط حذف کی گئی ہے ــــ قاسمی) اور مقتول کے ورثار کو دیت ادا کرنی پڑے گی یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قتل خطا کے دونوں احکامات اولاً کسی مومن کے قتل کے سلسلے میں ثانیاً کسی ایسے کافر کے قتل کے سلسلے میں جس کی قوم سے معاہدہ ہو بعینہٖ ایک طرح کے ہیں۔" (روزنامہ "جنگ" ۱۶ر اپریل ۱۹۸۴ء)

مقام حیرت ہے کہ ہماری عدالتوں کے بعض جج صاحبان، بعض اوقات، قرآنی آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اتنا بھی غور کرنا مناسب نہیں سمجھتے جتنا وہ کسی ادنیٰ درجہ کے دنیاوی مقدمے پر غور کیا کرتے ہیں۔ یہ بات تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ "ذمی کافر" کے قتل کے کفارے میں غلام کی آزادی کے حکم میں اس کے "مومن" ہونے کی شرط اڑا دینا، محترم عثمانی صاحب اور جناب جسٹس صاحب کی دانستہ کارفرمائی ہے یا کہ غیر دانستہ۔ لیکن یہ بات بہرحال واضح ہے کہ دونوں حضرات کو یہاں شدید مغالطہ لاحق ہوا ہے جس کی بنار پر وہ یہ سمجھ رہے ہیں

**آیت ۹۲ کی توضیح وتشریح**

کہ آیت ۹۲ کے آخری حصے میں جس مقتول کا ذکر ہے۔ وہ "ذمّی کافر" ہے حالانکہ وہ "مقتول مومن" ہے۔ آیت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے میں محض افہام وتفہیم کے پیش نظر آیت کو تین حصوں میں تقسیم کر کے پیش کر رہا ہوں۔

۱ ــــ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا

۲ ــــ فَإِن كَانَ مِن قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ

رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ

۳ـــــ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ

۱ـــــ اگر کوئی شخص کسی مومن کو قتل کر دے تو وہ ایک مومن غلام کو آزاد کر دے اور مقتول کے وارثوں کو دیت دے اِلّا یہ کہ وہ لوگ اسے معاف کر دیں۔

۲ـــــ لیکن اگر "وہ" کسی ایسی قوم میں سے ہو جس سے تمہاری عداوت (لڑائی) ہو مگر "وہ" مومن تو پھر ایک مؤمن غلام کو آزاد کرنا ہو گا۔

۳ـــــ اور اگر "وہ" (مذکور سابق مقتول) کسی ایسی قوم میں سے ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے ورثاء کو دیت ادا کرنا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا۔

آیت میں چند قابل غور باتیں

۱ـــــ سب سے پہلی چیز جو قابل غور ہے وہ آیت کا سیاق و سباق ہے۔ ابتدائی حصۂ آیت میں جس مقتول کا ذکر ہے وہ یقیناً مومن ہے آیت کے الفاظ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا (جو کسی مومن کو قتل کر دے) اس کی صراحت کر دیتے ہیں۔ آیت کے درمیانی حصے میں جس مقتول کا ذکر ہے وہ دشمن قوم میں سے ہے اس لئے یہاں یہ وہم ہو سکتا تھا کہ وہ کافر ہو لیکن قرآن نے وَهُوَ مُؤْمِنٌ (اور وہ مومن ہو) کے الفاظ بول کر اس وہم کی جڑ کاٹ دی اور یہ بات واضح ہو گئی کہ دوسرے حصۂ آیت میں بھی مذکور مقتول "مومن مقتول" ہے اسی "مومن مقتول" کا ذکر (جو آیت کے ابتدائی اور درمیانی حصے میں موجود ہے) آیت کے آخری حصے تک برقرار رہتا ہے اسی لئے قرآن اسے هُوَ ("وہ") کی ضمیر کے ساتھ (جو کَانَ میں مضمر ہے) بیان کرتا ہے جو اس اسم کا قائم مقام ہے جو پہلے اور دوسرے حصۂ آیت میں مذکور ہے۔ اسے خواہ مخواہ ذمی اور معاہد کافر قرار دینا ایک سخت بیجا بات ہے جبکہ ذمی کافر کا ذکر آیت میں نہ تو پہلے ہی موجود ہے اور نہ بعد ہی میں۔ اگر ابتدائی دو حصوں میں "مسلم مقتول" کا ذکر ہے تو

تیسرے حصے میں بھی اسی کا ذکر ہے بالخصوص جبکہ بعد والی آیت میں بھی قتلِ عمد کے سلسلے میں "مقتول مومن" ہی کا ذکر ہے جیسا کہ وَمَنۡ يَقۡتُلۡ مُؤۡمِنٗا مُّتَعَمِّدٗا (جو کسی مومن کو عمداً قتل کر دے ----) کے الفاظ سے واضح ہے لہٰذا آیت کا سیاق و سباق قطعی طور پر یہ واضح کر دیتا ہے کہ کسی حصۂ آیت میں بھی "ذمی کافر" یا "معاہد کافر" کے مقتول ہونے کا ذکر نہیں ہے۔

۲ ـــــ دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ آیت کے پہلے حصے میں مذکور مقتول کی دو صفات ہیں اولاً یہ کہ وہ غلطی سے قتل ہوا ہے ثانیاً یہ کہ وہ مسلمان اور مومن ہے دوسرے حصۂ آیت کے مقتول میں بھی آپ یہ دونوں صفات مانتے ہیں لیکن جب اسی مقتول کا ذکر (جو پہلے حصے سے شروع ہوا تھا) تیسرے حصے تک پہنچتا ہے تو آپ اس کے "غلطی سے مقتول پا جانے" کی شرط کو برقرار رکھتے ہیں مگر اس کے "مومن" ہونے کی شرط کو اڑا کر اسے "ذمی کافر" یا "معاہد کافر" میں تبدیل کر دیتے ہیں آخر یہ کیوں؟ ان ھٰذا لشئ عجیب۔

۳ ـــــ تیسری بات یہ قابل غور ہے کہ اگر اِنۡ كَانَ (اگر "وہ" ہو) سے مراد "ذمی" ہے تو پھر "بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ" کے الفاظ کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ ذمی ہے ہی وہ شخص جو معاہدے کی وجہ سے اسلامی حکومت کی ذمہ داری بن داخل ہوا ہو۔ اگر وہ ذمی ہے تو اس کے ذمی ہونے ہی میں معاہدے کا وجود شامل ہے اسے الگ کر کے بیان کرنے کی حاجت ہی نہیں رہتی ہے۔

۴ ـــــ چوتھی بات یہ قابل غور ہے کہ سورۂ نساء (جس کی یہ آیت اس وقت زیر بحث ہے) پانچ ہجری تک مکمل نازل ہو چکی تھی اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک اسلامی حکومت میں کسی ذمی کا وجود تک نہ تھا جس کے بارے میں یہ ہدایت نازل ہوتی، اہلِ ذمہ کا وجود فتح مکہ کے بعد ۹ یا ۱۰ ہجری کے قریب ملتا ہے ہاں البتہ پانچ ہجری تک مسلمانوں کے دار الکفر کے کئی قبائل سے مختلف النوع معاہدے ہو چکے تھے مثلاً یہود بنو ضمرہ، جہینہ، بنو مدلج وغیرہ کے قبائل۔ جب مدینہ کی سرزمین دار الاسلام بن گئی

جہاں مسلمان اطمینان اور امن سے اپنی زندگی اپنے دین کے مطابق بسر کر سکتے تھے تو مختلف قبائل میں منتشر مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ دار الاسلام میں منتقل ہو جائیں چنانچہ بہت سے اہل ہمت اور اہل مقدرت مسلمان مدینہ میں منتقل ہو گئے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ جو دار الاسلام میں جانے کی شدید خواہش کے باوجود بھی اپنی بعض حقیقی مجبوریوں کی بنا پر وہاں نہ جا سکے، یہ وہ لوگ ہیں جن کو قرآن نے اسی سورت میں مُسْتَضْعَفِیْنَ کا نام دیا ہے۔ ان کافر قبیلوں میں کچھ وہ مسلمان تھے جن کا ایمان واضح اور عیاں تھا، اس لئے وہ اپنے قبیلے کے بھائی بندوں کے ہاتھوں مظلوم و مقہور اور معتوب و مغضوب تھے۔ کچھ وہ بھی تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھے ہوئے تھے، بہرحال ان کافر قبائل میں جو مسلمان افراد تھے انہی کا اس آیت کے آخری حصے میں ذکر ہے نہ کہ ذمّی کفار کا۔

۵ ـــــ پانچویں بات جو سب سے زیادہ قابل غور ہے اور جو شخص مقتول کے مومن ہونے کا قطعی مضبوط (بلکہ یقینی اور حتمی) قرینہ ہے وہ یہ ہے کہ آیت کے آخری حصے کے کفّارے میں "مطلق غلام" کو آزاد کرنے کا حکم نہیں بلکہ "مومن غلام" کو آزاد کرنے کا حکم ہے مومن غلام کی آزادی کا حکم خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مقتول جس کے قتل کی پاداش میں مومن غلام کو آزاد کرنے کا حکم ہے خود مومن ہے آخر یہ کیا بات ہوئی کہ آپ (غلطی سے ہی سہی) قتل تو کریں کافر آدمی کو لیکن کفّارہ میں آزاد کریں مومن غلام کو۔ یعنی کفارے میں غلام کی آزادی کا فائدہ پہنچا بھی تو مقتول کی پارٹی کو نہیں (جو بقول آپ کے ذمّی اور کافر ہے) بلکہ قاتل کی پارٹی کو (جو مسلمان اور مومن ہے)۔ "حلوائی کی دوکان اور داداجی کی فاتحہ" شاید اسی کا نام ہے یہ ہے اسلام کے "عدل وانصاف" کی وہ تصویر جو محترم عثمانی صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے موئے قلم سے بنی ہے اور جس کا شاید اب تک انہیں خود بھی احساس نہ تھا۔

بعض لوگ یہاں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آیت میں اگر ذمّی مقتول کی بجائے مومن مقتول مراد لیا جائے تو اس کے وارثوں کو (جو کفار ہیں) ایک مومن مقتول کی دیت کیسے دی جا سکتی ہے؟ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جس طرح معاہدہ ذمہ ایک ذمّی کے ورثاء

کو (خواہ وہ مومن ہوں یا کافر) دیت ادا کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے بالکل اسی طرح "بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ" والا معاہدہ مومن مقتول کے وارثوں کو (خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمان) دیت ادا کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے قصہ مختصر یہ کہ اس آیت میں تین مقتولوں کا ذکر ہے اور تینوں ہی مومن ہیں، ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر، ان کے اختلافِ احوال کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

**مقتول مومن کا سہ بار ذکر کیوں؟**

پہلا "مقتول مومن" وہ ہے جو دارالاسلام کا باشندہ ہے اس کا کفّارہ مومن غلام کو آزاد کرنا اور اس کے ورثاء کو دیت ادا کرنا ہے۔

دوسرا "مقتول مومن" وہ ہے جس کے قبیلے سے مسلمانوں کی عداوت (لڑائی) ہے گویا یہ دارالحرب کا باشندہ ہے اس کا کفّارہ مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔

تیسرا "مقتول مومن" وہ ہے جو دارالکفر کا باشندہ ہے اس کے کفارہ میں دیت کی ادائیگی کو مومن غلام کی آزادی پہ مقدم رکھا گیا ہے جس کا مفہوم و مراد یہ ہے کہ "مومن غلام" کو آزاد کرنے میں تاخیر ہو جائے تو ہو جائے مگر دیت کی ادائیگی فی الفور ہونی چاہیئے کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست معاہد قبیلے سے ہے (جبکہ "مومن غلام" کی آزادی، مسلم معاشرے کا داخلی مسئلہ ہے)۔ دیت کی ادائیگی میں تاخیر کرنا چونکہ معاہدے پر منفی اثرات ڈال سکتا ہے اس لئے دیت کی فوری ادائیگی کی ترغیب کے لئے مومن غلام کی آزادی پہ اسے مقدم رکھا گیا ہے۔

برسبیل تنزل اگر آیت کے آخری حصے میں "ذمّی کافر" مراد بھی لیا جائے تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی "مقدار دیت" مسلمان مقتول کی "مقدار دیت" کے برابر ہے کیونکہ یہ بات تفصیل سے بیان ہو چکی ہے کہ قرآن نے صرف دِیَت (جو بھی اس کی مقدار ہو) دینے کا حکم دیا ہے اس کی مقدار ـــــ آدھی، تہائی یا پوری مقدار دیت ـــــ کا ذکر قطعی طور پر ترک کر دیا ہے۔

**خلاصۂ بحث** | بہرحال ہماری اس تفصیلی بحث سے یہ بات واضح ہے کہ

(۱) ـــــ قرآن نے مومن مقتول (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کی "نفسِ دیت" کا تو ذکر

کیا ہے لیکن "مقدار دیت" کا قطعاً ذکر نہیں کیا ہے۔

(۲) ــــــ ذمّی کی تو "نفس دیت" تک کا ذکر نہیں ہے کجا یہ کہ قرآن کریم نے اس کی "مقدار دیت" کا تعیّن کر دیا ہو۔

اب چونکہ قرآن نے کسی بھی مقتول کی دیت کو سرے سے طے ہی نہیں کیا ہے اس لئے احادیث میں مذکور کسی "مقدار دیت" کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "مخالفِ قرآن" یا "مطابقِ قرآن" ہے بالکل بے اصل اور قطعی لغویات ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے "دانشوروں" کا حال یہ ہے کہ وہ پہلے قرآن کے منہ میں اپنی طرف سے ایک من گھڑت بات ڈالتے ہیں اور پھر اسے معیار مان کر احادیثِ نبویہ میں مذکور احکام کا جھٹکا کرتے ہیں۔

ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

مقامِ غور ہے کہ اگر واقعی قرآن نے مردِ مومن، خاتونِ مسلمہ اور ذمّی رعایا سب کے لئے مساوی "مقدار دیت" کو متعین کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ چودہ صدیوں میں، ہر دور کے فقہاء و علماء انتہائی جاہل، کودن، پھوہڑ دماغ اور علم قرآن سے کورے اور بے خبر تھے کہ وہ مختلف مقتولوں کی مقدار دیت غلط طور پر متعین کرنے میں سر کھپاتے رہے جبکہ قرآن یہ کام خود ہی انجام دے چکا تھا۔ یہ سوچیئے کہ ایسا کہہ کر اسلاف کے متعلق کیسا پست اور گھٹیا تأثر پھیلایا گیا ہے ؎

تو نے وہ لوگ ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر!

اب جبکہ قرآن نے "مقدار دیت" کو متعین ہی نہیں کیا تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم خارج از قرآن کسی اور ماخذ کی طرف رجوع کریں۔ یہ ماخذ بہرحال اس شخص کا اپنا فرمان یا طرزِ عمل ہی ہو سکتا ہے جس پر خود یہ قرآن نازل ہوا تھا اور جو اپنے اوپر نازل ہونے والے قرآن کا مفہوم و مطلب سب سے بہتر اور سب سے زیادہ جانتا تھا۔ فی الحال اس بحث کو نظر انداز کیجئے کہ آپؐ کے فرمودات وحی خفی پر مبنی ہیں یا کہ نہیں اگر آپ معاذ اللہ قرآن پاک کے

**مقدار دیت کا تعین کیونکر؟**

مصنف بھی ہوتے تو بھی قرآن کی جزئیات کو متعین کرنے کا حق مصنف کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہو سکتا ہے اور اگر آپ رسول خدا ہیں تو آپؐ کی متعین فرمودہ جزئیات اور ان کے اصول کسی دوسرے غیر نبی شخص کی نسبت کہیں زیادہ قابل قبول ہیں کیونکہ لوگوں کے لئے بہترین نمونۂ پیروی (اسوۂ حسنہ) ہونے کا اعزاز آپؐ کے سوا اور کسی شخص کو حاصل نہیں ہے

**اختلافِ آثار کا بہانہ** لیکن جب آپ کے جزئیات اور اصولوں کو پانے کے لئے احادیث و آثار کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ

"اگر کچھ آثار ---- ایسے ملتے ہیں جن سے عورت کی دیت نصف معلوم ہوتی ہے تو ایسے آثار بھی ملتے ہیں جو عورت کی پوری دیت کے حق میں ہیں"

(مضمون جسٹس خلیل الرحمان صاحب روزنامہ جنگ ۸۴-۴-۱۶)

حقیقت یہ ہے کہ پوری دیت بیان کرنے والے آثار تو درکنار ایک بھی صحیح اثر نہیں ہے جو "خاص طور پر" عورت کی دیت سے متعلق ہو اور اس میں نصف کی بجائے پوری مقدار دیت مذکور ہو۔ جس اثر کو پیش کیا جاتا ہے وہ "خاص طور پر" عورت کی دیت سے متعلق ہونے کی بجائے عام اور مطلق حکم کو ظاہر کرتا ہے لیکن ہمارے زیر بحث مسئلہ خاص ہے جو عورت کی "مقدار دیت" سے متعلق ہے۔ اس لئے محدثین کرام نے ان آثار کے مقابلے میں (جن میں عورت کی مقدار دیت کو مرد کی دیت کا نصف بتایا ہے اور جو اس واحد اثر کے مقابلے میں اصح، اثبت اور اکثر ہیں) اسے رد کر دیا ہے۔

اب صورتحال پر غور فرمائیے! صورتحال یہ نہیں ہے کہ احادیث و آثار میں دیت

**قرآن اور منقح صورتِ مسئلہ** کی دو مقداریں موجود ہیں اور قرآن پاک میں صرف ایک مقدار موجود ہے لہٰذا ہم صاحب اختیار ہیں کہ جو "مقدار دیت" قرآن کے "مطابق" ہے اسے قبول کر لیں۔ بلکہ اصلی اور واقعی صورتحال یہ ہے کہ قرآن میں سرے سے کوئی "مقدار دیت" موجود ہی نہیں ہے اور احادیث میں بقول شخصے دو مقداریں موجود ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کس معیار اور کس بنیاد پر ایک مقدار کو اختیار کریں اور دوسری کو رد کر دیں۔

ہمارے لئے رد و قبول کا ایک معیار یہ ہے کہ ہم وقت کے غالب افکار و نظریات

کو پیمانہ قرار دیں اور پھر ــــــ "چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی" ـــــــ کے نعرے کو مسلکِ حیات بنا لیں اور دیت کی وہ مقدار کر لیں جس پر آقایانِ مغرب کبیدہ خاطر نہ ہوں اور وہ ہم پر "رجعت پسندی"، "ترقی دشمنی"، "وحشت"، "جہالت"، اور "دقیانوسیت" کی تہمت نہ دھر سکیں۔ یہ معیارِ ترک و قبول اختیار کر لینے کے بعد پھر یہ کام عبث اور فضول قرار پا جاتا ہے کہ ہم احادیث میں مذکور صحیح اور غلط "مقدارِ دیت" کی چھان بین کریں۔

ہمارے اخذ و ترک کا دوسرا معیار یہ ہے کہ ہم وقت کے غالب نظریات سے مرعوب ہوئے بغیر یہ تحقیق کریں کہ دونوں مقداروں میں سے کونسی "مقدارِ دیت" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بصحت و صداقت منقول ہے پھر جو مقدار اس تحقیق سے ثابت ہو جائے اسے کسی لومۃ لائم کی پروا کئے بغیر قبول کر لیا جائے۔ ہمارے اسلاف نے اسی طرح تحقیق کر کے اس بات پر اجماع منعقد کیا تھا کہ عورت اور ذمی کی مقدار دیت مسلم مرد کے مقابلے میں نصف ہے بجز احناف کے سلف و خلف کے تمام فقہاء و علماء، ائمہ اور مجتہدین ذمی کی نصف دیت پر متفق ہیں۔ لیکن عورت کی نصف دیت پر تو ایسا کامل اتفاق ہے کہ چودہ صدیوں میں تمام مکاتب فکر کے علماء، ائمہ، مفسرین، مجتہدین اور محدثین (خواہ وہ احناف ہوں یا شوافع، حنابلہ ہوں یا مالکیہ، اہل حدیث ہوں یا ظاہریہ) ان میں سے کسی کا بھی اختلاف منقول نہیں ہے ابوبکر اصم اور ابن علیہ (قطع نظر اس کے کہ وہ اہل سنت کے افراد تھے یا خارج از اہل سنت، فرق باطلہ سے ان کا تعلق تھا) کا جو اختلاف بیان کیا جاتا ہے تو یہ بھی براہِ راست ان کی کسی تصنیف سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ اِدھر اُدھر سے یہ بات لے کر ان کی طرف منسوب کی گئی ہے اگر ان کی طرف یہ نسبت صحیح بھی ہو تو جمہور کے اجماع کے مقابلے میں ان کی انفرادی رائے کوئی وزن نہیں رکھتی ان دونوں کی انفرادی رائے کا سہارا لے کر چودہ صدیوں پر محیط اجماع پر حملہ آور ہونا ایسا ہی ہے جیسے مچھر کسی مضبوط چٹان پر حملہ کر دے۔ اگر کوئی شخص ایسے اجماع کا بھی قائل نہیں ہے تو یہ ایک ایسی جہالت اور خود سری ہے جس کا جواب نہ دینا ہی بہترین جواب ہے۔ باقی رہے ہمارے مہربان (ریٹائرڈ) جسٹس خلیل الرحمان چودھری

اجماعِ امت

صاحب جو یہ فرماتے ہیں کہ

"رہا اجماع امت کا سوال! تو یہ اجماع بھی قرآن کریم کے ظاہری مفہوم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔" (روزنامہ جنگ ۸۴-۴-۱۶)

موصوف محترم کا یہ ارشاد خود ان کی قرآن کریم کے ظاہری مفہوم سے بے خبری کی دلیل ہے کیونکہ (جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے) قرآن کریم کا سرے سے وہ ظاہری مفہوم ہے ہی نہیں جو انہوں نے سمجھا ہے۔

TRUEMASLAK@INBOX.COM

باب ۱۰

# عورتوں کی ذہنی صلاحیتیں

قرآن و سنت کی رو سے مرد و زن کی ذہنی صلاحیتوں اور دماغی استعدادوں میں عثمانی صاحب کا موقف کوئی فرق ہے ؟ یا مکمل مساوات اور یکسانیت پائی جاتی ہے ؟ اس سلسلے میں محترم عثمانی صاحب رقمطراز ہیں

"عورت کی فکری صلاحیتوں کے متعلق قرآن کریم اور سنت نبوی کی ہدایات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں تمام فکری صلاحیتوں میں مردوں سے کمتر نہیں ہوتیں اگر کچھ صلاحیتوں میں وہ مردوں سے کمتر ہیں تو بعض دوسری صلاحیتوں میں وہ مردوں سے برتر بھی ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ صـ ۲۳۶)

کیا ہی اچھا ہوتا محترم عثمانی صاحب عورتوں کی ان فکری صلاحیتوں کی وضاحت فرما دیتے جن میں وہ مردوں سے کمتر یا برتر ہیں نیز وہ یہ اشارہ بھی فرما دیتے کہ مجموعی طور پر کسے ان صلاحیتوں میں برتری حاصل ہے مگر انہوں نے اپنی عافیت اسی میں تصور کی کہ گول مول بات کر کے آگے بڑھ جائیں۔

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے وہ واضح طور پر خواتین کی کمتر ذہنی صلاحیتوں کی قرآن و سنت کی تصریحات روشنی میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کا قائم مقام قرار دیتا ہے نیز وہ عالم ناپائیدار کی عورت کے اس فطری نقص (کمزوری) کا بھی اعلان کرتا ہے جس کے باعث وہ نزاعی امور میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہوئے

غیر واضح اور مبہم رہ جاتی ہے۔ دنیا کی عورت کے مقابلے میں عالم آخرت کی بہترین خواتین کی خوبی یہ بیان کرتا ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار و اعلان میں بڑی زبان آور اور فصیح اللسان ہیں عُرُبًا (۳۷)۔ اب رہا سنتِ نبویؐ کا معاملہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو صراحت کے ساتھ ضعیف العقل قرار دیا ہے۔ قرآنی تصریحات اور نبوی فرمودات کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ بحیثیت مجموعی ذہنی صلاحیتوں میں کسی صنف بشر کو کسی دوسری صنف پر ترجیح حاصل نہیں ہے قرآن وسنت کے واضح نصوص ذہنی استعدادات کے اعتبار سے عورت پر مرد کی برتری کو بیان کرتے ہیں۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کو تو دور حاضر کے "فیشن" کے طور پر جعلی، من گھڑت اور موضوع کہہ کر ٹھکرایا جا سکتا ہے مگر ان قرآنی تصریحات کا انکار بہت مشکل ہے جن کو شہادتِ نسواں کے باب میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اب اس دورِ جدید میں عورت کا ان قویٰ میں مرد کی نسبت کمزور تر ہونا ایک ثابت شدہ اور طے شدہ حقیقت قرار پا چکی ہے اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی کہ مرد کا دماغ وزن اور حجم کے اعتبار سے عورت کے دماغ سے بڑا ہے۔ جو اول الذکر کے فہم و ذکاء کی زیادتی کی دلیل ہے۔ عورت کی نسبت مرد کے جسمانی عضلات تو مضبوط ہوتے ہی ہیں عقلی پختگی میں بھی اسے عورت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ دورِ جدید کا ایک محقق فلاسفر علامہ پرودٹن اپنی کتاب ابتکار النظام میں رقمطراز ہے کہ

**علامہ پرودٹن کا اقتباس**

"عورت کا وجدان بمقابلہ مرد کے اسی قدر کمزور ہے جس قدر اس کی عقلی قوت، مرد کی عقلی قوت کے مقابلے میں ضعیف نظر آتی ہے اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور ایک دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے وہ مردوں کی رائے کے مطابق نہیں ہوتی۔ پس مرد اور عورت میں یہ فرق کوئی عارضی فرق نہیں ہے بلکہ یہ عورت کی طبعی خاصیت پر مبنی ہے"

(بحوالہ مسلمان عورت (علامہ فرید وجدی) ص۱۲)

علامہ پروڈن کے اس اقتباس کو پیش کرتے ہوئے خود علامہ فرید وجدی صاحب لکھتے ہیں۔

"حواس خمسہ، جس پر انسان کی عقلی اور دماغی نشوونما کا دارومدار ہے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے علامہ نیکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کردیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس خمسہ سے ضعیف ہیں۔"

(مسلمان عورت ص۴۲)

پھر آگے چل کر علامہ موصوف ارشاد فرماتے ہیں۔

"سائیکلوجیا نے ثابت کردیا ہے کہ عورت کے بھیجے اور مرد کے بھیجے میں مادتاً اور شکلاً سخت اختلاف ہے مرد کے بھیجے کے وزن کا اوسط عورت کے وزن سے سو ڈرام زیادہ ہے۔" (مسلمان عورت ص۴۴)

**عورت کا دماغ**

جدید تحقیقات نے اس بات کو واضح اور بے نقاب کردیا ہے کہ عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے حجم میں چھوٹا ہوتا ہے۔ جس کا اثر عقل وشعور پر بھی پڑتا ہے وزن کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ احمق کا دماغ عقل مند شخص کے دماغ کی نسبت بہت چھوٹا ہوتا ہے اس سلسلے میں علامہ فرید وجدی جدید تحقیقات کو بایں الفاظ پیش فرماتے ہیں۔

"یہی وہ قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پلّہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر ۴۹½ اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف ۴۴ اوقیہ ہے۔ دوسو اٹھہتر (۲۷۸) مردوں کے دماغ وزن کئے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن ۳۴ اوقیہ ثابت ہوا۔ لیکن جب دوسو اکانوے (۲۹۱) عورتوں کے دماغ کا وزن کیا گیا تو سب سے زیادہ وزنی ۵۴ اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ اوقیہ کا نکلا۔ کیا یہ اختلاف اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کے عقلی قویٰ، مرد کے قویٰ

سے بدرجہا ضعیف ہوتے ہیں۔" (مسلمان عورت ص۴۹)

قرآن اور سنت نبوی کی تصریحات اور دور جدید کی ان تحقیقات کے علی الرغم،

**ایک غلط استدلال** محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"ہمارے اس عہد میں جبکہ عورتوں میں بہترین وکیل، بیرسٹر، انجینئرز، فلاسفرز، سائنسدان، میڈیکل پریکٹیشنرز اور فلائٹ انجینئرز خود ہمارے پس ماندہ ملک میں بہتر سے بہتر موجود ہیں اور ان کی اہلیت اور قابلیت کا لوہا سب ہی ماننے پر مجبور ہیں ایسا کوئی دعویٰ ___ (یعنی عورت کا ذہنی صلاحیتوں میں مرد سے کمزور تر ہونے کا دعویٰ ___ قاسمی) ___ نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے بھی تو مشاہدات و تجربات اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۲۳۹)

یہ استدلال فرماتے ہوئے محترم عثمانی صاحب نے یہ گویا فرض کر لیا ہے کہ ___

"علم و ادب کے ارتقاء اور حضریت و مدنیت کی ترقی کے باعث خواتین تو وہ سب کچھ بن چکی ہیں جن کے وہ نام گن رہے ہیں۔ مگر مرد ہنوز عہد طفولیتِ انسانی کا شکار ہیں وہ ابھی تک پتوں سے تن ڈھانپ رہے ہیں پہاڑوں کی غاروں اور کھوہوں میں رہ رہے ہیں علم و ادب کے عروج اور تمدنی ذرائع و وسائل کی انہیں ہوا تک نہیں لگی تاریخ انسانی کے اس پورے دور میں صرف خواتین ہی جادۂ ترقی و کمال پر گامزن رہی ہیں اور مرد گویا ان تمام ادوار میں جمود کے پلیٹ فارم سے لگے کھڑے رہے ہیں۔ تاریخ کی گاڑی نے صرف خواتین ہی کو اپنے اندر جگہ دی اور انہیں ان منازل کی طرف لے اڑی جہاں آج ان میں وکلاء ___ اور ___ فلائیٹ انجینئرز نظر آ رہی ہیں"___

حقیقت یہ ہے کہ محترم عثمانی صاحب نے یہ فرماتے ہوئے یا تو زیر بحث نفس مسئلہ پر غور نہیں کیا یا وہ دیدہ دانستہ مغالطہ انگیزی پر اتر آئے ہیں۔ آخر ان سے یہ بات کس نے کہی ہے کہ خواتین وکیل اور فلائیٹ انجینئرز نہیں بن سکتیں؟ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں ہے کہ وہ کیا کچھ بن سکتی ہیں اور کیا کچھ نہیں بن سکتی ہیں؟ بلکہ یہ ہے کہ وہ سب کچھ بننے کے بعد

بھی (جن کا نام وہ گنوا رہے ہیں) کیا خواتین، ذہنی قویٰ کے اعتبار سے اب مردوں کے ہم پلہ ہو گئی ہیں؟ میرا جواب یہ ہے کہ خواتین و حضرات کی ان صلاحیتوں میں جو فرقِ تناسب علم و ادب اور مدنیت و حضارت کی ترقی سے قبل تھا وہ آج بھی برقرار ہے، تمدنی ترقی نے اگر قوائے خواتین کو جِلا بخشی ہے تو مردوں کی صلاحیتوں کو بھی اس نے چمکا دیا ہے جس کے نتیجے میں جو فرقِ تناسب۔ تاریخ انسانی کے ابتدائی دور میں دونوں اصناف بشر میں موجود تھا وہی فرقِ تناسب علم و ادب اور تمدنی وسائل و ذرائع کے عروج و ارتقاء کے ہر تاریخی دور میں برقرار رہا ہے بلکہ ایک ہی دور کی وحشی اقوام کے مرد و زن کی ذہنی قوتوں میں جو فرقِ تناسب پایا جاتا ہے وہی ترقی یافتہ قوموں کے دونوں اصناف میں بھی کارفرما ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا ایک مضمون نگار علامہ دوخارینی لکھتا ہے۔

"جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے اسی طرح امریکہ کی وحشی ترین اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔" (بحوالہ مسلمان عورت ص۴۷)

## عثمانی صاحب اور علامہ بابرتی

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کے شارح علامہ اکمل الدین البابرتی نے خواتین کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اپنے دور میں جو کچھ بعد از تحقیق لکھا تھا اس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے محترم عثمانی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"امام بابرتی کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ عورتوں میں "العقل بالفعل" اور "عقل مستفاد"، یعنی عقل کے تیسرے اور چوتھے درجے میں کمی اور نقص ہوتا ہے عورتوں کو اسی وجہ سے ناقصات العقل کہا جاتا ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص۲۳۸)

عثمانی صاحب علامہ بابرتی کے اس قول پر فرماتے ہیں کہ

"یہ کہنا بڑی زیادتی ہوگی کہ آج سائنس اور فلسفہ کی یہ نامور خواتین عقل کے تیسرے اور چوتھے درجے کی "العقل بالفعل" اور "عقل مستفاد" نہیں رکھتی ہیں۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص۲۳۹)

ان درجہ ہائے کا عقل کا ذکر کرتے ہوئے جناب عثمانی صاحب ایک مقام پر طنزاً فرماتے ہیں۔

"وہ غالباً علامہ موصوف کے عہد میں عورتوں میں نہ پائے جاتے ہوں گے یا ناقص پائے جاتے ہوں گے لیکن ہمارے اس عہد میں ------ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۳۸)

ہم محترم عثمانی صاحب کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ ہر دور کی ایک علمی سطح ہوتی ہے جس کو پیش نظر رکھ کر استدلال اور استنباط اختیار کیا جاتا ہے۔ علامہ البابرتی نے جو استدلال کیا ہے وہ اگرچہ آج کے دور میں ذہین انسانی کو اپیل کرنے والا نہیں ہے مگر اپنے دور میں وہ ایک اچھوتا استدلال قرار پایا تھا آج کے دور کی علمی سطح جس قسم کے استدلال کا تقاضا کرتی ہے اسے علامہ فرید وجدی نے اپنی عظیم الشان تصنیف المرءۃ المسلمۃ (مسلمان عورت) میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے اور اس انداز سے پیش کیا ہے کہ دور حاضر کا ذہن اس پر مطمئن ہے اِلّا یہ کہ کوئی علم کے نام پر ہی جہالت کی پرستش پر مصر ہو۔

الغرض، عورت کی ذہنی قویٰ کی یہی وہ کمی ہے، جس سے کل تک اگر دنیا ناواقف تھی تو آج کی علمی تحقیقات نے اسے بے نقاب کر دیا ہے

## عورت اور منصب رسالت

لیکن خالقِ کائنات کی نگاہ سے طبقہ اُناث کی یہ منقصت کبھی مخفی نہیں رہی، چنانچہ اس نے آج تک مختلف اقوام و قریٰ میں جب بھی اور جو بھی رسول مبعوث کئے ان میں سے کسی ایک کا تعلق بھی صنفِ اُناث سے نہیں تھا۔ قرآن کریم کلمہ حصر کے ساتھ یہ بیان کرتا ہے کہ جملہ مرسلین صنف ذکور میں سے ہی مبعوث کئے گئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۔ (۱۲/۱۰۹)

اے نبی! ہم نے تم سے پہلے مختلف بستیوں کے لوگوں میں (سے) جو بھی رسول بھیجے وہ سب مرد ہی تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا

اے نبی! ہم نے تم سے پہلے جب کبھی رسول بھیجے مرد ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات

اَهْلَ الذِّكْرِ۔ (۱۶، ۲۱ / ۴۳، ۷) وحی کیا کرتے تھے، اہلِ ذکر سے پوچھ لو۔

اللہ تعالیٰ نے آج تک کسی عورت کو مرتبۂ رسالت عطا نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ آخر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ تبلیغ وحی اور ادیانِ باطلہ کے مقابلے میں اظہارِ دینِ اسلام کے لئے جن فکری و ذہنی استعدادات کی ضرورت ہے ان میں خواتین مردوں کے مقابلے میں کمتر اور کمزور تر واقع ہوتی ہیں جس کے باعث، طبقۂ ذکور کی موجودگی میں طبقۂ اناث کے کسی فرد کو منصبِ رسالت عطا کرنا، درنگاہِ ایزدی خلافِ مصلحت قرار پایا۔

اگرچہ سلف میں سے چند علماء، عورتوں کی نبوت کے قائل رہے ہیں مگر —— اولاً ان کا موقف جمہور علماء کے مقابلے میں کمزور موقف ہے اور —— ثانیاً وہ خود بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "نبوت مع الرسالت" (یعنی نبی بنا کر اسے کسی قوم کی راہنمائی کے لئے روانہ کر دینے) کا منصب کبھی عورتوں کو حاصل نہیں رہا ہے۔ یہ منصب ہمیشہ مردوں ہی کو حاصل رہا ہے اس لئے اصل بات پھر وہیں کی وہیں رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلے میں، مردوں ہی کو شرف رسالت سے نوازا ہے اور یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ذہنی قویٰ اور دماغی صلاحیتوں میں مردوں کو خواتین پر فوقیت حاصل ہے۔

## باب ۱۱

# فقہ القرآن (سوم) کے چند متفرق مقامات

محترم عثمانی صاحب نے فقہ القرآن میں "تنقید و احتساب" کے زیر عنوان ایک "تنقید و احتساب" یا باغیوں کی کھلی حمایت تاریخی واقعہ بایں الفاظ نقل کیا ہے۔

"بنو امیہ کے آغازِ خلافت کا ذکر ہے کہ سیاسی چپقلش کی بنا پر حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے حامیوں میں جو ایک تناؤ پیدا ہو گیا تھا اس کے زیر اثر کوفہ کے ایک صاحب حضرت حجر بن عدی شیعانِ معاویہؓ پر برملا تنقید فرماتے اور اس میں غلو[1] کر جاتے حضرت معاویہؓ کے گورنروں نے ان کی زبان بندی کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے اس کے برعکس حجرِ بن عدی کے ہم خیال اور مؤیدین میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا جس کی وجہ سے امن و امان کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ کو صورتِ حال کی رپورٹ کی گئی انہوں نے حضرت حجر اور ان کے بعض ساتھیوں کی گرفتاری کے احکام دیدیئے اور جب یہ گرفتار ہو کر حضرت معاویہؓ کے سامنے پیش ہوئے تو حضرت معاویہؓ نے چاہا کہ وہ بنو امیہ کے گورنروں اور خود ان پر لعن طعن کا سلسلہ بند کر دیں کیونکہ اس سے حکومتِ وقت کے خلاف عوام کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں اور امن و امان کا مسئلہ پیدا

---

[1] کاش عثمانی صاحب یہ بھی واضح کر دیتے کہ یہ برملا تنقید کیا تھی؟ اس میں غلو کیا تھا؟ تاکہ خلافتِ راشدہ کے مقابلے میں حکومت معاویہؓ کی اصل حیثیت واضح ہو جاتی۔

ہو گیا ہے مگر حضرت حجر بن عدی ـــــ بھی شدت جذبات سے مغلوب ہو گئے تھے بالآخر حضرت معاویہؓ نے ان سب کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر دیا کیونکہ وہ حکومتِ وقت کے خلاف منافرت پھیلانے اور بغاوت پر لوگوں کو ابھارنے کا موجب بن رہے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فوراً عبدالرحمان بن حارث کو حضرت معاویہؓ کے پاس روانہ کیا کہ وہ ایسا کوئی اقدام نہ کریں لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حجر اور ان کے سات ہمنوا قتل کئے جا چکے تھے اس پر حضرت عائشہؓ سخت ناراض ہوئیں اور حضرت معاویہؓ سے سختی سے بازپرس کی عبدالملک بن نوفل راوی ہیں کہ وہ یہاں تک فرماتی تھیں کہ لولا انا لم نغیر شیئا الا آلت بنا الامور الی اشد مما کنا فیہ لغیرنا قتل حجر۔ ترجمہ: [کسی معاملہ کو ہمارے تبدیل کرنے سے موجودہ حالات سے زیادہ سخت حالات ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم حجر کے قتل کے فیصلہ کو ضرور تبدیل کرا کے چھوڑتے]

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

لولا یغلبنا سفہائنا لکان لی ولمعاویۃ فی قتل حجر شان۔ ترجمہ: [اگر بد اندیشوں اور بے وقوفوں کے غلبہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو حجر کے قتل کے سلسلہ میں میرا اور معاویہ کا معاملہ کچھ اور ہی ہوتا] " (فقہ القرآن ج ۳ ص۱۸۸ تا ص۱۹۰)

آگے چل کر محترم عثمانی صاحب لکھتے ہیں۔

" حج کے زمانہ میں حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی چونکہ حضرت معاویہؓ کو حضرت عائشہؓ کی ناخوشگواری کا علم تھا۔ لہٰذا وہ حضرت عائشہؓ کو راضی کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو حضرت عائشہ نے جس تہدید آمیز انداز میں ان سے گفتگو فرمائی تھی اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا

حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا تھا۔

یامعاویۃ قتلت حجرا واصحابہ وفعلت الذی فعلت اما خشیت ان اخبأ لک رجلا یقتلک۔

ترجمہ: [اے معاویہ! تم نے حجر اور ان کے اصحاب کو قتل کر دیا اور وہ سب کچھ کر لیا جو کرنا چاہا (اب تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟) کیا تمہیں اس بات کا خوف نہیں ہوا کہ میں بھی کسی شخص کو پوشیدہ طور پر تمہارے قتل پر لگا سکتی ہوں]

اللہ اکبر! ملاحظہ فرمائیے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ احتساب جو خلیفۂ وقت کے منہ پر ان کی طرف سے صادر ہو رہا ہے۔"

(فقہ القرآن ج ۲ ص ۱۹۰ تا ص ۱۹۱)

**ہمارا سوال** سوال یہ ہے کہ حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت اور منافرت پھیلانے والے اور امن وامان کا مسئلہ کھڑا کر دینے والے ان مجرموں کی پرجوش حمایت کرنا اور الٹا اس حکومت پر سخت ناراضگی کا اظہار کرنا جو ان دشمنِ امن وامان لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں کوشاں ہو یہ سب کچھ "حکومتِ وقت پر تنقید واحتساب" ہے یا "باغیوں کی کھلی حمایت" ہے؟ اگر کسی سلطنت میں باغیوں کی ایسی پرجوش حمایت بھی سیاسی اعتبار سے "ارباب سلطنت کا محاسبہ" قرار پاتی ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ "تنقید واحتساب" اور "مجرموں کی کھلی حمایت" میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

سیدھی سی بات ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ کی یہ کارروائی صرف اس صورت میں "تنقید واحتساب" قرار پا سکتی ہے جب کہ حضرت معاویہ رضؓ، حجر بن عدی اور ان کے اصحاب کو ناحق تنگ کر رہے ہوں لیکن اگر یہ لوگ واقعی "باغی" اور "امن وامان کا مسئلہ" کھڑا کر دینے والے مجرم تھے تو پھر حکومت معاویہ رضؓ پر حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی تہدید آمیز روش ایک نامناسب حرکت قرار پا جاتی ہے۔ بہرحال یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا ان باغیوں اور امن وامان کے دشمنوں کی پشت پناہ

بن جائیں اور انہیں سزائے موت سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں نیز ان باغیوں اور مجرموں کے کیفر کردار کو پہنچ جانے کے بعد بھی وہ بجائے اس کے کہ سجدۂ شکر بجا لائیں الٹا حضرت معاویہؓ سے ناراض ہو کر تہدید آمیز رویہ اختیار کر لیں۔

بے بنیاد الزام

حقیقت یہ ہے کہ جناب عثمانی صاحب نے "تنقید و احتساب" کی آڑ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے کھاتے میں خواہ مخواہ باغیوں کی حمایت اور پشت پناہی کا الزام درج کر دیا ہے۔

اللہ اللہ! کس قدر دلیری سے حبیبۂ حبیبِ اللہ پر بے بنیاد الزام لگائے جاتے ہیں اور پھر فخر و انبساط سے یہ کہا جاتا ہے کہ

"امہات المؤمنین سب کی سب ہماری مائیں ہیں اور اس حیثیت سے وہ تمام مسلمانوں کے لئے لائق صد احترام ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ عہد حاضر کی مسلم خواتین کے لئے اگر کسی نے اپنے عمل اور کردار سے کوئی نمونۂ زندگی چھوڑا ہے تو صرف ام المومنین سیدۂ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی نے چھوڑا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۲۹۲)

واقعی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نمونۂ زندگی ایسا "کامل" ہے کہ سماج دشمن عناصر اور باغی دشمنوں کی حمایت و نصرت کا جو "درس" بزعم عثمانی صاحب حضرت ام المؤمنینؓ نے چھوڑا ہے وہ کسی اور زوجہ محترمہ کی سیرت و کردار میں نظر میں نہیں آتا۔ اسی لئے صاحب فقہ القرآن اپنی کتاب کے "نذرانۂ عقیدت" کو دیگر امہات المومنین کی خدمت میں نذر کرنے کی بجائے ان ہی کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

"ایک گدائے بے نوا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حضور نذرانۂ عقیدت و اخلاص پیدا کرتا ہے جن کی ذات ہمارے دور کی مسلمان خواتین کے لئے ایک منارۂ نور ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ک)

(۲)

# حدیثِ رسولؐ، عثمانی صاحب کی درایت کی زد میں

محترم عثمانی صاحب ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ

"ہمیں اس تصور سے اختلاف ہے جو ہمارے علماء کرام نے خواتین کے طبقہ میں پیدا کرنا چاہا ہے بلکہ پیدا کر دیا ہے کہ انہوں نے عورت کو ایسی کبوتری سمجھ لیا ہے جو ایک ایسے جنگل میں چھوڑ دی گئی ہے جہاں درختوں پر باز شہباز اور طرح طرح کے شکاری پرندے بیٹھے ہیں کہ اگر وہ ذرا بھی اپنے کابک سے باہر نکلی تو وہ سب کے سب اس پر جھپٹ پڑیں گے اور اس کا تکا بوٹی کر ڈالیں گے یا ایک معصوم بے زبان دنبی ہے جسے ایک بن میں چھوڑ دیا ہے جہاں ہر طرف شیر، چیتے، بھیڑیئے اور طرح طرح کے درندے منڈلا رہے ہیں کہ اس نے اگر اپنے باڑے سے باہر قدم رکھا تو اس کی خیر نہیں سب اس پر جھپٹ پڑیں گے اور اس کا شکار کر لیں گے مجھے افسوس ہے کہ یہ تصور، نہ مردوں کے لئے خوش آئند ہے اور نہ عورتوں کے لئے قابل فخر ہے۔ اس موضوع پر ان حضرات نے ایک حدیث بھی بنا ڈالی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

المرءۃ عورۃ فاذا خرجت استشرفها الشیطان (ترمذی ابواب الرضاع)

ترجمہ: "یعنی عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے اس نے ذرا قدم گھر سے باہر نکالا کہ شیطان نے اسے تاک لیا" یا حضرت عمرؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔

النساء عورة فاستروھا بالبیوت۔

ترجمہ: یعنی عورتیں پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہیں لہٰذا انہیں گھروں میں چھپائے رکھو" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۴۲)

عثمانی صاحب کا اشکال

محترم عثمانی صاحب کا اشکال یہ ہے کہ چونکہ حدیث زیر بحث میں عورت کو گھروں میں مستور رہنے والی مخلوق قرار دیا گیا ہے جسے شیطان اپنی نظر بازی کا نشانہ بناتا ہے اس لئے اس صورتحال سے ابھرنے والا تصور نہ تو مردوں کے لئے ہی خوش آیند ہے اور نہ ہی عورتوں کے لئے قابلِ فخر ہے۔

توضیح حدیث

قطع نظر اس کے کہ کسی معاشرے کے افرادِ ذکور اخلاقی اعتبار سے جیرہ دست ستم شعار، حسن پرست اور جنسی ذوقیت کا شکار ہوں یا انتہائی نیک صالح، خوش خصلت، پاکباز اور عفت مآب ہوں۔ عورت بہرحال اپنی طبعی کمزوریوں کے باعث (جن کا تفصیلی ذکر دوسرے باب میں موجود ہے) اور اپنے فطری وظائف وواجبات کی بجاآوری کے لئے (جن کا مفصل ذکر تیسرے باب میں کیا گیا ہے) مجبور ہے کہ وہ بیرون خانہ کی ہنگامہ خیز مصروفیات سے دستکش ہو کر گھر کی چار دیواری میں اپنے آپ کو تدبیر منزل اور تربیتِ اطفال کے لئے وقف کر دے یعنی خواتین کے لزوم بیت کی صرف یہی سلبی اور منفی وجہ نہیں ہے کہ بیرونِ خانہ کا ماحول فاسد ہے بلکہ اس کی مثبت اور ایجابی وجہ یہ ہے کہ اس کی فطری کارگاہ ہے ہی گھر کا میدان۔ اس لئے کہیں تو لزوم بیت کی اہمیت کو شارع نے فاسد ماحول کے پس منظر میں واضح فرمایا ہے جیسا کہ ترمذی کی محولہ بالا حدیث میں ہے (جسے موصوف محترم نے علمائے کرام کی خودساختہ حدیث قرار دیا ہے) اور کہیں شارع نے اسی بات کی تاکید عورت کے فرائض و واجبات کی روشنی میں کی ہے مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور اپنی رعایا کا نگہبان ہے تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت بازپرس ہوگی ---- مرد اپنے بیوی بچوں کا رکھوالا ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران

ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۴۳)

بہرحال عورت کی اصل کارگاہ ہے ہی گھر کی دنیا لیکن اگر باہر کا ماحول فاسد ہو تو پھر لزومِ بیت کا تقاضا اور بھی شدید اور مؤکد ہو جاتا ہے ان حالات میں شارع کا یہ حکم کہ ـــ عورت پردہ دار مخلوق ہے وہ جب باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے ـــ بڑا ہی برمحل حکم ہے پھر نفسیاتی حقیقت بھی یہی ہے کہ عورت کا وجود شیطانی آنکھوں کے لئے بڑا پرکشش ہوتا ہے شیطان صفت انسان وجودِ زن سے بلکہ اس کے وجود پر پڑے ہوئے لباس تک سے حظ اٹھاتا ہے عورت کے جسم اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز میں (مثلاً اس کے کپڑے، اس کے زیور، اس کی آواز، اس کی حرکات و سکنات، اس کی چال ڈھال اور اس کی رفتار و گفتار تک ہیں) شیطان اپنے لئے لطف و لذت پاتا ہے وہ حسنِ نسواں سے اپنی آنکھوں کو سینکتا ہے اس کے قدم کوئے جاناں کی طرف اٹھتے ہیں اس کا ذہن شہوانی خیالات کی بھٹی بن جاتا ہے اس کے اعضاء و جوارح جنسی تخیلات کے زیرِ اثر حرکت میں آتے ہیں۔ چنانچہ عورت جب گھر سے نکلتی ہے تو بے شمار شیطانی آنکھیں اسے اپنا مرکزِ توجہ بنا لیتی ہیں ان حالات میں شارع کے حکم کی حکمت و مصلحت پر ایمان لانے کی بجائے اسے خود ساختہ اور موضوع قرار دینا ایک سخت بے جا جسارت ہے بالخصوص جب کہ اس میں مذکور حقیقت روزمرہ کا مشاہدہ بھی ہو۔

**دفعِ اشکال ایک اور طرح سے**

اب اگر عورت کے پردہ دار ہونے سے اور شیطانی نگاہوں سے محفوظ رہنے کے لئے لزومِ بیت کو اختیار کر لینے سے مرد و زن کے لئے ایسا تصور متبادر ہوتا ہے جو نہ تو مردوں کے لئے خوش آئند ہے اور نہ ہی عورتوں کے لئے قابلِ فخر ہے تو پھر تنہا اسی حقیقت پر اعتراض کیوں؟ جب کہ اس سے ملتے جلتے کئی حقائق پوری انسانی زندگی میں ہر طرف بکھرے پڑے ہیں پھر تو ان تمام حقائق کا انکار کر دینا چاہیئے جن سے ایسے تاثرات اور تصورات جنم لیں جو نہ تو خوش آئند ہی ہوں اور نہ قابلِ فخر ہی ہوں۔

ہر گھر، ہر دوکان، ہر کاروباری مرکز اور عمارت پر لگے ہوئے تالے کو توڑ دیجئے کہ اس کے وجود ہی سے پڑوسیوں کے متعلق چور ہونے کا گمان اور تصور پیدا ہوتا ہے۔ (اور یہ بات نہ آپ ہی کے لئے خوش آئند ہے اور نہ پڑوسیوں ہی کے لئے قابلِ فخر ہے) حکومت کے نظم ونسق قائم کرنے والے اداروں مثلاً تھانوں جیل خانوں اور عدالتوں پر بلڈوزر چلا دیجئے کہ ان کے عین وجود ہی میں یہ تصور شامل ہے کہ حکومت اپنی رعایا کو جرائم پیشہ اور قانون شکن سمجھتی ہے، اٹھئے اور اپنے ملک کی افواج کا صفایا کر دیجئے کہ ان کے وجود ہی سے یہ تصور برآمد ہوتا ہے کہ ہمارا ملک دیگر ممالک کو ظالم اور جارح سمجھتا ہے اور ان کے ظلم اور جارحیت سے بچنے کے لئے یہ افواج تیار کی گئی ہیں کیا یہ تصورات ہماری قوم کے لئے "خوش آئند ہیں؟ اور دیگر اقوام کے لئے "قابل فخر" ہیں؟

پھر عثمانی صاحب نے کیا خوبصورت معیار وضع کیا ہے کہ جو چیز ان کی نگاہ میں باندازِ دیگر "خوش آئند" اور "قابلِ فخر" نہیں اُسے رد کر دیا جائے۔ میں عرض کروں گا کہ اس معیار کی روشنی میں صرف حدیثِ رسول ہی کو نہیں بلکہ کتاب اللہ کو بھی رد کرنا پڑے گا کیونکہ قرآن بالفاظ صریحہ یہ بیان کرتا ہے کہ (۱) انسان سخت ظالم اور جاہل ہے ($\frac{۳۳}{۷۲}$)۔ (۲) تنگ دل ہے ($\frac{۱۷}{۱۰۰}$)۔ (۳) سخت جھگڑالو ہے ($\frac{۱۶}{۴}$)۔ (۴) بڑا ناشکرا ہے ($\frac{۱۴}{۴۴}$)۔ (۵) سخت بے صبرا ہے۔

کیا قرآن کے بیان کردہ یہ حقائق "خوش آئند" اور "قابلِ فخر" ہیں؟

## (۳)

# افضل و برتر کون؟ مرد یا عورت؟

افضل و برتر کون؟ مرد یا عورت؟ جناب عثمانی صاحب اس سوال کے دو جواب دیتے ہیں۔

"اس نے (یعنی قرآن نے) کسی صنف کو دوسری صنف پر برتری اور فضیلت

عطا نہیں کی وہ دونوں کو شریک مساوی (EQUAL PARTNER)
کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔" (فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۳۸)

(ب) عورت کو بمقابلہ "مرد" برتری اور فضیلت حاصل ہے جیسا کہ درج ذیل مثال سے ظاہر ہے۔

"فرض کیجئے کہ دو آدمی باہم مل کر کوئی کاروبار کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں دونوں مل کر کام کریں گے اور ہر لحاظ سے دونوں کی کاروباری حیثیت مساوی ہوگی نفع و نقصان، محنت و مشقت میں دونوں شریک برابر کے حصہ دار ہوں گے لیکن معاہدہ کرتے وقت ایک فریق یہ شرط کرتا ہے کہ دوسرے فریق کو مارکیٹ میں بھاگ دوڑ کرنا ہوگی مال کا پراپیگنڈہ کرنا خریدار پیدا کرنے ہوں گے اور میں دکان پر بیٹھ کر خریداروں کو اٹنڈ کروں گا مزید یہ کہ دوسرا فریق مجھے (مثلاً) دس ہزار روپے مزید نقد ادا کرے گا اور میں اسے اس رقم کے عوض کچھ نہیں دوں گا اور دونوں فریق اس پر راضی ہو جاتے ہیں اور معاہدہ کر لیتے ہیں کہ ہم دونوں اسی طرح مشترک کاروبار کریں گے۔ یہ دس ہزار روپے ایک فریق دوسرے فریق سے اس لئے وصول کرتا ہے کہ اس میں تجارت کی سوجھ بوجھ کچھ زیادہ ہے جو دوسرے فریق میں نہیں ہے تو اس شرکت کے معاہدہ میں کون سا فریق برتر ہوا؟ وہ فریق افضل ہوا جو دس ہزار روپے مزید نقد لے رہا ہے یا وہ افضل اور برتر ہوا جو دس ہزار روپے دے رہا ہے ظاہر ہے کہ فضیلت اور برتری کا وزن اس فریق کا زیادہ ہے جو نقد دس ہزار روپے وصول کر رہا ہے اور جو شخص دس ہزار روپے دے رہا ہے وہ تسلیم کر رہا ہے کہ تجارتی معاملات میں وہ دوسرے فریق سے کم تر ہے۔

بعینہٖ یہی صورت نکاح میں ہوتی ہے کہ ایک مرد اور عورت باہمی معاہدہ کرتے ہیں کہ وہ زندگی کی گاڑی کو مل کر کھینچیں گے لیکن عورت یہ

شرط رکھتی ہے کہ اس مشترک کاروبارِ حیات میں مرد اسے (مثلاً) دس ہزار روپے مزید ادا کرے یعنی مہر کی رقم ادا کرے اور اس کے عوض عورت مرد کو کچھ نہیں دیتی تو نکاح کرنے کی صورت میں مرد فریقِ غالب ہوا؟ یا عورت شریکِ غالب ہوئی؟ آخر مرد کے پلڑے میں دس ہزار روپے جو پاسنگ رکھا گیا ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ (فقہ القرآن ج صـ۱۳۴ تا صـ۱۳۵)

عثمانی صاحب کا یہ تضاد ناقابلِ فہم ہے کہ کبھی تو وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں مساوی المرتبت ہیں کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں پھر دوسرے ہی سانس میں مرد کے مقابلے میں عورت کی فضیلت کا اثبات فرمانا شروع کر دیتے ہیں جیسا کہ مذکورہ اقتباس سے واضح ہے یہ صورتِ حال کسی ایک مسئلے میں نہیں پوری کتاب ہی تضادات کا مجموعہ ہے جیسا کہ تقریباً ہر مبحث میں نمایاں کیا گیا ہے۔

جہاں تک مرد اور عورت کے درمیان باہمی فضیلت کا تعلق ہے تو وہ روز روشن کی طرح واضح ہے جب یہ تسلیم ہے کہ مرد گھر کا سربراہ ہے اور اہل وعیال کی معاشی کفالت کا ذمہ دار بھی وہی ہے تو عورت کے مقابلے میں فضیلت بھی اسی کو حاصل ہے اور قرآن نے بھی مرد کی اس فضیلت کو تسلیم کیا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔

تاہم اس فضیلت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت حقیر یا گھٹیا مخلوق ہے اور معاشرے میں اس کی کوئی اہمیت وحیثیت نہیں ہے قرآن نے بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ کہہ کر مرد کی واقعی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ اس سے مقصود عورت کی تحقیر واہانت نہیں ہے جب دونوں کا دائرۂ کار ایک دوسرے سے مختلف اور یکسر جداگانہ ہے تو پھر مرد کے دائرۂ کار کی کارکردگی کو نمایاں کرنا۔ عورت کی تحقیر کے مترادف نہیں ہے جیسا کہ بدقسمتی سے یہ تاثر دیا جا رہا ہے اور یوں عورت کو قرآن سے بدظن کر کے اسے ارتداد کی طرف لے جانے کی مذموم سعی کی جا رہی ہے۔

مولانا عثمانی صاحب نے حق مہر وغیرہ کی جو مثال دی ہے اس کا خواتین کی کلی اور

مجموعی فضیلت (OVERALL SUPERIORITY) سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ عورت کا وہ خاص اعزاز اور شرف ہے جو اسلام نے اس امر مخصوص میں اسے عطا کیا ہے اور یہی چیز اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام میں عورت کی حیثیت کسی گھٹیا یا گری پڑی مخلوق کی نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو اسلام نہ تو خواتین کو وراثت میں شریک بناتا نہ ہی حق مہر کی صورت میں ان کے مالی معاوضہ تجویز کرتا تاہم کسی صنف کو کسی شرف و اعزاز سے نوازنا اور شی ہے اور کسی صنف کا اپنی فطری صلاحیتوں کی بنا پر کسی فضیلت سے بہرہ ور ہونا چیزے دیگر۔

دنیاوی اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان مختلف فطری صلاحیتوں کی وجہ سے یہ فرق و تفاوت ایسا ہے جس کا ہزار سخن سازیوں کے باوجود انکار نہیں کیا جاسکا اور نہ ہی کیا جاسکتا ہے تاہم جہاں تک اخروی فضیلتوں کا تعلق ہے وہ عمل اور ایمان سے متعلق ہیں اس میں خواتین و حضرات کے درمیان کوئی تمیز نہیں ہے جو بھی ایمان اور عمل صالح کے اعتبار سے فائق ہوگا عنداللہ افضل بھی وہی ہوگا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اور فرمایا مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً۔

(۴)

# "ازواج مطہرہ" کا مفہوم

قرآن کریم میں کئی مقامات پر لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کے الفاظ موجود ہیں۔ ایسی آیات کے ترجمہ کو محترم عثمانی صاحب نے خواہ مخواہ الجھا کر رکھ دیا ہے عام علماء مترجمین ان الفاظ کا ترجمہ یہ کرتے ہیں۔

"ان کے لئے جنت میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔"

محترم عثمانی صاحب انہی الفاظ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

"وہاں ان کے لیئے پاک وصاف جوڑیاں ہوں گی۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۳۲)

محترم عثمانی صاحب کو اس ترجمہ کی ضرورت کیوں پڑی؟ محض اس لیئے کہ انہیں یہ اشتباہ لاحق ہو گیا ہے کہ جنت میں مردوں کے لیئے تو پاکیزہ بیویوں کے حصول کا ذکر موجود ہے لیکن عورتوں کے لیئے پاکیزہ شوہروں کے حصول کا ذکر موجود نہیں ہے چنانچہ اس خیال کے تحت انہوں نے ازواج مطہرۃ کا ترجمہ "پاکیزہ بیویوں" کی بجائے "پاک و صاف جوڑیاں" کر دیا اس تصور کے تحت کہ جنت میں تمام مرد اور تمام عورتیں "پاکیزہ جوڑیاں" ہوں گے انہوں نے زیر بحث الفاظ کا ترجمہ یہ کر دیا کہ

"وہاں ان کے لیئے پاک وصاف جوڑیاں ہوں گی۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۳۲)

لیکن یہ ترجمہ ایک الجھن کو حل کرنے کی کوشش میں ایک دوسری الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ اور "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا" کی پوزیشن پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ترجمہ پر ذرا غور فرمائیے ــــــ "وہاں ان کے لیئے پاک وصاف جوڑیاں ہوں گی" ــــــ کن کے لیئے لھم اُن کے لیئے۔ اگر لھم میں ھُمْ کی ضمیر مذکر کا صیغہ ہونے کے باعث مردوں کی طرف راجع ہوتی ہے تو معنیٰ یہ بنا کہ ــــــ "وہاں مردوں کے لیئے پاک وصاف جوڑیاں ہوں گی"۔ ــــــ کیا واقعی ہر مرد کو ایک ایک جوڑا ملے گا؟ کیونکہ

"زوج شوہر کو بھی کہتے ہیں اور بیوی کو بھی کہتے ہیں۔"

(فقہ القرآن ج ۳ ص ۱۳۲)

اور اگر لَھُمْ میں ھُمْ کی جمع مذکر کی ضمیر میں مرد و زن دونوں شامل ہیں جیسا کہ عثمانی صاحب اکثر فرمایا کرتے ہیں تو پھر معنیٰ یہ ہو گا کہ ــــــ "وہاں تمام مردوں اور عورتوں کے لیئے پاک وصاف جوڑیاں ہوں گی" ــــــ

یعنی مردوں میں سے بھی ہر ایک کو جوڑا (شوہر اور بیوی) ملے گا اور عورتوں میں

سے بھی ہر ایک کو جوڑا (شوہر اور بیوی) دستیاب ہوگا۔ کیا واقعی قرآن یہی کہنا چاہتا ہے؟ اگر محترم عثمانی صاحب کے مفہوم کے مطابق قرآن کو یہی کہنا ہوتا کہ ــــ "جنت کے تمام مرد اور تمام خواتین باہم پاک وصاف جوڑے ہوں گے" ــــ تو الفاظِ قرآن لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کی بجائے هُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ کہتا۔

رہا یہ امر کہ عام مترجمین کے مطابق قرآن نے مردوں کے لئے تو پاکیزہ بیویوں کا ذکر کر دیا مگر عورتوں کے لئے پاکیزہ شوہروں کا ذکر نہیں کیا، تو یہ ایک سطحی اعتراض ہے، اگر لیاقت کے لئے بیوی کی حیثیت سے بشریٰ کا ذکر کر دیا جائے تو بشریٰ کے لئے شوہر کی حیثیت سے لیاقت کا ذکر خود بخود اسی میں آ گیا جب نیکوکار مردوں کے لئے پاکیزہ بیویوں کا ذکر کر دیا جائے تو یہ خود بخود پاکیزہ بیویوں کے لئے نیکوکار شوہروں کے ذکر کو مستلزم ہوگا۔

تقریباً یہی سلوک مولانا عثمانی صاحب نے لفظ "حور" سے کیا ہے۔ ہمیں موصوف

**"حور" پر بحث**

محترم سے اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ لفظ "حور" جمع کا صیغہ ہے اس کی واحد "احور" اور "حوراء" دونوں ہیں۔ مگر ہمیں ان کی اس بات سے اختلاف ہے کہ قرآن میں یہ لفظ مرد و زن دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں حور کا لفظ صرف خواتین کے لئے ہی استعمال ہوا ہے اس لئے قرآن نے ان کے ساتھ اسم صفت مؤنث کے صیغے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً حُورٌ کے ساتھ مَقْصُورَاتٌ وغیرہ۔

# کتابیات


| نمبر شمار | نام کتاب | مصنف | مقام/ادارۂ اشاعت | سال اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| | **قرآن مجید و کتب تفاسیر** | | | |
| ۱ | قرآن مجید | | | |
| ۲ | تفسیر مطالب القرآن | غلام احمد پرویز | ادارہ طلوع اسلام لاہور | ۱۹۷۶ء |
| ۳ | تفسیر معالم القرآن | مولانا محمد علی کاندھلوی | دارالعلوم شہابیہ سیالکوٹ | |
| ۴ | تفسیر ترجمان القرآن | مولانا ابوالکلام آزاد | مشتاق پبلشرز کشمیری بازار لاہور | |
| ۵ | تفسیر احکام القرآن | ابوبکر رازی جصاص | دارالکتاب العربی بیروت | |
| ۶ | تفسیر احکام القرآن | علامہ ابن العربی | دارالمعرفہ بیروت | |
| ۷ | تفسیر احکام القرآن | محمد علی صابونی | مکتبۃ الغزالی دمشق | ۱۹۸۰ء |
| ۸ | تفسیر ماجدی (اردو) | مولانا عبدالماجد دریابادی | تاج کمپنی لاہور، کراچی | |
| ۹ | تفسیر ماجدی (انگریزی) | مولانا عبدالماجد دریابادی | | |
| ۱۰ | تفسیر تفہیم القرآن | سید ابوالاعلیٰ مودودی | مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور طبع (ششم) | ۱۹۷۳ء |
| ۱۱ | تفسیر معارف القرآن | مفتی محمد شفیع | ادارۃ المعارف کراچی | ۱۹۸۳ء |
| | **کتب احادیث و شروح احادیث** | | | |
| ۱ | صحیح بخاری | محمد بن اسماعیل | | |
| ۲ | صحیح مسلم | مسلم بن حجاج | | |
| ۳ | سنن ابی داؤد | ابوداؤد سجستانی | | |
| ۴ | مسند احمد | امام احمد بن حنبلؒ | | |
| ۵ | جامع ترمذی | امام محمد بن عیسیٰ ترمذی | | |
| ۶ | موطا امام مالک | امام مالکؒ | | |
| ۷ | مسند ابوداؤد طیالسی | | | |
| ۸ | فتح الباری | حافظ ابن حجر العسقلانی | مکتبہ سلفیہ | |
| ۹ | مشکوٰۃ | | | |

## اخبارات وجرائد

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | مجلہ تنظیم | خواتین یونی ورسٹی نمبر | تنظیم اساتذہ پاکستان |
| ۲ | روزنامہ جسارت | | کراچی |
| ۳ | روزنامہ جنگ | | کراچی |
| ۴ | ماہنامہ طلوع اسلام | | |

## دیگر کتب متفرقہ

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | طاہرہ کے نام | غلام احمد پرویز | ادارہ طلوع اسلام لاہور | ۱۹۷۲ء |
| ۲ | سلیم کے نام | غلام احمد پرویز | ادارہ طلوع اسلام لاہور | |
| ۳ | مفہوم القرآن | غلام احمد پرویز | ادارہ طلوع اسلام لاہور | |
| ۴ | یورپ پر اسلام کے احسان | ڈاکٹر غلام جیلانی برق | شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور | ۱۹۶۴ء |
| ۵ | قرآن سے قرآن تک | مرتبہ: محمد حسین عرشی | مکتبہ معارف قرآن جوڑیا بازار کراچی | ۱۹۷۵ء |
| ۶ | فقہ القرآن جلد اول | مولانا عمر احمد عثمانی | ادارہ فکر اسلامی کراچی | ۱۹۸۰ء |
| ۷ | فقہ القرآن جلد دوم | // // // | // // // | ۱۹۸۱ء |
| ۸ | فقہ القرآن جلد سوم | // // // | // // // | ۱۹۸۲ء |
| ۹ | فقہ القرآن جلد چہارم | // // // | // // // | ۱۹۸۴ء |
| ۱۰ | رجم اصل حد ہے یا تعزیر | // // // | // // // | ۱۹۸۱ء |
| ۱۱ | اعلام الموقعین | علامہ ابن القیم الجوزیہ | دار الجبل بیروت | |
| ۱۲ | مختصر فتاویٰ مصریہ | علامہ ابن تیمیہ | دار نشر الکتب الاسلامیہ گوجرانوالہ | ۱۹۷۷ء |
| ۱۳ | قانون شہادت | سید محمد متین ہاشمی | | |
| ۱۴ | تدریب الراوی | جلال الدین سیوطی | میر محمد کتب خانہ مرکز علم وادب آرام باغ کراچی | ۱۹۷۲ء |
| ۱۵ | الاشباہ والنظائر | جلال الدین سیوطی | مکتبہ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر | |
| ۱۶ | فتاویٰ عزیزی | شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی | ایچ ایم سعید کمپنی پاکستان چوک کراچی | ۱۹۶۹ء |
| ۱۷ | الطرق الحکمیہ | علامہ ابن القیم | مطبعہ السنۃ المحمدیہ قاہرہ | |
| ۱۸ | تسہیل برہان القرآن | | حفیظ برادران کراچی | ۱۹۸۳ء |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۹ | اسلامی ریاست | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی | اسلامک پبلی کیشنز، لاہور | ۱۹۶۷ء |
| ۲۰ | عورت اسلامی معاشرہ میں | سید جلال الدین انصر عمری | اسلامک پبلی کیشنز، لاہور | ۱۹۶۷ء |
| ۲۱ | سیرت عائشہ | سید سلیمان ندویؒ | اردو اکیڈیمی سندھ کراچی | ۱۹۸۰ء |
| ۲۲ | مسلمان عورت | علامہ فرید وجدی<br>ترجمہ: مولانا آزاد | ایم ثناء اللہ خاں لاہور | ۱۹۶۱ء |
| ۲۳ | ارشاد الفحول | شوکانی | | |
| ۲۴ | فہم قرآن | مولانا محمد سعید احمد اکبر آبادی | ادارہ اسلامیات لاہور | |
| ۲۵ | منہاج السنۃ | ابن تیمیہ | | |
| ۲۶ | منہج الرسول الی اصطلاح احادیث الرسول | نواب صدیق حسن خان | | |
| ۲۷ | مجموعہ فتاویٰ | عبدالحئی لکھنوی | | |
| ۲۸ | الکفایہ فی علم الروایہ | خطیب بغدادی | المکتبہ العلمیہ | |
| ۲۹ | بچے کی تربیت | ابن فرید | اسلامک پبلی کیشنز | |
| ۳۰ | WOMAN AND WOMAN WOMAN | HAVLOCK ELLIS LUDOVICI | | |
| ۳۱ | WESTERN CIVILIZATION CONDEMNEDB BY ITSELF | MARYAM JAMEELA | یوسف خان اینڈ سنز سنت نگر، لاہور | ۱۹۷۹ء |




نوٹ: بعض کتابوں کے مقام اشاعت اور سال اشاعت درج نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یا تو ان کتابوں میں یہ چیزیں درج ہی نہیں ہیں یا پھر میں نے انھیں کسی لائبریری میں دیکھا ہے اور بعجلت ان کا حوالہ نوٹ کرلیا مگر ان کے مقام اشاعت اور تاریخ اشاعت کو نوٹ نہ کرسکا۔ بعض کتب احادیث ایسی معروف ہیں کہ ان کے متعلق ان امور کے عدم ذکر میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مسیحی علم کلام کی روشنی میں ایک تحقیقی جائزہ

مولانا ابو محمد اسماعیل عارفی